پہلی مرتبہ مکمل کتاب طبع ہوئی

مذہب اور اس کی ضرورت، وجود باری تعالیٰ اور صفات و شفاعت،
حقیقت محمدیہ اور مسئلہ تبلیغ و مواخذہ پر جامع مضامین کا مجموعہ

الدّینُ القیّم

تصنیف
رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی قدس اللہ سرہ

تدوین و ترتیب
ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

مکتبہ اسعدیہ کراچی

درود شریف ابراہیمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم
انما انا قاسم واللہ یعطی
ھو القاسم

الدّرّ القیم

مذہب اور اس کی ضرورت، وجود باری تعالیٰ اور صفات و شفاعت، حقیقت محمدیہ اور مسئلہ تبلیغ و مواخذہ پر جامع مضامین کا مجموعہ

تصنیف

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی قدس اللہ سرہٗ

تدوین و ترتیب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

ناشر

مکتبہ اسعدیہ کراچی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

سلسلہ نمبر	:	۱
اشاعتِ اوّل	:	یکم نومبر ۲۰۰۱ء
اشاعتِ ثانی	:	فروری ۲۰۱۰ء
کتاب	:	الدین القیم (کامل دو حصے)
مؤلف	:	مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
مرتب	:	ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری
صفحات	:	۳۷۲
کمپوزنگ	:	حامد احمد شرفی
مطبع	:	المخزن پرنٹرز۔کراچی
ناشر	:	مولانا ابن الرشید الحسینی

مکتبہ اسعدیہ

قاری شریف احمد اسٹریٹ، پاکستان چوک۔کراچی

ملنے کے پتے

مکتبہ رشیدیہ نزد مقدس مسجد، اردو بازار۔کراچی

مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار۔لاہور

مکتبہ قاسمیہ، اردو بازار۔لاہور

شمع بک ایجنسی، اردو بازار۔لاہور

کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار۔راول پنڈی

عرضِ مرتب

فلسفہ و کلام مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے مدرسے میں بہ طورِ نصاب تو پڑھا ہی تھا، ان علوم سے ان کے ذوق و مزاج کو بھی خاص مناسبت تھی۔ اگرچہ انھوں نے ان علوم میں اپنی کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی، لیکن انھوں نے اپنی تصنیفات و تالیفات کا جو یادگار علمی ذخیرہ چھوڑا ہے اس پر سب سے گہری چھاپ ان کے فلسفیانہ اندازِ فکر اور طرزِ استدلال کی ہے اور مطالب کو ذہن نشین کرانے کے لیے انھوں نے علم کلام کے اصول و کلیات اور منطق کے صغریٰ و کبریٰ ہی سے زیادہ کام لیا ہے اور جس کتاب میں انھوں نے اپنے کمالِ فن کا سب سے زیادہ ثبوت دیا ہے وہ ''الدین القیم'' ہے۔ اس کا ایک ایک جملہ فلسفہ و کلام سے ان کے ذہن کی مناسبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اس کے باوجود اہل علم اور اصحاب نظر نے سب سے کم اعتنا اسی کتاب سے برتا ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس پر ''دولفظ'' کے عنوان سے تعارف لکھا ہے۔ مؤلف کی تعریف کی ہے لیکن کتاب کے موضوع، اس کی اہمیت، اس کے تعارف میں اور ان کے طرزِ استدلال کی خوبی اور ان کے فلسفیانہ اندازِ فکر کی طرفگی کے بارے میں ایک جملہ بھی نہیں لکھا۔

ان کے خوردوں اور شاگردوں میں مولانا غلام محمد حیدرآبادی نے مولانا پر بہت لکھا ہے۔ ان کے متعدد مضامین اور ''مقالات احسانی'' پر ان کا تعارفی مقالہ ہے۔ یہ بہترین موقع تھا کہ وہ ''الدین القیم'' پر کچھ لکھتے لیکن وہ اس سے بچ کر نکل گئے۔

مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی نے تو حضرت گیلانیؒ کے حالات و سوانح اور علمی

مقام و خدمات کے تعارف میں ایک کتاب لکھ ڈالی، لیکن پوری کتاب میں ''الدین القیم'' کا صرف نام آیا ہے۔

مولانا سید صباح الدین عبدالرحمنؒ نے مولانا کے تذکرہ و تعارف میں طویل مقالہ لکھا، اس میں ''الدین القیم'' کا ذکر کیا ہے، لیکن چند جملوں میں! بلاشبہ یہ چند جملے براہِ راست کتاب کے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۴ء میں دفتر الفرقان۔ بریلی سے ان کا ایک رسالہ ''الدین القیم'' شائع ہوا، جس میں مولانا نے صوفی اور متکلم بن کر ''صوفیانہ علم کلام'' پیش کیا تھا اور وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مباحث کے ذریعے کائنات کے اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کی تھی جس کو عقل اور فلسفہ حل کرنے سے عاجز رہا۔'' (معارف اعظم گڑھ، مارچ، اپریل ۱۹۵۷ء، بہ حوالہ ''بزم رفتگاں (حصہ اوّل) دہلی، ۱۹۸۱ء: ص ۸۷)

قطع نظر اس سے کہ یہ تعارف حقیقت سے کتنا نزدیک یا دور ہے، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ سید صباح الدین مرحوم نے کچھ لکھا تو سہی! البتہ فاضل گرامی پروفیسر اختر راہی نے اس سے زیادہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''الدین القیم ...... علم کلام پر مولانا گیلانیؒ کے چند لیکچروں کا مجموعہ ہے۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں اہل عقل و فلسفہ کے اعترافِ عجز کا بیان ہے، جو انھوں نے مسئلہ کائنات کے حل میں اپنی ناکامی کے بعد کیا ہے۔ دوسرے حصے میں متصوفانہ انداز سے مسئلہ کائنات کا حل پیش کیا ہے۔ اسی حوالے سے ذات باری تعالیٰ، صفات باری تعالیٰ، رسالت و نبوت، معجزات و خوارق عادت، خیر و شر، قضا و قدر، اور حقیقت زماں وغیرہ مسائل زیر بحث آئے ہیں۔''
>
> (سید مناظر احسن گیلانی (مقالہ) المعارف۔ لاہور، اگست و ستمبر ۱۹۸۰ء: ص ۳۳)

ان دونوں حضرات کے علاوہ اگر کسی نے کتاب پڑھ کر اور اس کے موضوع کی

اہمیت، اس کے مطالب کی افادیت اور مولانا کے اندازِ فکر وطرز استدلال کی ندرت کا واقعی اندازہ کر کے کتاب پر لکھا ہے تو وہ صرف مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ ہیں۔ ان کا مقالہ فاضل مؤلف کے علمی مقام اور مقالے کی اہمیت کے تعارف میں ایک اچھا مقالہ ہے اور اسی لیے ہم نے اسے ''الدین القیم'' کے اس ایڈیشن میں بہ طور مقدمہ شامل کرلیا ہے۔

حضرت مولانا گیلانی مرحوم نے ۲۱ رجب ۱۳۶۱ھ مطابق ۴ اگست ۱۹۴۲ء کو جب کتاب پر دیباچہ تحریر فرمایا تھا تو لکھا تھا:

> ''شاید اٹھارہ انیس سال ہوئے جب جامعۂ عثمانیہ کی دینیات عام ولازم کے سلسلے میں بی اے کی جماعتوں کے لیے پنسل سے یادداشتوں کا یہ مجموعہ بہ طور تعلیمی نوٹ کے ارتجالاً مرتب کیا گیا تھا۔''

آگے اسی دیباچے میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:

> ''آج بیس سال کی بھولی بسری باتیں اس کتاب کے ذریعے سے نئی زندگی اگر حاصل کررہی ہیں تو سراسر یہ انھیں کی توجۂ خاص کا ثمرہ ہے۔''
>
> گر خار و گل ست ہمہ آوردۂ تست

ان دونوں بیانوں پر غور کرنے سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ یادداشتیں سنہ ۱۹۲۲ ۱۹۲۳ عیسوی میں مرتب کی گئی ہوں گی۔ یہ زمانہ جامعۂ عثمانیہ میں مولانا کی تدریسی زندگی کا ابتدائی دور تھا۔

دیباچے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ یادداشتیں ہیں جو مولانا نے اپنے لیکچرز کے لیے مرتب کی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں تحریر کی روانی اور بیان و مطالب کی تفصیل کے بجائے مجمل اشارات تھے۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا نے اشاعت کے لیے مسودے پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ خاتمۂ کلام کے لیے اس پر ایک تحریر کے اضافے کی ضرورت ہے۔ مولانا کے بیان کے مطابق آخر کے چند اوراق جدید اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''یہ چند اوراق'' میرے خیال میں موجودہ باب دہم اور یازدہم

کے تقریباً ۳۱ صفحات ہیں۔ مولانا نے اس خاتمے پر ۲۲؍ جمادی الثانیہ ۱۳۶۱ھ مطابق ۵؍ جولائی ۱۹۴۲ء تاریخ ڈالی ہے۔ گویا کہ مولانا نے ۲۲؍ جمادی الثانیہ کو کتاب مکمل کردی تھی اور اس کے پورے ایک ماہ کے بعد ۵؍ اگست کو دیباچہ لکھ کر کتاب کو آخری شکل دے دی تھی اور اسی زمانے میں اشاعت کے لیے کتاب حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے حوالے کردی تھی۔ لیکن اس کے بعد بھی اشاعت کا مرحلہ طے ہونے میں تقریباً دو برس لگ گئے۔ البتہ اس کے دو مضمون اسی سال (۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء میں) الفرقان میں چھپ گئے تھے۔ مولانا عتیق الرحمان سنبھلی نے لکھا ہے کہ ۱۳۶۱ھ کی جلد میں مولانا کے چار چھوٹے چھوٹے مضمون شایع ہوئے، ان میں سے دو مولانا کی تصنیف ''الدین القیم'' کے حصے ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں کتاب شایع ہوئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس کے تعارف میں جو ''دو لفظ'' لکھے ہیں ان کی تاریخ تحریر ۱۱؍ فروری ہے۔

''الدین القیم'' دو حصوں پر مشتمل تھی۔ اس کا پہلا حصہ وہی ہے، جو دفتر الفرقان۔ بریلی سے ۱۹۴۴ء میں پہلی بار اور پھر متعدد بار کئی دوسرے ناشرین نے شایع کیا ہے۔ نفیس اکیڈمی نے ۱۹۸۰ء تک حیدرآباد دکن اور کراچی سے اس کے سات ایڈیشن شایع کیے تھے۔ ممکن ہے اس کے بعد بھی کوئی اور اشاعتیں نکلی ہوں۔ کتاب کا دوسرا حصہ اسلام کے عملی نظام کے خاکے پر مشتمل تھا۔ اگرچہ یہ حصہ لکھ لیا گیا تھا اور نصاب کے مطابق بھی تھا، لیکن دونوں حصوں کے اندازِ تحریر و تالیف میں نمایاں فرق تھا، اس لیے دونوں حصوں کو ایک جلد میں شایع کرنے کے بجائے الگ الگ شایع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا گیلانی مرحوم نے یہ تفصیل دیباچے میں بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''پڑھنے والوں کو اس کا خیال کر لینا چاہیے کہ یہ ایک درسی یادداشت ہے۔ بڑی بڑی طویل بحثوں کو چند الفاظ میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیوں کہ اجمال کی تفصیل طلبا کے سامنے بیان کی جاتی تھی۔ صرف آخر کے چند اوراق جدید اضافے کی نوعیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان میں آپ کو نسبتاً بسط کی کیفیت نظر آئے گی۔ میں نے چاہا تھا کہ اسی یادداشت کے ساتھ

اسلام کے عملی نظام کے اس خاکے کو بھی لکھ کر بڑھا دوں جو دروسِ عثمانیہ کا ایک جز ہے اور لکھ بھی چکا تھا، لیکن تحریر کا طرز اس میں بدل گیا۔ اس لیے صرف ان چند اوراق کے سوا جن کی حیثیت گویا اس کتاب کے مباحث کے خاتمے کی ہے عملی نظام والے حصے کو الگ کر دیا۔ خیال ہے کہ الدین القیم حصۂ دوم کے نام سے اسے بعد کو شایع کیا جائے۔ واللہ ولی التوفیق!''

۱۹۴۴ء میں ''الدین القیم'' شایع ہوگئی، لیکن یہ صرف پہلا حصہ تھا۔ اس میں وجودِ باری تعالیٰ، ذات، صفات، توحید، ربوبیت، معجزات، خوارق، قانونِ مجازات و مکافات، روزِ حساب، مواخذہ، جنت، دوزخ، جبر، اختیار، شفاعت وغیرہ مسایل اور وحدۃ الوجود وغیرہ مباحث کے اہم نکات ضروری تفصیلات کے ساتھ آ گئے ہیں۔ مولانا نے ان مسایل پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔ پہلے حصے کے موضوع اور مضامین کا مولانا نے ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے:

''ہستی کا یہ نظامِ محسوس جس میں ہم (یعنی ابن آدم) بھی شریک ہیں، اس کے متعلق عموماً انسانی فطرت میں اس قسم کے جو بنیادی سوالات جو اٹھتے رہتے ہیں مثلاً یہ کہ اس کی ابتدا کیا ہے؟ انتہا کیا ہے؟ اس سلسلے کا آخری سوال یہ بھی ہے کہ آخر یہ جو کچھ بھی ہے اس کا مدعا کیا ہے؟

اپنی کتاب ''الدین القیم'' کے پہلے حصے میں اس آخری سوال کے سوا تقریباً ان تمام سوالات کے اُن جوابوں کو بیان کر چکا ہوں جن پر اسلام کے عملی اور فکری نظام کی بنیاد قایم ہے۔ عام طور پر انھی کی تعبیر لوگ عقاید کے لفظ سے کرتے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں کیا جاننا اور کیا ماننا چاہیے؟ گویا اس سوال کا جواب کتاب کے اس پہلے حصے میں دیا گیا تھا۔ متعدد بار مختلف مقامات سے یہ کتاب چھپ چکی ہے اور متعلقہ حلقوں میں کافی روشناس ہو چکی ہے۔'' (برہان۔ دہلی، اپریل ۱۹۵۳ء: ص ۵)

اس کے مباحث و مضامین کی ترتیب یہ ہے:

مولانا نے پہلے فطرتِ انسانی کے مطالبات پر بحث کی ہے، پھر مذہب کا سنگ بنیاد تلاش کیا ہے۔ یہ بحث مذہب کے دایرۂ عمل کی ہے جو محسوس سے غیر محسوس تک اور انسانی زندگی کے مادّی مسایل سے لے کر مابعد الطبعیات تک پھیلا ہوا ہے۔ پھر مولانا نے سائنس کے دایرۂ عمل اور فلسفے کی حدِ پرواز سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ غیر مادّی اور مابعد الطبعیات کے مسایل سائنس کے دایرۂ عمل میں نہیں آتے اور فلسفے کی حدِ پرواز سے باہر ہیں۔ ان سوالات کا جواب اگر ملتا ہے تو صرف مذہب میں! ''سائنس اور مذہب'' اور ''مذہبی سوالات اور فلسفہ'' کے تحت مولانا نے مابعد الطبعیاتی مسایل میں سائنس اور فلسفے کی نارسائی کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں فلسفے کے چار اسکولوں، ان کے اختلافات اور ان کے اعترافات کا ذکر بھی کیا ہے اور اسی سلسلے میں وہم، حواس اور عقل کی بحث بھی آ جاتی ہے۔ مولانا نے بتایا ہے: مذہبی سوالات کا جواب فلسفہ، سائنس، وہم، حواس اور عقل کے ذریعے ہم حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کا قطعی جواب وحی کی روشنی میں صرف مذہب دیتا ہے۔ اس طرح علوم سائنس اور علوم عقلیہ پر مذہب کی ترجیح قایم کرنے کے بعد ان مسایل کے حل کی گویا ایک فطری راہ جو شک وشبہ سے بالا ہے اور جس کا ہر نشیب اور ہر فراز وحی الٰہی کی یقینی روشنی سے جگمگا رہا ہے، مولانا نے تلاش کر لی ہے۔

اس کے بعد مولانا نے علم کلام کی اہمیت اور افادیت کو واضح کرنے کے بعد انسانی فطرت کے مطالبات کی طرف متوجہ کیا ہے اور ان کے بارے میں مذہبی نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے اور ان سے متعلق اسلامی تعلیمات پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب میں اگرچہ الہام و وحی اور نبوت و رسالت کے بارے میں نہایت مفید نکات آ گئے ہیں، لیکن موضوع بنا کر ان پر کسی ایک جگہ مربوط اور مفصل بحث نہیں کی گئی ہے۔ البتہ بحث کی تمام عمارت ہی چوں کہ وحی کی روشنی میں اور صاحبِ رسالت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر قایم ہے، اس لیے دل میں پیدا ہونے والی اس خواہش کی تکمیل کہ ''کیا ہی اچھا ہوتا کہ وحی و رسالت کے بارے میں بھی مولانا

کے افادات مرتب ہو جاتے۔" ایک دوسری طرح ہو جاتی ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ مولانا کا قلم بحث ونظر کے کسی مقام پر بھی موضوع کے حدود اور مضمون کے تقاضوں کی پروا نہیں کرتا۔ ان کے خیالات کی روانی، معلومات کی فراوانی، افکار کی بلند پروازی اور ذہن کی درّاکی و برّاقی اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے اور بعض اوقات تو قاری کا سررشتۂ فکر ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ ربط تلاش کرنا چاہتا ہے لیکن ناکام ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو بحث ونظر کے ایک اجنبی مقام پر دیکھ کر حیران و سرگرداں رہ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ وہ کس عالمِ معانی میں آ پہنچا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جو مباحث درمیان میں آ جاتے ہیں اور جو افکار و خیالات قاری کو ایک نئے عالمِ معانی میں بحث ونظر کے کسی مقام پر پہنچا دیتے ہیں وہ بے معنی اور غیر مفید ہوتے ہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ آج کل کے اندازِ تالیف اور اصولِ تدوین سے مطابقت نہیں رکھتے، اس لیے کتاب کے بنیادی مضامین کا ربط تلاش کرنے میں اور ذیلی وضمنی مباحث کے امتیاز میں قاری کو دشواری ضرور ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے مباحث کی افادیت کے اعتراف کے باوجود مطالب کا فہم اس کے لیے آسان نہیں ہوتا۔

کتاب کے دونوں حصے شان دار مباحث سے بھرے ہوئے ہیں، لیکن مولانا کا اندازِ فکر، طرزِ استدلال اور طرزِ کلام فلسفیانہ ہے اور اس لیے عام قارئین کے لیے جو کلام اور تصوف کا کافی مطالعہ اور اسلام کے نظامِ عقاید و عبادات اور اس کی حکمت سے بنیادی واقفیت نہ رکھتے ہوں، ان پر اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا راز نہیں کھل سکتا۔ مولانا فرماتے ہیں:

> "جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اس کتاب سے انھی لوگوں کو غالباً زیادہ نفع پہنچ سکتا ہے، جنھوں نے اسلام کے اساسی امور پر غور و فکر میں عمر کا ایک حصہ بسر کیا ہے۔ کلام اور تصوف کی معتد بہ اور کافی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ وہی خاک سار کی ان حقیر کوششوں کی قدر و قیمت کا شاید صحیح اندازہ

فرما سکتے ہیں، کن کن خرمنوں سے یہ خوشے حاصل کیے گئے ہیں۔ شاید اس کی تفصیل اب میں خود بھی نہیں بتا سکتا۔''

یہ بات حضرت مولانا نے اگرچہ پہلے حصے کے بارے میں کہی ہے لیکن دوسرے حصے کے بارے میں بھی یہ ٹھیک ٹھیک صادق آتی ہے۔

''الدین القیم'' ۱۹۴۴ء میں شایع ہوئی تھی، لیکن اس کا مسودہ ۱۹۴۲ء میں نہ صرف تیار ہو چکا تھا بلکہ اشاعت کے لیے حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے حوالے کیا جا چکا تھا۔ یہ اس کا پہلا حصہ تھا۔ اس کے دیباچے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت اس کا دوسرا حصہ بھی مکمل ہو چکا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

''میں نے چاہا تھا کہ اسی یادداشت کے ساتھ اسلام کے عملی نظام کے اس خاکے کو بھی لکھ کر بڑھا دوں جو دروسِ عثمانیہ کا ایک جز ہے اور لکھ بھی چکا تھا، لیکن تحریر کا طرز اس میں بدل گیا تھا، اس لیے عملی نظام والے حصے کو الگ کر دیا۔ خیال ہے کہ ''الدین القیم'' حصۂ دوم کے نام سے اسے بعد کو شایع کیا جائے۔''

مولانا کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرا حصہ بھی ۱۹۴۲ء میں مکمل کر لیا گیا تھا، لیکن اندازِ تحریر بدل جانے کی وجہ سے اسے حصہ اوّل سے الگ کر لیا تھا، لیکن جب برہان دہلی نے دوسرے حصے کی قسط وار اشاعت شروع کی (اپریل ۱۹۵۳ء) تو اس کی تمہید سے معلوم ہوا کہ یہ سلسلہ کسی ۱۱، ۱۲ برس پہلے لکھے ہوئے مضمون کی بازیافت نہیں، بلکہ ایک نئے سلسلۂ تحریر کا آغاز ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

عموماً انسانی فطرت میں اس قسم کے بنیادی سوالات جو اٹھتے رہتے ہیں...... بیان کر چکا ہوں...... اسلام کے عملی نظام یعنی ایک مسلمان کو دینی حیثیت سے کیا کرنا چاہیے؟ جو اسی آخری سوال 'مدعا کیا ہے؟'' کا گویا جواب ہے، وعدہ کیا تھا کہ اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصے میں کی جائے گی، لیکن ایفاے عہد کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اب اپنے خاص کرم فرما

مولانا عتیق الرحمٰن مدیر برہان (دہلی) کے اصرارِ بلیغ سے قلم اٹھالیا گیا ہے، تاکہ اس پرانے وعدے کو پورا کیا جائے۔ نہیں جانتا کہ اجل مسمیٰ میں اتنی گنجایش باقی بھی رہ گئی ہے یا نہیں کہ جو کچھ ارادہ کیا گیا ہے وہ پورا ہوگا۔ بہ ہر حال حق سبحانہ وتعالیٰ ہی کی طرف سے توفیق رفیق ہوسکتی ہے اس کی مشیت ہوگی تو کام ختم ہوگا ورنہ ؂

گر بہ میریم عذرِ ما بہ پذیر
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

طے یہی کیا گیا ہے کہ جیسے جیسے مسودہ قلم بند ہوتا جائے قسط وار مجلّہ برہان میں وہ شایع ہوتا رہے۔ کام شروع کیا جاتا ہے۔ وَالِاتْمَامُ عَلَی اللّٰہِ تَعَالیٰ وَھُوَحَسْبِیْ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔''

ان دونوں بیانوں میں جو تضاد نظر آتا ہے وہ ہماری معلومات کا نقص ہے۔ اگر تفصیلات سامنے ہوتیں تو یہ شبہ ہرگز نہ ہوتا۔ بہر حال جو تضاد نظر آتا ہے اس میں تطبیق کی راہ یہ ہوسکتی ہے؛

① ۱۹۴۴ء تک حصۂ دوم کا مسودہ شاید مختصر یا نامکمل ہو!

② ۱۹۵۳ء تک معلومات میں وسعت اور خیالات میں قابل لحاظ تبدیلی ہوچکی ہوگی اور پہلا مسودہ معیار سے کم تر محسوس ہوا ہو!

③ ہوسکتا ہے پہلا مسودہ ضایع ہوگیا ہو!

بہ ہر حال! مولانا مرحوم نے ''الدین القیم'' کا دوسرا حصہ ۱۹۵۳ء میں لکھنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ اسے برہان میں اشاعت کے لیے بھیجتے رہے۔ اشاعت کا آغاز اپریل ۱۹۵۳ء سے ہوا اور جون میں ایک قسط کے ناغے کے ساتھ جنوری ۱۹۵۴ء تک مسلسل نو اقساط اور چودہ ماہ کے وقفے کے بعد دو قسطیں اپریل اور مئی ۱۹۵۵ء کے برہان میں شایع ہوئیں۔ انھیں پر سلسلے کی تکمیل ہوجاتی ہے اور الدین القیم پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔

سلسلۂ مضمون کی پہلی نو قسطیں ''کس لیے؟'' کے عنوان سے شایع ہوئی تھیں اور آخری دو قسطیں ''کاینات سے استفادے کے حدود'' کے عنوان سے چھپی تھیں۔

کتاب کے حصۂ دوم کے موضوع کے بارے میں گزر چکا ہے کہ انسانی فطرت میں بنیادی سوالات جو اٹھتے ہیں اس سلسلے کا آخری سوال یہ ہے کہ آخر یہ جو کچھ بھی ہے اس کا مدعا کیا ہے؟ مولانا گیلانی مرحوم نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے اس کا عنوان ''کس لیے؟'' رکھا ہے۔ اس کی تفصیل مولانا مرحوم کی زبانی سنیے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> ''کس لیے؟ کے اس عنوان کا جسے مضمون کی پیشانی پر درج کیا گیا ہے، مطلب یہی ہے کہ یہ آسمان و زمین، ہوا، مٹی، پانی، جمادات و نباتات و حیوانات، انسان، الغرض وہ سب کچھ جو ہمارے سامنے ہے اس کی پیدایش و آفرینش کا مدعا کیا ہے؟ اسی سوال کا جواب دیا جائے اور بتایا جائے کہ قدرت کے کس نصب العین کی تکمیل ان کے وجود سے ہوتی ہے۔''

کتاب کے دوسرے حصے میں فاضل مؤلف نے اسی سوال کا جواب اپنے مخصوص اندازِ تحریر میں دیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ مولانا کے مقصدِ تحریر کو قدرے آسان زبان اور سادہ اسلوب میں بیان کر دیا جائے۔ مولانا مرحوم کا مقصد یہ ہے کہ یہ کاینات ہستی حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ طرح طرح کی مخلوقات سے بھری ہوئی ہے، ان کی پیدایش کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ یہ سب کسی نہ کسی طرح انسان کی خدمت میں مصروف ہیں یا انسان کے کام آ رہی ہیں اور یہی گویا ان کی پیدایش کا مقصد ہے۔ مولانا نے سوال کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز تو انسان کے کام آ رہی ہے لیکن انسان کی پیدایش کا کیا مقصد ہے اور وہ کسی کے کیا کام آ رہا ہے؟ یا یہ کہ انسان تو اپنی زندگی میں دوسری اشیا کا محتاج ہے لیکن دوسری اشیا یا مخلوقات انسان کی کتنی محتاج ہیں؟ اس کا جواب نہ صرف منطق اور کلام کی روشنی میں بلکہ حقیقت حال کی زبان سے یہ ملتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی انسان کی محتاج نہیں، لیکن اگر انسانی وجود کسی کے کچھ کام

نہیں آرہا ہے تو پھر انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس کا وجود محض عبث ہے؟ اگر دنیا کی معمولی سے معمولی چیز کی زندگی اور اس کے وجود کا کوئی مقصد ہے اور ہر شے کسی نہ کسی کام میں لگی ہوئی ہے تو انسان نامی قدرت کی شان دار تخلیق اور احسن تقویم محض عبث اور بے مقصد کیوں کر ہوسکتی ہے؟ ضروری ہے کہ اس کی پیدائش بھی کسی خاص مقصد کے تحت ہوئی ہو۔ اسی مقصد کی جستجو اور نصب العین اس کتاب کے حصۂ دوم کا موضوع ہے۔

جیسا کہ حضرت مولانا گیلانیؒ کا اندازِ تحریر و تالیف ہے، مولانا کو معلومات کی فراوانی، الفاظ و معانی کے ہجوم، تالیف مطالب کے جوش اور تحریر کی روانی میں مطالب کی تقسیم، مباحث کی ترتیب، ابواب و فصول کے قیام کا خیال ہی نہیں آتا۔ کتاب میں کچھ جلی و خفی عنوان ضرور نظر آتے ہیں لیکن ان کا تعلق درحقیقت ابواب اور ان کے مضامین کی تقسیم و ترتیب سے نہیں ہوتا۔ الدین القیم حصۂ اوّل میں بعض جلی اور خفی عنوان نظر آتے ہیں۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مولانا گیلانیؒ کے مسودے کے مطابق ہیں۔ مولانا کی کتابوں میں مباحث و مضامین کے عنوانات دوسروں نے بھی قایم کیے۔ مثلاً ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' کے عنوانات کا اضافہ دوسرے ایڈیشن میں ناشر کی فرمائش پر مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی نے کیا تھا۔

(مولانا مناظر احسن گیلانیؒ — حیات و خدمات، صفحہ ۳۴۴)

خاک سار نے ''الدین القیم'' کے دونوں حصوں کے مضامین پر از سرِ نو نظر ڈالی ہے اور اہم مباحث اور بنیادی مضامین کے عنوانات کو ابواب کے طور پر نمایاں اور جلی کر دیا ہے اور ضمنی و ذیلی مضامین کے عنوانات کو متن کے قلم سے قدرے جلی رکھا ہے۔ اس طرح نہ صرف بنیادی اور ذیلی مضامین میں امتیاز پیدا ہو گیا ہے بلکہ امید ہے کہ اس طرح مطالب کی تفہیم میں سہولت کی ایک راہ بھی پیدا ہو گئی ہے۔

اگرچہ خاک سار اپنی حیثیت حضرت مولانا گیلانیؒ کے مکتب علمی کے ایک مبتدی کی بھی نہیں سمجھتا، لیکن حضرت مرحوم کی شخصیت سے جو عقیدت اور افادات سے

جو دل چسپی پیدا ہوگئی ہے اس کتاب پر ایک مفصل مقدمہ لکھنے کا ارادہ کر لیا تھا اور اس کے لیے بہت سا مواد بھی جمع کر لیا تھا، لیکن مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ ابن حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کا ایک ایسا مقالہ دستیاب ہوگیا جس میں حضرت مؤلف کے علمی مقام، کتاب کے خصایص، مباحث کی اہمیت اور مضامین کی افادیت کے تمام پہلوؤں پر ضروری اشارات مرتب ہو گئے ہیں۔ یہ مقالہ اگرچہ کتاب کے پہلے حصے پر لکھا گیا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ دونوں حصوں کے خصایص کا جامع ہے۔ اس لیے اسی مقالے کو کتاب کا مقدمہ بنا دیا ہے۔ خاک سار نے مولانا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور ان کے جو آثار و افادات جمع کیے ہیں وہ بھی ضایع نہ ہوں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی اشاعت کا بھی کوئی انتظام ضرور ہو جائے گا۔

اس کتاب کی تدوین کے سلسلے میں نیز مولانا مرحوم کے حالات و افادات کی فراہمی اور مشوروں میں مجھے عزیزم محمد عامر قمر سلمہ کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اس کے لیے میں عزیز موصوف کا بہ صمیم قلب شکر گذار ہوں۔ عزیز گرامی کو حضرت گیلانی مرحوم سے جو عقیدت اور ان کے آثار و افادات سے جو عشق ہے اس سے امید کی جاتی ہے کہ آیندہ یہ موضوع انھی کے لیے مخصوص ہو جائے گا اور ان کے مساعی سے حضرت گیلانی رحمۃ اللہ علیہ پر تحقیق و تصنیف، ترتیبِ آثار و افادات اور تدوین معارف میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔

اس کتاب کی اشاعت کی سعادت مکتبہ اسعدیہ- کراچی کے حصے میں آرہی ہے۔

ابو سلمان

ابو سلمان شاہ جہان پوری

دو لفظ

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ بی اے
مدیر صدق۔ لکھنؤ

جی میں تھا کہ ''الدین القیم'' پر کھل کر لکھوں۔ کسی پر احسان رکھنے کی راہ سے نہیں، اپنے حق میں وسیلۂ سعادت جان کر۔ دین قیم کی خدمت کی راہ سے۔ حالاتِ تکوینی پر قدرت کسے؟ کتاب کے مطبوعہ فرمے ایسے وقت ملے کہ ع

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اتنی مہلت بھی نہیں کہ شروع سے آخر تک سرسری سہی ایک نظر تو کتاب پر ڈال لوں! سارا تکیہ حافظے کی وساطت سے پچھلے، بہت پچھلے مطالعے پر۔ وقت کی اس تنگی کی تشریح کرنا چاہوں تو خود اس کے لیے وقت کہاں سے لاؤں!

کتاب کا مسودہ مدت ہوئی پڑھا تھا۔ اس کی افادیت، اس کی دل آویزی اس کی خوش تاثیری کا قایل اسی وقت ہو گیا تھا۔ دین کے اس زبردست خادم، وقت کے اس مشہور متکلم، موجودہ صدی کے اس ممتاز عالم کے قلم سے نکلی ہوئی کون سی چیز اس معیار پر اور اس پایے کی نہیں ہوتی؟

داد دینے کو دل مصنّف کو نہیں چاہتا، وہ بحمد اللہ اس منزل سے کہیں آگے نکل چکے ہیں۔ مبارک باد پیش کرنے کو جی ان حضرات کی خدمت میں چاہتا ہے جو اس کتاب کی طبع کا ذریعہ اور اشاعت کا باعث ہو رہے ہیں اور جو اسے پڑھیں گے، اس کے مضامین سے مستفید ہوں گے، اس کی روشنی میں اپنے دین کو، ایمان کو، عقاید کو سنبھال لیں گے، سُدھاریں گے، سنواریں گے۔

مولانا کو اس کتاب پر مفصل نظر ثانی کا، مزید تشریح و توضیح کا اگر کہیں اور موقع مل گیا ہوتا جب تو یہ کتاب خدا معلوم کیا سے کیا ہو جاتی! اب بھی جس صورت و ہیئت میں ہے ان شاء اللہ بہتوں کے لیے شمعِ ہدایت کا کام دے گی، اور خدا معلوم کتنے گرتے ہوؤں کو سنبھال لے گی! مسئلۂ قیومیت پر جو کچھ لکھا ہے، وہ تازگیِ فکر و ندرتِ عنوان کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ مولانا جوں جوں آگے بڑھتے گئے ہیں ان کے قلم کے اصل جوہر کھلتے گئے ہیں.............. گھوڑ دوڑ میں کامیاب ہوتے انھیں کو دیکھا ہے۔ جو شروع میں رفتار معمولی رکھتے ہیں اور پوری قوت دوڑ کی آخری ہی منزلوں پر دکھائی دیتی ہیں۔

ان کی ہر تحقیق میں قدامت کا استناد ہے اور ہر تعبیر میں جدت کی تازگی۔ یہ عجیب حکیمانہ امتزاج ہے اور ان کی فضیلت کا طرۂ امتیاز!

''بلبل'' کے لیے اگر ''گل'' کا ''ہم قافیہ'' ہونا کافی ہے تو اس بے علم کے لیے بھی بس کرتا ہے کہ وہ اس پیکرِ علم کے ساتھ ہم ردیف ہو رہا ہے!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ O

عبدالماجد

دریاباد، بارہ بنکی

۱۱ر فروری ۱۹۴۴ء

الدِّینُ القیّم

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم

سابق مدیر ماہ نامہ دارالعلوم - دیو بند

دورِ ماضی کے گزرے ہوئے واقعات کو یاد رکھنا اور اندازے، تخمینے اور گمان کے آئینے میں مستقبل میں پیش آنے والے حالات کی کوئی جھلک اور کوئی عکس پا لینا بشری فطرت کا ایک طبعی رجحان ہے۔ ہر کام کی ابتدا، ہر عمل کے شروع، ہر چیز کے آغاز اور ہر شے کے مآل، ہر فعل کے انجام پر واقف ہونا، انسانی عقل کا ایک فطری خاصہ ہے۔ شروع میں یہ خیال اپنے متعلق اپنی اصل اور نسل کے متعلق، اپنے حسب و نسب کے متعلق ہوتا ہے پھر کچھ پھیل کر اپنے کنبے اور خاندان کے گزرے اور آنے والے حالات کے تجسس پر محیط رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اپنی قوم اور اپنے ملک کے متعلق انسان کے دل میں بھی یہی شوقِ تحقیق و سراغ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ انسان کی عقل آفرینیوں کی آخری حدِ نظر ہے کہ جب وہ من وتو کی سب جزئی تقسیمات سے بلند ہو کر ساری نوع انسانی کے آغاز و انجام کے متعلق اس کھوج میں لگتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا؟ کب آیا؟ کیوں آیا؟ اسے کس نے پیدا کیا؟ کس طرح پیدا کیا؟ اسے کہاں جانا ہے؟ آگے کیا کرنا ہے؟ دنیا کی اس چند یومیہ زندگی پر اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے یا اس زندگی کے بعد کسی اور عالم میں اور کسی اور صورت میں یہ قید ہستی اس پر مسلط رہتی ہے؟ اور یہی وہ سوال ہیں جو ہماری فطرت کی گہرائیوں سے ابل ابل کر ہمیں مذہب کے قریب لانے اور اپنی بے یقین و بے حس روح کو مذہب کی حقیقت آفرینیوں اور بصیرت افروزیوں کی آغوش میں آسودگی و آرام حاصل کرنے کی طرف کشاں کشاں لیے جاتے ہیں۔

آغاز وانجامِ عالم کے متعلق انسانی عقل کے ان معرکہ آرا سوالات کا تسلی بخش جواب صرف مذہب نے دیا اور مذہب ہی دے سکتا ہے کہ اس کی نگۂ بصیرت پر محسوسات و غیر محسوسات کے سب اسرار، پنہاں ظاہر، ہستی وعدم کی سب تفصیلات عیاں اور ماضی و مستقبل کا ہر ہر جز روشن ہے۔ اس کی نظر اس عالم غیب کے کاروبار کو بھی اس یقین واعتبار سے دیکھ پاتی ہے، جس طرح وہ اس دنیاے شہادت کے نظارہ ہاے نو بہ نو اور جلوہ ہاے رنگ بہ رنگ سے مزہ لیتی ہے۔ وہ جس طرح تاریخ کی روشنی میں ہمارے ماضی کے ہر ہر واقعہ کو فر فر سنا دینے کی قدرت رکھتا ہے اسی طرح اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ وہ مستقبل کے متعلق بھی وحی والہام کی بنا پر کچھ نشان دہی کر دے۔ لیکن فلسفے کی ایک شاخ مابعد الطبعیات (میٹا فزکس) نے ان سوالات کو بھی چھیڑنے کی جرأت کی ہے جن کی گرہ کشائی کا حق صرف مذہب کو تھا۔ تاریخ، ریاضی، ہندسہ، کیمیا، طب اور ان تمام میکانکی علوم وصنایع نے نہ کبھی مذہب کے میدان میں قدم رکھا اور نہ کبھی ان سے مذہب کو اختلاف ہوا۔ صرف فلسفہ ہی ایک ایسا علم ہے جس میں غیبی حقایق کو اور مذہبی امور کو عقل کی گرفت میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کوشش میں وہ اکثر مذہب سے متصادم بھی رہا ہے اور جس کی بنا پر اب بھی کہا جاتا ہے اور فلسفے سے مرعوب ذہنیتوں نے پہلے بھی کہا ہے کہ فلسفے نے مذہب کی بنیادیں ہلا دیں، اپنی تحقیقات سے مذہبی حقایق کے سارے تانے بانے کو ادھیڑ کر رکھ دیا اور اس انسان کے آغاز وانجام کے متعلق مذہب نے جھوٹ کے جو پلندے باندھ باندھ کر رکھے تھے فلسفے نے اپنے دست قوی سے ان سب کو کھول کر پھینک دیا۔ حال آں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ انسان کی ہستی وعدم کے متعلق فلسفے کے سارے بیانات صرف اس کے اندازے، تخمینے اور ظنون پر مشتمل ہیں۔ ہر شخص اپنی دماغی خصوصیت، موروثی اثرات اور ماحول کے غیر شعوری رجحانات کے تحت ایک چیز سوچتا ہے، جو دوسرے سوچنے والوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس اختلاف کا صحیح اندازہ فلسفے کی تاریخ اور فلسفے کے مختلف اسکولوں کے ذخیرۂ کتب کے پڑھنے سے بہ خوبی ہوتا

ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فلسفیوں کی ساری موشگافیاں صرف فہم انسانی کی پے در پے الجھنیں، فرضی دقتیں، فرضی احتمالات اور شیطانی وساوس ہیں۔ جن میں یقین واذعان کو کوئی دخل نہیں بلکہ وہ سراسر شک وارتیاب ہے۔ فلسفی چوں کہ وحی والہام کے ذریعے معلومات سے محروم ہے، اس لیے یقینی طور پر نہ اسے کچھ معلوم ہوتا ہے نہ اس کی روح اس سوالات کا جواب اطمینان بخش پا سکتی ہے۔ اردو کے ایک شاعر نے بڑی اور بالکل سچ بات کہی ہے ؎

مرے جذبات ہیں مغلوبِ دانش
تری فطرت محبت ناچشیدہ!
مری نورس کلی جانِ گلستاں!
ترا سازِ تفکر نارسیدہ!

تری دنیا مہ و خورشید و افلاک
مری دنیا فضائے بزمِ لولاک
ترا جوشِ عمل تعمیر اوہام
مری سعی عمل تشکیلِ ادراک

مذہب دراصل انسانی زندگی کے ان ہی اہم اور بنیادی سوالات کا ایک اطمینان بخش جواب ہے۔ اس نے انسانی عقل کو شک وارتیاب اور انکار، بے یقینی کے جان گسل درد سے بچا کر اسے یقین واطمینان کی ایک دولت اور عرفان واسلام کی ایک نعمت عطا کی ہے۔ اس کے پاس اس سلسلے میں نہ فلسفیانہ موشگافیاں ہیں اور نہ بے فایدہ تفصیلات کا ایک انبار۔ ہر مسئلے کے ضمن میں اس کے چند کلمات خیر، شک و بے اطمینانی کی سب منزلوں سے گزار کر انسان کو دلی اطمینان عطا کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ان مذہبی حقایق کی تفصیل پر علمائے اسلام نے اپنا بڑا وقت خرچ کیا، بہت کچھ بولے اور بہت کافی لکھا اور پھر جب فلسفیوں کی نکتہ طرازیوں نے انسانی دماغ کو

شک و انکار کی طرف متوجہ کر دیا اور تمام دنیا فلسفے کی متشکّکانہ آوازوں سے گونج اٹھی تو یہ بھی علماے اسلام کا ایک قدرتی فرض ٹھہرا کہ ان حقایق کو شرح و تفصیل کے ساتھ فلسفیوں کی ان نامکمل تحقیقات کا بھی رد کر دیں۔ چناں چہ ابن رشدؒ و سیناؒ اور حضرت امام غزالیؒ، رازیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی بہت سی تصانیف اسی مضمون پر معرض وجود میں آئی ہیں۔

زمانے کی ہر کروٹ اور دنیا کی ہر جنبش انسانی تخیل و تفکر میں انقلاب پیدا کرتی ہیں اور جس طرح مادّی حالات تیزی سے بدلتے ہیں اسی طرح ہر عصرِ نو علوم و افکار کے ذخیرہ میں بھی تغیر پیدا کر دیتا ہے۔ مغربی علوم نے افکار و نظریات پر اثر ڈالا تو ان مشہور مسایل میں فلسفیوں کے شک و انکار نے بھی نئی صورت اختیار کی، نئی نئی باتیں پیدا ہوئیں اور نئی نئی الجھنیں سامنے آتی گئیں۔ گویا بڑی شدت کے ساتھ یہ ضرورت پیدا ہو گئی کہ علماے اسلام تردید ابطال کے جس میدان کو پہلے طے کر چکے تھے پھر اس میدان کی راہ نوردی پر مراجعت کریں۔ پہلے حکماے یونان کے اکاذیب و اباطیل ان کے پیش نظر تھے، اب ہیوم، اسپنسر، ہکسلے، کانٹ کی خرافات پر بحث ہو۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی نعمانیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور اس دور کے دوسرے ارباب علم و فضل نے اپنی مختلف تصانیف میں کافی روشنی ڈالی اور ان مسایل میں الجھے ہوئے دماغوں کی اصلاح کے لیے زبردست علمی خدمات انجام دیں، لیکن مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ اہل علم کے دلی شکریے کے مستحق ہیں کہ موصوف نے ''الدین القیم'' کے نام سے ابھی حال میں ایک سلجھی ہوئی کتاب لکھ کر ان مسایل پر پھر ایک نظر ڈالی اور ان فلسفیانہ شکوک و شبہات کے ازالے میں ان تمام کوششوں کو صرف کر دیا جو اگلوں نے پچھلوں کے لیے باقی چھوڑی تھیں۔

الدین القیم!

یہ دراصل مولانا گیلانیؒ کی ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو آپ نے جامعۂ عثمانیہ

کی تعلیم دینیات کے سلسلے میں اپنے عزیز طلبا کے لیے تعلیمی نوٹس کی حیثیت سے ارتجالاً قلم بند فرمائی تھیں۔ سالہا سال تک مولانا کے دوسرے مآثرِ علمیہ کی طرح یہ مجموعہ بھی گوشۂ گم نامی میں پڑا رہا، پھر مولانا کے ایک دو شاگردوں کے شوق ورغبت سے ترتیب واشاعت کے قابل بنا اور یوپی کے ایک مشہور مکتبہ نے انھیں کتابی شکل میں شایع کر دیا۔

علم کلام کے سلسلے میں ان حقائقِ اصلیہ پر دوسرے متکلمینِ اسلام بھی بہت کافی کلام کر چکے ہیں، لیکن مولانا کی یہ علمی خدمت اپنے نفع وفایدہ کے اعتبار سے اس لیے ممتاز ہے کہ مولانا نے مروجہ اردو اور اردو کے پسندیدہ اسلوب نگارش کے تمام کمالات کو باقی رکھتے ہوئے جہاں اصل مسایل پر پوری بحث فرمائی ہے وہاں ان کی تیز وکارگر نظر اس دور کے نوجوانانِ اسلام کے دلوں میں چھپے ہوئے ان چوروں تک بھی جا پہنچی ہے جن کا محبوبۂ خوش ادا کی حیثیت سے ان کے خلوت کدۂ دل کی گہرائیوں میں رچ بس کر رہ جانا مغربی مفکرین کی علمی کاوشوں کا اثر لازمی ہے۔ مولانا نے ابتداے کتاب میں فلسفے کے چار مشہور اسکولوں کے افکارِ علمی کا تجزیہ فرمایا ہے، پھر ان حقایق غیبی کی گرہ کشائی میں فلسفے کے عجز ونارسائی اور درماندگی وبیچارگی کی دل نشین الفاظ میں تفصیل بیان کی ہے اور ساتھ ہی یہ بتایا ہے کہ مغرب کے وہ فلسفی جو براہ راست اب سے تین ہزار برس پیشتر کے حکیم دیمقراطیس کے تھوکے ہوئے لقموں کو پھر سے چبا رہے ہیں اور ان مسایل میں اس کے پیدا کردہ شک وارتیاب اور انکار وبے اطمینانی کے مقلدِ محض ہیں، کن کن راہوں اور کتنی چال بازی سے دین وایمان کی سنگین عمارت میں نقب لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا نے بڑی خوب صورتی سے ان تمام تمہیدی امور کو بیان کیا ہے جو اصل مسایل کو سمجھنے اور ان مسایل میں دین وایمان کے فیصلے کی اہمیت وعظمت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے میں پڑھنے والوں کی پوری مدد کرتے ہیں اور ان ہی صفحات میں علم ووہم کے فرق، انسان کے علمی ذرایع، عقل کا حواس سے تعلق، روح ومادّہ کی حقیقت، ان کے متعلق مختلف اربابِ فکر کے اختلافات

اور آخر میں اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان الجھے ہوئے مسایل کے حل کی فطری اور بہترین راہ کیا ہے؟ وحی سے منقطع ہو کر دوسرے ذرایع سے مقصد برآری ممکن ہے کہ نہیں؟ مذہب اور فلسفے میں کیا فرق ہے؟

اس ابتدائی سلسلۂ سخن کے بعد آپ نے

① وجودِ باری تعالیٰ

② اثباتِ خدا کے متعلق مذہب کی راہ

③ توحید

④ مسئلۂ صفات

⑤ خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟

یہ چھ معرکہ آرا موضوع ہیں جن پر کثیر ضمنی اور ذیلی سرخیوں کے تحت میں آخیر تک بحث کی گئی ہے۔ مولانا کی یہ کتاب گو ظاہری نظر سے مختصر اور اجمال اور اختصار کے لحاظ سے "دریا بہ کوزہ" کہے جانے کی مستحق ہے اور اس بنا پر ہمارا جی چاہتا تھا کہ ہم اس دریاے ناپیدا کنار کی تہہ تک جا پہنچیں اور اپنے ساتھ اپنے قارئین کو بھی ان دریائی مناظر کی سیر و تفریح کے لیے لے چلیں، لیکن اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے وقت یہ مشکل پیش آئی کہ اس مختصر سے اور چھوٹے سے دریا میں ہر چہار طرف ہمیں جو موتی اور درہاے شہوار نظر پڑے وہ سب کے سب سچے اصلی اور بیش قیمت معلوم ہوئے۔ ہمارے لیے ان موتیوں میں انتخاب کرنا ناممکن ہوگیا۔ ہر موتی پر للچائی ہوئی نظریں پڑیں۔ ہر گوہر آب دار کو تہ دامن چھپا لینے کا شوق دامن گیر اور ہر درِ مکنون کو حاصل کرنے پر دل آمادہ ہوا، مگر دامانِ نگہ تنگ تھا اور گلِ حسن بسیار، نعمتوں اور لذتوں کی کثرت تھی اور فقیرِ بے نوا کا کشکول گدائی محدود، نظر سارے موتیوں کو سمیٹ لینے کی شایق تھی، لیکن جب وقت آیا تو گل چین بہار اپنے جیب و داماں کی تنگی کا گلہ گیر تھا، اس لیے ہم سفارش کرتے ہیں کہ ان مسایل سے دل چسپی رکھنے والے حضرات "الدین القیم" کو خود حاصل کر کے مطالعہ کریں، ان شاء اللہ وہ اس کتاب سے اپنی

توقع سے زاید نفع حاصل کرسکیں گے۔

''الدین القیم'' کوئی عام کتاب نہیں بلکہ بڑی سنجیدگی اور یقین سے اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان کتابوں میں ہے جو امت اور علماے سلف کی برسوں کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی کے بعد صورت تخلیق پاتی ہیں۔ ''سیرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ'' میں جس مصنف کی مجذوبانہ سرمستیوں اور عاشقانہ داستان سرائیوں اور متصوفانہ جذب وسلوک کا مزہ چکھا جاچکا ہے ''الدین القیم'' میں اسی دیوانہ اور دیوانہ ساز مصنف کی ہوش مندی اور فرزانگی کی ایک ادائے جانانہ بھی ملاحظہ ہو کہ مابعد الطبعیات کے ان ٹھوس حقایق پر مولانا کا کلام فرمانا جگر مرادآبادی کی زبان میں اس بات کا دعویٰ ہے:

رند جو مجھ کو سمجھتے ہیں انھیں ہوش نہیں
میکدہ ساز ہوں میکدہ بردوش نہیں

حصہ اول

مذہب اور اس کی ضرورت، وجود باری تعالیٰ اور صفات و شفاعت،
حقیقت محمدیہ اور مسئلہ تبلیغ و مواخذہ پر جامع مضامین کا مجموعہ

تصنیف

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی قدس اللہ سرہ

تدوین و ترتیب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

ناشر
مکتبہ اسعدیہ کراچی

فہرست مضامین

الدین القیم (حصہ اول)

مقدمہ

مذہب اور اس کی ضرورت

چند بنیادی سوالات

(۱)

فطرت انسانی کے مطالبات:

ماضی کی تلاش، مستقبل کی فکر، بشری فطرت کی ایک قدرتی بے چینی ہے۔ جوں جوں انسانی دل و دماغ بلند و بیدار ہوتے جاتے ہیں ان سوالات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ ایک تنگ خیال، پست فطرت آدمی صرف اپنی ذات کے ماضی اور مستقبل کو سوچتا ہے، جو اس سے اونچا ہوتا ہے، وہ اپنے خاندان کو بھی اس خیال میں شریک کر لیتا ہے۔ اسی طرح جو ان سے بھی عالی طبع ہوتے ہیں وہ نہ صرف خاندان بلکہ قوم و وطن کے متعلق بھی غور کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ فطرت انسانی کی بلندی کا ایک نقطہ وہ بھی ہے جہاں ذات و خاندان قوم و جنس ہی نہیں بلکہ خود اس عالم کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کا یہ دریائے ناپیدا کنار جس کے ایک گوشے میں آفتاب و ماہ تاب تنکے کی طرح تیر رہے ہیں اور فطرت کا یہ بحر ذخار جس میں ہر آن ہر لحظہ کروڑوں ہستیاں اگتی اور ڈوبتی رہتی ہیں آخر اس کا نقطہ آغاز اور ابتدائی سرچشمہ کیا ہے؟ اور گنبد گرداں کے ان چکروں کا آخری انجام کیا ہوگا؟ انسان جب تک انسان ہے جب تک اس کے کاسۂ سر میں جانوروں کا مغز نہیں بلکہ انسانی دماغ کی بلندی اور ذہنی وسعت باقی ہے۔ یہ سوالات بھی باقی رہیں گے اور ان کو باقی رہنا بھی چاہیے کہ اس جستجو کے بغیر انسانی زندگی کا ماضی و مستقبل بجز تاریکی کے اور کچھ نہیں ہے۔ آخر جس کا ماضی بھی تاریک اور مستقبل بھی اندھیرے میں ہو کیا وہ کہہ سکتا ہے کہ میں روشنی میں ہوں؟ کہاں سے آ رہا ہے کہاں جا رہا ہے؟ جس مسافر کے لیے یہ دونوں باتیں مجہول ہوں اس کے سفر کا انجام معلوم؟؟؟

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (سورۂ ملک:۲۲)

''کیا جو اوندھے منہ جارہا ہے (نہ آگے کا حال اسے معلوم نہ پیچھے کا) وہ سیدھی راہ پر ہے یا وہ جو کھڑا سیدھی راہ جارہا ہے؟''

خلاصہ یہ ہے کہ گذشتہ اور آیندہ کے متعلق جتنی بلندی سے سوال اٹھایا جائے گا اسی نسبت سے تاریکی بھی گھٹے گی اور روشنی بڑھے گی۔

بہر حال! فطرت کے یہی دو مطالبے ہیں جو دراصل مذہب کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے سوا اور بھی چند سوالات ہیں جو قریب قریب ان ہی دو سوالوں کی طرح ہماری فطرت کی گہرائیوں سے اُبلتے رہتے ہیں اور مذہب کی تعمیر میں ان کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اب ہم ترتیب کے ساتھ ان چند اہم سوالات کو ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

بنیادی سوالات:

① عالم کا نقطہ آغاز کیا ہے؟

② اس کا آخری انجام کیا ہوگا؟

③ ہر چیز کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کے کام آئے۔ پھر انسانی وجود کا کیا مقصد ہے؟ ❶

---

❶ بہ ادنا تامل واضح ہوسکتا ہے کہ آدمی تو دنیا کی چیزوں کے بغیر نہیں جی سکتا ہے۔ آخر اگر ہوا نہ ہو، پانی نہ ہو، زمین نہ ہو، اس کی پیداواریں نہ ہوں، آفتاب نہ ہو، اس کی روشنی اور حرارت نہ ہو تو زمین کے اس کرّے پر کیا چند لمحے بھی ہم گزار سکتے ہیں؟ لیکن اس کے برخلاف اگر اس خاک دان ارضی سے انسانی نسل غایب ہوجائے تو آپ ہی خیال کیجیے کہ دنیا کی کسی چیز کا کیا بگڑے گا؟ سب ہمارے لیے ہیں اور ہم ان میں سے کسی کے لیے نہیں ہیں۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اسی پر یہ سوال مبنی ہے کہ پھر ہستی کے اس مضافات میں ہمارے وجود کے ساتھ قدرت نے کس مفاد کو وابستہ کیا ہے۔ تفصیلی طور پر ''الدین القیم'' کے دوسرے حصے میں اس پر مفصل بحث آئے گی۔

④ کیا زندگی کی موجودہ کش مکش سے نجات کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟
⑤ کیا بقائے دوام کی فطری خواہش مغالطی اور وہمی طور پر نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں پوری ہوسکتی ہے؟
⑥ علمی اور عملی طور پر ہم میں ہر شخص غیر محدود ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ جو چاہوں کروں اور جو کچھ چاہوں جانوں۔ کیا فطرت انسانی کا یہ مطالبہ اپنے مقصد کو پا سکتا ہے؟

یہی سوالات ہیں جن کے جواب کا نام مذہب ہے۔ یہی پیاس ہے جس کے پانی کی تعبیر ''دین'' سے کی جاتی ہے۔ یہی بھوک ہے جس کی خوراک صرف ''پیغمبروں'' کا پیغام ہے اور انہی سوالات کا حل کرنا مذہب کی اصل غرض و غایت ہے۔

فطرت انسانی کی انہی بے چینیوں اور اضطراب کی تصویر ڈاکٹر اقبال نے کتنے اچھے لفظوں میں کھینچی ہے

درون سینۂ ما سوز آرزو زکجاست
سبو زماست ولے بادہ در سبو زکجاست
گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ماکف خاکیم
بہ ذرہ ذرۂ مادرد و جستجو زکجاست
نگاہِ ما بہ گریباں کہکشاں افتد
جنون ما زکجا شور ہائے وہوز کجاست

مذہبی سوالات اور علوم عقلیہ:

مذہب نے ان سوالات کو جن ذرائع سے حل کیا ہے اس کے بتانے سے پیشتر یہ دیکھنا چاہیے کہ مذہب سے کنارہ کش ہوکر کیا صرف عقلی علوم کی رہنمائی میں ہم ان سوالوں کو حل کر سکتے ہیں؟ بحث کے لیے صرف اس سوال کو لو کہ عالم کا نقطۂ آغاز اور انجام کیا ہے؟ کیوں کہ اس کے حل ہو جانے کے بعد تقریباً دوسرے سوالات خود بہ خود

حل ہو جاتے ہیں۔ اب آؤ اور عقلی علوم کی روشنی میں ان کا جواب ڈھونڈو۔

یوں تو عقلی علوم کی بہت سی شاخیں ہیں، لیکن اجمالی طور پر ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک کا نام سائنس ہے اور دوسرے کو فلسفہ کہتے ہیں۔

پہلے ہم سائنس کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس معاملے میں وہ ہماری کس حد تک مدد کر سکتی ہے؟

مذہبی سوالات اور سائنس کی حدِّ پرواز:

مذہب کے اس بنیادی سوال کو سائنس حل کر سکتی ہے یا نہیں؟ اس کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ سائنس کی حدِّ پرواز کیا ہے۔ علمائے سائنس نے اس علم کے حدود کو معین کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمام تر فطرت (Nature) کے ان واقعات اور مشاہدات سے ہے جو ہمارے زیرِ تجربہ آسکیں، لیکن جو چیزیں ہمارے احساس اور مشاہدے کے دایرے سے خارج ہیں سائنس کو ان کے اقرار و انکار سے کچھ بحث نہیں۔

ماہرین سائنس کا اعتراف:

پروفیسر لیتر جو فرانس کا مشہور ماہر سائنس ہے لکھتا ہے:

"کاینات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے، اس لیے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں، جس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ رہتا ہے۔"

پروفیسر ٹنڈل نے اس خیال کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

"اگر تم گھڑی کو دیکھو اس میں گھنٹے، منٹ، سکنڈ کی سوئیاں نظر آئیں گی، یہ سوئیاں کیوں پھرتی ہیں اور ان کی حرکت کی باہمی نسبت جو ہمیں نظر آتی ہے

کیوں کر قایم ہے؟ ان سوالات کا جواب بے گھڑی کے کھولے اور اس کے مختلف پرزوں کو اچھی طرح دیکھے اور ان کا دوسروں سے تعلق قایم کیے بغیر نہیں دیا جا سکتا ہے۔ جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے تو ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ سوئیوں کی یہ خاص حرکت گھڑی کی اندرونی ساخت اور مشین کا نتیجہ ہے، جو کوک کی قوت سے چل رہی ہے۔ سوئیوں کی یہ حرکت صنعت انسانی کا ایک کارنامہ ہے، لیکن بجنسہٖ یہی حال واقعات وحوادث فطرت کا ہے۔ عالم کی اس مشین کے اندر بھی ایک مخفی مشین کارفرما ہے اور ایک خزانۂ قوت سے پردہ ہٹا کر یہ بتاتا ہے کہ واقعات وحوادث ان ہی دونوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ ہیں، لیکن کارخانۂ عالم کی یہ اندرونی مشین خود کیا ہے اور کیسے بنی اور اس گھڑی کو کس نے کوکا اور اس کو چلانے والی قوت کہاں سے آئی؟ یہ سوالات ہیں جن کا جواب سائنس کے بس سے باہر ہے۔''

انسان کسی چیز کی تحقیق وایجاد پر قادر نہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس نہ تو قدرتی قوانین کو ایجاد کرتی ہے نہ ان قوانین کی تمام کڑیوں کو سلجھا کر ہمارے سامنے پیش کر سکتی ہے بلکہ حوادث و واقعات کے محض ان حلقوں کو ترتیب کے ساتھ ہمیں بتانے کی کوشش کرتی ہے جو اس کے دائرۂ احساس و مشاہدے میں آ جاتے ہیں۔ مثلاً وہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا نہیں کرتی بلکہ صرف یہ بتاتی ہے کہ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ جلاتی ہے۔ وہ اسٹیم کو ایجاد (وجود بخشنا، تخلیق کردن) نہیں کرتی بلکہ صرف اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ جب آگ کا تعلق پانی سے ہوتا ہے تو یہ ایک قدرتی قانون ہے کہ وہ بھاپ بن جائے۔ بہرحال ہمارے سامنے جو کچھ قدرتی قوانین پھیلے ہوئے ہیں ہم ان کو بنا نہیں سکتے بلکہ صرف جان سکتے ہیں اور سائنس اس پر اتنا اور اضافہ کرتی ہے کہ اسی حد تک جان سکتے ہیں جس حد تک مشاہدہ ہمارا ساتھ دے گا، لیکن یہ سوال کہ ان قوانین کا مقنن کون ہے؟ ان کا نقطۂ آغاز کیا ہے اور ان کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس کے

حدود سے اس کا جواب خارج ہے۔
ہکسلے نے سائنس کی اسی درماندگی کا اندازہ کرنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ

"وہ کسی چیز کی بھی کامل توجیہ نہیں کرسکتی۔ اس کے سارے اسباب اوّل سے آخر تک نہیں بتائے جاسکتے، کیوں کہ انسان کا اعلیٰ علم بھی توجیہ میں آغاز اشیا کی جانب چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

حکیم اور عامی میں فرق:

بہر حال! انسان کی انتہائی پرواز سائنس کے نقطۂ نظر سے صرف اس قدر ہے کہ کُل نہیں بلکہ فطرت کے صرف ان قوانین کو وہ جان سکتا ہے جو اس کی گرفت میں آجائیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ جب صرف محسوس قوانین کی واقفیت تک عام انسانی پرواز ختم ہوجاتی ہے تو حکیم اور عامی میں کیا فرق رہا؟ تو بات یہ ہے کہ گو عامی کا علم بھی مشاہدات اور محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حکیم بھی اس دایرے کے آگے قدم نہیں رکھ سکتا، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامی آدمی کسی حادثے یا مظہر قدرت کو جب دیکھتا ہے تو وہ اس کے اثرات کو دور تک نہیں لے جاسکتا۔ یعنی ایک جزئی واقعے سے کلیہ نہیں بنا سکتا اور حکیم ایک جزئی واقعے کو دیکھ کر چونکتا ہے اور یہ دیکھنا شروع کرتا ہے کہ آیا یہ واقعہ اسی جزیہ تک محدود ہے یا آگے بھی بڑھ سکتا ہے۔ پس اگر اس میں کچھ وسعت نظر آتی ہے تو چند جزئیات پر منطبق کرنے کے بعد اسی جزیہ کو وہ کلیہ کی شکل عطا کرتا ہے اور اسی کو قانون کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ مثلاً نیوٹن نے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا۔ اس طرح ہر شخص دیکھتا ہے، لیکن وہ چونکا کہ آخر کیوں گرتا ہے؟ اس کو محسوس ہوا کہ زمین کی کشش کا نتیجہ ہے۔ اب اس کشش کی خاصیت کو اس نے دوسری چیزوں میں ڈھونڈھنا شروع کیا، بالآخر اس نے اعلان کیا کہ فضا میں جتنے کرّے تیر رہے ہیں وہ سب جذب وکشش ہی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ بہر حال نیوٹن نے فضائی کرّوں کی خاصیت کا ایک علم حاصل کیا، لیکن کون کہہ سکتا ہے

کہ وہ ان کرّوں کا موجد تھا یا اس نے ان میں جذب و کشش کی خاصیت پیدا کر دی تھی۔ جو قانون پہلے سے موجود تھا صرف اس کا علم اس نے حاصل کیا۔ اس سے زیادہ نہ اس نے کچھ کیا اور نہ کر سکتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے:

> ''عالم فطرت کی یہ نیرنگیاں (جذب و کشش) واجب الوجود کے ارادے کے سوا کسی شئے سے ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ وہ واجب الوجود جو ہر جگہ اور ہمیشہ موجود ہے۔''

اور یہی حال سائنس کے تمام مسایل اور اختراعات کا ہے۔ بھاپ سے کیتلی کے ڈھکنے کو اٹھتے ہوئے سب ہی دیکھتے ہیں۔ جس طرح اسٹی فن نے دیکھا، لیکن اسٹی فن نے اس جزئی مشاہدے سے ایک کلیہ پیدا کیا اور اس کلیہ کو فطرت کے دوسرے قوانین مثلاً لوہے کی لچک، پہیوں کی گردش، اسی قسم کے میکانکی قوانین کے علم کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اس نے اپنے کسی پیدا کردہ قانون کو نہیں بلکہ قدرتی قوانین کو اس شکل میں نمایاں کیا ہے، جسے ہم ٹرین کہتے ہیں۔

الغرض صنعت و حرفت والے قدرتی قوانین کے جزئیات سے کلیات کا علم حاصل کرتے ہیں، لیکن کسی چیز کی ایجاد ''یعنی اس کو وجود بخشنا'' ایک غریب انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ فقط

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا. (سورۂ بقرہ:۳۱)

''سکھایا اللہ نے آدم کو سارے اسماء''

کے اجمال کی تفصیل کر سکتا ہے اور یہی اسے دیا بھی گیا ہے۔

سائنس اور مذہب کے حدود:

الحاصل جب سائنس کا سارا زور مشاہدات اور محسوسات پر ختم ہو جاتا ہے تو خود اندازہ کرو کہ جن سوالات پر مذہب کی بنیاد قایم ہے مثلاً عالم کا نقطہ آغاز کیا ہے؟ جیسا کہ ہکسلے نے کہا تھا کہ سائنس کا قدم آغاز اشیا کی جانب چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، تو پھر آخری نقطے تک اس کی رسائی کیوں کر ہو سکتی ہے؟

پس سچ یہ ہے کہ سائنس جہاں اپنی تحقیقات ختم کر دیتی ہے مذہب وہیں سے اپنا درس شروع کرتا ہے سائنس صرف عالم شہادت ''عالم محسوس'' کے چند واقعات محسوسہ کو کلیات کی شکل میں پیش کر کے اپنے بازو ڈال دیتی ہے محسوسات کے آگے قدم رکھتے ہی اس پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آگے کیا ہے؟ اور مذہب انسان کا یہیں سے ہاتھ پکڑتا ہے اور غیب ''عالم غیر محسوس'' کے سارے اسرار کو اس کے سامنے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے۔ سائنس کچھ نہیں بتا سکتی کہ دنیا کی ابتدا کیوں کر ہوئی۔ مذہب آتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔ انسان مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے اور اس پر کیا گزرتی ہے؟ سائنس اس کے جواب سے عاجز ہے اور مذہب اس کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ دنیا کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس متحیر ہے کہ اس کا کیا جواب دے؟ مذہب آتا ہے اور اس حیرت کو مٹا دیتا ہے۔

سائنس یہ تو بتاتی ہے کہ عالم کس کے لیے ہے، لیکن خود انسان کس لیے ہے اس مقصد کو متعین کرنے سے وہ عاجز ہے۔ مذہب آتا ہے اور اس مسئلے کو بھی صاف کر دیتا ہے۔ الغرض مذہب کا جس عالم سے تعلق ہے سائنس کی ہدایت کا چراغ اس کے حدود تک پہنچتے ہی گل ہو جاتا ہے۔ میلن ایڈورڈ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کہ

> ''عالم کے ان قوانین کے نسبت یہ کہنا کہ محض بخت و اتفاق کے نتائج ہیں، یہ فرضی احتمالات اور عقلی گم راہیاں ہیں، جسے لوگوں نے محسوسات کا لقب دے رکھا ہے۔ فزیکل سائنس جاننے والا ہرگز اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔'' (الکلام، مولانا شبلیؒ)

اس کے بعد عوام الناس کا خیال کہ سائنس کی جدید تحقیقات نے مذہب کی بنیادیں ہلا دی ہیں، جیسا کہ گینٹرو نے غایت گستاخی کے ساتھ لکھا ہے کہ

> ''ہم نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کر کے اس کو سرحد پار پہنچا دیا۔''

نعوذ باللہ تعالیٰ کس درجہ جاہلانہ اور مضحکہ خیز ہے۔ کسی نے (1) خوب کہا ہے کہ

(1) میری مراد مولانا عبدالباری ندویؒ پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ سے ہے۔ مولانا نے مسلم ایجوکیشنل ←

"اگر خشکی کی ٹرین سمندر کے جہاز سے ٹکرا سکتی ہے تو سائنس بھی مذہب سے ٹکرا سکتی ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ جب دونوں کے حدود جدا جدا ہیں، ایک کی تگ ودو محسوسات کے تنگ دایرے تک محدود ہے اور دوسرا غیبی فضا کا شہباز ہے، تو ان دونوں میں تصادم کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ سچ فرماتے ہیں:

عاقلاں نقطۂ پرکار وجود اندولے
عشق داند کہ دریں بادیہ سرگردانند

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس اور مذہب بالکل دو جداگانہ چیزیں ہیں، نہ ان دونوں میں اختلاف ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ ہم سائنس کے ذریعے آسمان کے تاروں کو گن سکتے ہیں، آفتاب کو ناپ سکتے ہیں، ہوا کو تول سکتے ہیں، سمندر کو خشک کر کے بادل بنا کر پانی برسا سکتے ہیں، بلکہ ممکن ہے کہ آیندہ مردوں کو زندہ کرنے کی تدبیر بھی معلوم ہو جائے، جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "احیائے موتی" [1] (مردے کو زندہ

➤ کانفرنس منعقدہ سورت میں ایک مقالہ "دینیات اور عقلیات" کے عنوان سے پڑھا تھا یہ رسالہ کانفرنس کی طرف سے شایع بھی کر دیا گیا ہے۔ ارباب تحقیق نے باوجود اختصار کے اس مقالے کی کافی ستایش کی۔ حضرت مولانا تھانویؒ نے تو دین و بے دینی کے درمیان سد آہنی اسی رسالے کو قرار دیا ہے۔ خاک سار نے بھی اس کتاب کے ابتدائی حصے میں مولانا کے اس مقالے سے کافی نفع اٹھایا ہے، بلکہ مغربی مصنفین کے اقوال جو اس حصے میں درج ہیں ان کی معقول تعداد مولانا ہی کے مضمون سے نقل کی گئی ہے۔

[1] دجال کی حدیثوں میں اس کا ذکر ہے کہ من جملہ اور باتوں کے وہ مردے کو بھی زندہ کرے گا۔ حدیثوں کا صحیح ذخیرہ دجال کی اس خصوصیت کے ذکر سے معمور ہے، بلکہ دجال کی یہ خصوصیت کہ چالیس دن کی مختصر مدت میں کرۂ زمین کے شمال وجنوب، مشرق ومغرب کی ہر آبادی میں پہنچ جائے گا یعنی بعد مسافت کے مسئلے کو گویا درجۂ صفر تک پہنچا دے گا۔ یا مون سون پر قابو یافتہ ہو کر جہاں چاہے گا پانی برسائے گا۔ آپ اگر غور کریں گے تو سائنس کے رجحانات ان چیزوں کی تکمیل کی طرف ہیں۔ ریل، موٹر، جہاز، ٹیلی فون، ریڈیو وغیرہ کا حاصل بعد مسافت کی کمی کے سوا اور کیا ہے؟ بارش برسانے کی جدوجہد بھی سنا جاتا ہے کہ سائنس کی دنیا میں جاری ہے۔ پھر کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ انتہائی عروج ممکن ہے کہ دجال ہی کے ہاتھوں پر مقدر ہو۔

کر دینے) پر بھی آدمی قادر ہو جائے گا، بلکہ زندہ کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں اسی کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ

''انسان زندگی کے قانون سے بھی واقف ہو جائے گا۔''

اور سائنس والوں کا بھی بیان ہے کہ ہم نے ''تخم حیات'' (پروٹو پلازم) کا پتا چلا لیا ہے، کیمیا والے کہتے ہیں کہ تخم حیات کاربن، آکسیجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے تیار ہوتا ہے...... تو سائنس یہ سب کچھ کر سکتی ہے اور ہم منتظر ہیں کہ وہ ایسا کرے، کیوں کہ ہمارے بہت سے ایمانی دعووں کی توثیق انھیں انکشافات پر موقوف ہے، لیکن بہ ایں ہمہ مذہبی سوالات کے حل میں سائنس اسی طرح عاجز رہے گی جس طرح پہلے تھی اور اس وقت تک ہے۔ فرض کیجیے کہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ہم نے زندگی کو پیدا کر بھی لیا تو اس سے یہ مسئلہ کہاں حل ہوا کہ ان عناصر کی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ ٹھیک اس کی مثال ایسی ہے کہ زندگی کا راز کسی زمانے میں یوں حل کیا گیا تھا کہ نر و مادہ کے باہمی اختلاط کا یہ نتیجہ ہے، لیکن اس وقت بھی یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس اختلاط سے یہ نتیجہ کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اب بھی یہ سوال اسی طرح باقی رہے گا کہ کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ کیا جو شخص اس سے واقف ہے کہ تخم کو مٹی میں ملانے اور پانی دینے سے پودا پیدا ہو جاتا ہے، کیا اس نے اس سوال کو حل کر لیا کہ پودا کیوں کر پیدا ہوتا ہے؟ پروفیسر ٹنڈل نے بلفاسٹ کے لیکچر میں ایک موقع پر کتنی اچھی بات کہی کہ

''لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہمیشہ کے لیے اسی طرح ناممکن رہے گا جس طرح کہ رہا ہے۔''

امجد حیدرآبادی نے بھی اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے ؎

امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں
ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

الحاصل! کسی شے کے آغاز کا پتا چلانا اور اس کے آخری انجام تک پہنچنا سائنس

کی رہنمائی میں ناممکن ہے۔ چند قدم چل کر اس کو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ علی الخصوص جب حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

اور یہی حال انجام کا ہے۔ آیندہ کیا ہوگا؟ موجودہ قوانین کا آیندہ کیا حال ہوگا؟ ان کے آثار ونتائج کیا ہوں گے؟ اس کا بھی کوئی قطعی جواب سائنس نہیں دے سکتی۔ وہی ہکسلے جس نے آغاز کے متعلق انسان کے جاہل ہونے کا اقرار کیا تھا اب انجام کے متعلق بھی اسی اعتراف کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

> ''عالم تو بڑی چیز ہے، سائنس کا معمولی قانون یہ ہے کہ جو پتھر بے سہارا ہوگا اس کو زمین پر گر پڑنا چاہیے لیکن ہمیشہ کیا یہی ضرور ہوگا؟''

اس کے نزدیک یہ قانون قدرت نہیں بلکہ انسان کا وہمی اضافہ ہے۔ اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

> ''وہ ڈراؤنا لزوم اور ضروری ہونے کا قانون کیا ہے جس نے لوگوں کو اس قدر خائف اور وحشت زدہ بنا رکھا ہے؟ سچ پوچھو تو یہ ہمارے واہمہ کا ایک گھڑا ہوا بھوت ہے۔ سائنس ہی کا یہ قانون ہے کہ پتھر جب بے سہارا ہوگا تو اس کو زمین پر گر پڑنا چاہیے، لیکن آیندہ وہ ہمیشہ گر ہی پڑے گا یعنی اس کے خلاف ہونا ناممکن ہے، یہ ایک ایسی زاید شے کا اضافہ ہے جس کا نہ تو مشاہدہ اور واقعات میں نشان ملتا ہے اور نہ کہیں اور سے اس کا پتا چلتا ہے۔''
>
> (ماخوذ از فزیکل بلیس آف لائف)

یعنی یہ ایسا حکم ہے جس کی شہادت ہمارے حواس نہیں دیتے۔ سائنس کی یہ رائے تو انجام کے متعلق تھی۔ رہا آغاز! اس کے متعلق میں نے چند اقوال پہلے بھی درج کیے ہیں، لیکن آخر میں ہکسلے ہی کے قول کو پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ وہ اپنی کتاب ''اصول ونتائج'' میں لکھتا ہے۔

> ''وجود کی علت اولیٰ کا مسئلہ میرے حقیر قویٰ کی دسترس سے باہر ہے۔ جتنی لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا ان میں سب سے بدتر ان

لوگوں کے دلایل ہوتے ہیں جو آغاز عالم کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں،
مگران لوگوں کے مہملات ان سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں جو یہ ثابت کرنا
چاہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے۔''

مذہبی سوالات اور فلسفہ:

مذہب جن سوالات کو حل کرتا ہے میں نے بتایا ہے کہ ان میں اہم ترین سوال عالم کے آغاز و انجام ہی کا تھا۔ باقی سوالات انھیں دو سوالوں کی ذیلی اور تفصیلی شکلیں ہیں۔ سائنس تو یہ کہہ کر اکھاڑے سے نکل گئی کہ ان سوالات کا تعلق غیب سے ہے اور ہماری بحث کا دایرہ صرف محسوس قوانین تک محدود ہے۔ اس لیے غیر محسوس قوانین کے سوالوں کے جواب ہمارے فرایض میں داخل نہیں، اب فلسفہ کی اونچی دوکانیں سامنے آتی ہیں، آؤ ذرا ان کی بھی سیر کرلیں۔

سنا جاتا ہے کہ اس علم میں محسوسات کی چار دیواریوں کو پھاند کر محسوس قوانین کے دایرے سے نکل کر ان امور کا بھی پتا چلایا جاتا ہے جو مشاہدہ اور تجربے کی گرفت سے باہر ہیں اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ فلسفہ کے شعبہ مابعد الطبعیات والوں نے ان سوالات کو بھی چھیڑا ہے جن کی گرہ کشائی کا محض مذہب حق دار تھا اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی علم سے اگر مذہب کی ٹکر ہو بھی جاتی ہے تو وہ صرف فلسفہ ہے، بلکہ فلسفہ کی صرف ایک شاخ کے مابعد الطبعیات۔ ورنہ ظاہر ہے کہ تاریخ، ریاضی، ہندسہ، کیمیا، طب، اور دیگر میکانکی علوم یا صنایع نے نہ کبھی مذہب کے میدان میں قدم رکھا اور نہ کبھی ان سے مذہب کو اختلاف ہوا۔ صرف فلسفہ ہی ایک ایسا علم ہے جس میں غیبی حقایق اور مذہبی امور کو عقلی گرفت میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کوشش میں کبھی کبھی وہ مذہب سے متصادم ہو جاتا ہے۔ یہی معمولی تصادم ہے جس کی بنیاد پر اس زمانے میں ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ علم نے مذہب کی بنیادیں ہلادیں۔ حالاں کہ میں بتا چکا کہ اگر ''علم'' سے مراد مابعد الطبعیات کے سوا کوئی اور علم ہے تو اس سے زیادہ بے بنیاد، گندہ جھوٹ ممکن نہیں اور اگر صرف مابعد الطبعیات مراد ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ

ایک حد تک درست ہے، لیکن فلسفے کے نادان مرید اپنے پیروں کو جتنی بلندی پر لے جاکر اڑانا چاہتے ہیں۔ واقعات بتائیں گے کہ قطعاً وہ اس کے مستحق نہ تھے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مابعد الطبعیات میں جن امور کے متعلق رائے قایم کی جاتی ہے ان کا تعلق مشاہدات اور تجربات سے نہیں ہوتا، اس (کے) لیے کچھ قیاسات اور تخمینے، ظنون اور اندازے ہوتے ہیں، جن کے بل پر رائے قایم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے کہ ان رایوں میں اختلاف اور شدید اختلاف پیدا ہوجائے۔ ہر شخص اپنی دماغی خصوصیت، موروثی اثرات اور ماحول کے غیر شعوری تاثرات کے تحت ایک تجویز پیش کرتا ہے۔ جو دوسرے سوچنے والوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ فلسفے کی تاریخ پڑھنے سے ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند اندھے ہیں جو آنکھ سے ہاتھی کو دیکھ نہیں سکتے اور صرف چھوکر اس کی شکل وصورت کے متعلق رائے قایم کررہے ہیں، ہر ایک نئی مثالوں اور جدید تشریحوں کے قالب میں اپنے نتائج کو ڈھال کر پیش کررہا ہے۔ گویا ع

صورت نادیدہ راتعین بہ تخمین کردہ اند

بہرحال یہ آپس میں جتنا بھی چاہیں الجھیں، مجھے اس سے کیا بحث؟ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ فلسفہ اور مذہب کے اختلاف کا بہ ظاہر اس زمانے میں جوڈنکا پیٹا جارہا ہے دیکھیں تو سہی کہ اس طبل بلند بانگ کے اندر بھی کچھ ہے؟

فلسفہ کے چار اسکول:

فلسفیوں کے ان تمام اختلاف کو پیش نظر رکھ کر اس زمانے میں فلسفہ کو چار اسکولوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اب آؤ اور دیکھو کہ ان اسکولوں میں کتنے ایسے اسکول ہیں جنھوں نے مذہب سے پنجہ آزمائی کی کوشش کی ہے۔

یوں تو کہنے کو بہت کہا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان چار اسکولوں میں صرف ایک اسکول ایسا ملے گا جس کو مذہب کا صحیح معنوں میں حریف اور مدمقابل کہا جاسکتا ہے۔ ورنہ اس کے علاوہ دو اسکول صرف یہی نہیں کہ مذہب کے وہ مخالف نہیں ہیں

بلکہ اس کے حامی اور مددگار ہیں اور تیسرا اسکول ایسا ہے جو اگر موافق نہیں ہے تو اس کو مذہب کی مخالفت سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ ذیل میں ہر ایک اسکول کے اصولی نقطۂ نظر کو بیان کر کے بتایا جائے گا کہ ان کا اثر مذہب پر کیا پڑتا ہے؟

لیکن اس سے پہلے کہ ان فلسفیانہ مذاہب کا تذکرہ کیا جائے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ فلسفہ کے ان مکاتب خیال کے اختلاف کی بنیاد کیا ہے؟

فلسفہ کے اختلاف کی بنیاد:

بات یہ ہے کہ عالم محسوس جس میں عناصر جمادات، نباتات، حیوانات سب شریک ہیں مجموعی حیثیت سے غور کرنے کے بعد ان میں دو قسم کے صفات نظر آتے ہیں: حیاتی اور غیر حیاتی۔ مثلاً طول، عرض، شکل، وزن، روشنی، حرکت، حرارت، برودت وغیرہ وغیرہ۔ یہ غیر حیاتی صفات ہیں یعنی ان کو زندگی کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں۔ مردہ اور زندہ ہر قسم کے موجودات میں یہ صفات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح علم، ارادہ، شعور، بینائی شنوائی وجود کے ایسے صفات جنھیں ہم بغیر زندگی کے سوچ ہی نہیں سکتے۔ اسی لیے ان کا نام حیاتی صفات ہے۔

اب عالم محسوس کی ان ہی دو مختلف قسم کے صفات کو سامنے رکھ کر متفرق سوچنے والوں نے مختلف رائیں قایم کیں۔ ان ہی رایوں کو اجمالی طور پر چار اسکولوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) ثنویت:

فلسفے کا پہلا اسکول ثنویت کا ہے۔ اس کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ صفات و آثار کے یہ دو مختلف مظاہر (حیاتی و غیر حیاتی) چوں کہ باہم ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں، اس لیے ان دونوں کے سرچشموں کو بھی علاحدہ ہی ماننا چاہیے۔ اسی بنا پر انھوں نے عالم کی بنیاد دو چیزوں پر قایم کی:

ایک روح یا خدا جو حیات مطلق ہے اور عالم کے سارے حیاتی صفات مثلاً

ادراک اور علم وارادہ وغیرہ کا وہی منشا ومرجع ہے۔

دوسرا مادّہ جو کائنات کے تمام غیر حیاتی صفات کا مصدر اور سرچشمہ ہے۔

یہ وہ خیال ہے جس کی ابتدا ارسطو سے مانی جاتی ہے۔ متاخرین میں ڈیکارٹ تک فلسفیوں کا بڑا گروہ فلسفے کے اسی مکتب خیال کا پیرو ہے۔

فلسفہ کے اس اسکول میں جب خدائے زندہ وقادر کا کھلے لفظوں میں اقرار کیا جاتا ہے اور خدا ہی پر مذہبی ایوان کے سارے ستون مثلاً عبادت، اخلاق، سزا وجزا، حشر ونشر وغیرہ قایم ہیں تو اس اسکول کو نفس مذہب کی مخالفت سے ظاہر ہے کیا سروکار ہوسکتا ہے۔

۲ تصوریہ:

فلسفے کا دوسرا اسکول تصوریہ کا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح حیاتی صفات کا سرچشمہ خدا یا روح ہے اسی طرح غیر حیاتی صفات بھی اسی کی جلوہ آرائیوں کا نام ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ صرف روح (یعنی خدا) کے مختلف صفات کا ظہور مختلف حیثیتوں سے ہورہا ہے۔ الغرض ان لوگوں کے نزدیک مادّہ ایک بے معنی سی چیز ہے۔ یہاں صرف روح یا خدا اور اس کے مختلف جلوے ہیں۔ اس خیال کی ابتدا افلاطون سے ہوئی اور کسی نہ کسی شکل میں اس زمانے کے تمام سر برآوردہ فلاسفہ برکلے سے لے کر برگسان تک اسی خیال کی تائید پر مصر ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب اس مسلک میں خدا کا اقرار اتنی بلند آہنگیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اس کے سوا کسی دوسری چیز کا ماننا بھی انھیں گوارا نہیں تو فلسفے کے اس اسکول کو بجائے دوست کے مذہب کا دشمن کیسے ٹھیرایا جاسکتا ہے؟

۳ مادّیت:

ان لوگوں کا خیال..... تصوریہ کے بالکل برعکس ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جس طرح غیر حیاتی صفات کا سرچشمہ ارسطو وغیرہ کے نزدیک مادّہ ہے اسی طرح حیاتی

صفات بھی دراصل مادّہ ہی کی ایک شان ہیں۔

مادّہ اپنی ابتدائی حالت میں صرف طول وعرض، نرمی وسختی وغیرہ کی صفات سے موصوف تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس میں نت نئے صفات کا اضافہ ہوتا رہا۔ پہلے نشوونما اور بالیدگی کی صفت پیدا ہوئی اور یوں ہی بڑھتے بڑھتے ایک درجہ مادّہ کا وہ بھی آیا کہ اس میں ذہن اور ادراک، شعور، تخیل، ارادہ، تعقل وغیرہ صفات پیدا ہوگئے۔ الغرض یہ سارے صفات براہ راست مادّہ ہی کے ہیں۔ حیات زندگی، روح یہ سب الفاظ بے معنی ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں کچھ نہیں ہے اور جو کچھ بھی ہے صرف مادّہ ہے۔ جمادات سے لے کر انسان تک جن مظاہر وآثار کا ظہور ہو رہا ہے یہ سب مادّہ ہی کی مختلف نیرنگیاں ہیں۔

الغرض فلسفہ کے اس مکتب فکر میں عالم کا سرچشمہ ایک بے حس و بے جان مردہ کو مانا جاتا ہے۔ اس خیال کی بنیاد آج سے تقریباً ڈھائی تین ہزار سال پیشتر حکیم دیمقراطیس نے رکھی ہے اور اس وقت تک یورپ کے جن لوگوں کو مسلک مادّیت پر اصرار ہے وہ دیمقراطیس ہی کے خیالات کی آواز بازگشت ہے۔

بلاشبہ فلسفیانہ مکاتب خیال میں یہی ایک ایسا مسلک ہے جسے مذہب کا صحیح معنوں میں حقیقی حریف ومدمقابل قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اسی میں خدا کو ہٹا کر اس کی جگہ مادّہ کو تخت نشین کرنے کی کوشش (العیاذ باللہ) کی گئی ہے۔ اس گروہ کا یہ اعلان ہے کہ مادّہ اور قوانین مادّہ نے عالم کو پیدائش کے مسئلے سے بے نیاز کر دیا، یعنی اب اس کو کسی خالق کی ضرورت نہیں رہی۔ اسی مسلک کی ایک تعبیر یہ بھی ہے کہ مادّہ ہی مادر کائنات ہے، جو خود اپنے رحم سے نتائج برآمد کرتی رہتی ہے۔

۴ ارتیابیت:

یہ فلسفے کا چوتھا اسکول ہے۔ ارتیاب کے معنی شک کے ہیں۔ اس لفظ کی طرف منسوب کرکے اس مسلک کا نام ''ارتیابیت'' رکھا گیا ہے۔ ان بیچاروں نے فلسفے کی ان ہنگامہ آرائیوں کو دیکھ کر اپنی پناہ گاہ اعتراف جہل واقرار عجز کے سایے میں بنائی

ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو کچھ نہیں معلوم کہ اس عالم محسوس کا اصلی سرچشمہ کیا ہے، مادّہ ہے یا خدا ہے؟ ان کا بیان ہے کہ چوں کہ یہ باتیں ہماری سرحد ادراک سے باہر ہیں، عقل انھیں اپنی گرفت میں نہیں لا سکتی، اس لیے اس پر بحث ہی فضول ہے۔ نظر بریں ہم خدا اور مادّہ دونوں کے اقرار و انکار سے علاحدہ رہتے ہیں۔ ان ہی لوگوں کا نام ارتیابی ہے۔ اگرچہ یہ مسلک بھی قدیم ہے۔ پچھلے دنوں یورپ میں ہیوم، اسپنسر، ہکسلے وغیرہ نے اس مسلک کو فروغ دیا۔

اب تم اندازہ کرو کہ فلسفے کے اس اسکول کا بھی مذہب پر کیا اثر پڑتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ اس مسلک سے مذہب کی تائید نہیں ہوتی، لیکن تردید بھی نہیں ہوتی۔ ہم اس مسلک کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ ثنویت اور تصوریت کی طرح اگر یہ مذہب کا دوست نہیں ہے تو مادّیت کی طرح دشمن بھی نہیں، بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے یہ جان کر کہ غیبی حقایق تک عقل و حواس کے ذریعے سے رسائی نہیں ہو سکتی گویا عملاً مذہبی راہنمائیوں کی ضرورت کو تسلیم کر لیا ہے۔ صاف لفظوں میں اس کا اعلان نہ کریں لیکن بہ قول شخصے ❶:

"چشم ابرو کے اشارے سے اقرار پنہاں ٹپکا پڑتا ہے۔"

ہکسلے کے قلم سے اپنے مجموعۂ مضامین کی چھٹی جلد (جو ہیوم پر ہے) یہ جملہ بے ساختہ نکل گیا:

"اگر مجھ کو خالص مادّیت اور خالص تصوریت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ہی پڑے تو میں تصوریت کو قبول کرنے پر مجبور ہوں گا۔"

بہرحال! اوپر کی تفصیل سے یہ امر بہ خوبی ثابت ہو گیا کہ فلسفہ اور مذہب کی جنگ عوام الناس کے جاہلانہ خیالات کا نتیجہ ہے۔ عموماً اس کے مدعی وہی لوگ ہیں جو فلسفہ اور مذہب دونوں سے ناواقف ہیں۔ ورنہ سچی بات وہی ہے جو بیکن سے منقول ہے کہ

---

❶ یعنی مولانا عبدالباری ندوی۔

''فلسفے کا قلیل اور سطحی علم الحاد کی طرف مائل کر دیتا ہے، لیکن اس کا گہرا علم مذہب سے قریب اور قریب تر کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔''
(مضمون ''دہریت'' مندرجہ مضامین بیکن: صفحہ ۱۴۸ کالنز پاکٹ کلاسکس)

بہر حال ٹھیک جس طرح مذہب اور سائنس کی جنگ ایک گپ اور افسانہ پارینہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی۔ قریب قریب یہی حال فلسفہ اور مذہب کی باہمی آویزش کی داستان کا بھی ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا تھا کہ سائنس کے حدود میں نہ مذہب قدم رکھتا ہے اور نہ مذہب کے حدود میں سائنس قدم رکھ سکتی ہے، ایک کا کام دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

مذہب سے الگ ہو کر صرف ''سائنس'' کے بھروسے پر جینے والوں کا انجام کیا ہوگا یا کیا ہو سکتا ہے؟ اب تو سب کے سامنے آچکا ہے، لیکن اس سے پہلے بھی چونکا نے والوں نے دنیا کو چونکایا تھا۔ ڈاکٹر الفریڈ ایون نے اپنی مشہور تقریر میں ایک دفعہ جتلایا تھا جو سابق ''جنگ عظیم'' کے ہول ناک نتائج کے مشاہدے کے بعد انھوں نے کی تھی:

''قوائے فطرت سے کام لے کر ہم نے انسان کے لیے نئی نئی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں، لیکن خود انسان اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ میں اپنی جوانی کے زمانے میں خیال کرتا تھا کہ ایجادات اور سائنسی انکشافات کی یہ ترقیاں، قوانین فطرت کی روز افزوں طلسم کشائیاں، علم و عمل کی کارفرمائیاں انسان کی سرشت کو تبدیل کر کے رہیں گی اور میرا خیال تھا کہ انجینئری کی تعلیم واشاعت سے سخت دلوں میں نرمی آجائے گی، جذبات کی بہیمیت مدہم پڑ جائے گی، لیکن جنگ نے میری آنکھیں کھول دیں اور میں نے دیکھا کہ وہی علوم وفنون اور انجینئری کی ساری حکمتیں اور صناعیاں جن سے انسان کی خدمت کی جا سکتی تھی الٹی اس کے حق میں دشمن بن گئیں اور اس کی وحشت وسنگ دلی شقاوت و بہیمیت اور درندگی میں ان آلات سے بدرجہا اضافہ

ہو گیا اور تخریب و بربادی، قتل و ہلاکت کی قوتوں کے عظیم الشان انجن ہم جانوروں کے ہاتھ آ گئے۔"

اسی کی تعبیر لسان العصر اکبر مرحوم نے اپنے اس مشہور شعر میں فرمائی تھی ؎

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی
موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

خون سمندر میں آج آدم کی اولاد جس بے کسی کے ساتھ ہاتھ پاؤں مار رہی ہے کیا اس تماشے کے بعد بھی مرحوم اکبر کے قہقہے کو صرف قہقہہ کہہ کر کوئی ٹال سکتا ہے؟

هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ O

اور نتیجہ تو عملی نقطۂ نظر سے لادینی سائنس نے بنی آدم کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ رہا فکری و علمی نقطۂ نظر سے علم کی جدید منشات نے ہمیں کس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے؟ ایک شہادت اس سلسلے کی بھی سن لیجیے۔ ڈاکٹر ڈبلیو ہیرنگ اپنے مقالہ "زمانہ اور اس کے اسرار" میں لکھتے ہیں:

"طبیعاتی (حکیم) اب بھی ناپ تول میں لگا ہوا ہے اور بڑے جوش و خروش اور تن دہی کے ساتھ، لیکن اب اسے یہ نہیں معلوم ہو رہا ہے کہ آخر وہ کس چیز کو ناپ رہا ہے یا یہ کہ جسے اپنے خیال میں ناپ رہا ہے اسے وہ واقعی ناپ رہا ہے؟ اس کا فلسفیانہ سکون خاطر رخصت ہو چکا ہے۔ اس کی طبیعات مابعد الطبعیات کی دھندلی فضا میں گم سی ہوتی جا رہی ہے۔ خاص کر مسئلہ اضافیت اور مسئلہ زمان پر اس کے اثرات کے انکشاف کے بعد طبیعاتیوں کے ظلیات و مثنیات عالم کے مستقبل کی بابت اس کی بربادی اس کی فنا، اس کے احیائے ثانی سے متعلق (مادّہ اور زبان کے مسایل کو شامل کرتے ہوئے) ہم پر سیلاب کی طرح ابل پڑے ہیں۔ ان کا نام ریاضیاتی شاعری خوب پڑ گیا ہے۔" (صدق یکم دسمبر ۱۹۴۵ء)

بہر حال سائنس کی بحث بھی گزر چکی اور فلسفے کے متعلق بھی آپ کو بہ تفصیل یہ

معلوم ہو چکا کہ اس علم کے دو بڑے اور مشہور اسکول ثنویت اور تصوریت نہ صرف خدا کے قایل بلکہ اس کے زبردست وکیل ہیں اور زیادہ تر فلسفیوں کا رجحان ان ہی دونوں خیالات کی طرف ہے۔ اسی طرح ارتیابیت والے اگر موافق نہیں تو انھیں مذہب کی مخالفت سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ البتہ فلسفیوں کی سب سے چھوٹی جماعت یعنی مادّیت والے ضرور صحیح معنوں میں مذہب کے مخالف کہے جاسکتے ہیں۔ اب ذرا تفصیل کے ساتھ ہمیں اس پر نظر ڈالنی چاہیے کہ اس مخالفت کو بھی کس حد تک اہمیت دی جاسکتی ہے۔

مادّیت اور مادّہ:

بتایا جاچکا ہے کہ مادّیت والے کہتے ہیں کہ ہر قسم کے صفات حیاتی ہوں یا غیر حیاتی دونوں کا سرچشمہ مادّہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مادّہ جس پر کاینات کی ساری عمارت اٹھائی گئی ہے خود کیا ہے؟ آیا وہ کوئی چیز ہے بھی یا نہیں؟

علم اور وہم میں فرق:

یہ ظاہر ہے کہ بغیر جانے ہوئے ہم کسی چیز کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ نہیں کرسکتے، جان کر کسی چیز کو ماننا یہ تو علم ہے اور بے جانے ہوئے کسی حقیقت کا اعتراف کرلینا اسی کا نام وہم ہے۔

انسان کے علمی ذرایع:

اور کھلی ہوئی بات ہے کہ ہمارے علم اور جاننے کے ذرایع ہمارے حواس ہیں۔ ایسا شخص جو ہر قسم کے حواس سے محروم ہو یقیناً وہ ہر قسم کے علم سے بھی محروم ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ اس کو کسی بات کا علم اگر ہوسکتا ہے تو یہی ہوسکتا ہے کہ ''میں ہوں۔''

خوب سوچیے! اپنی ذات کے اس حضوری شعور کے سوا اور بھی کسی علم کو وہ اپنے اندر پاسکتا ہے؟

عقل کا حواس سے تعلق:

یہ خیال کرنا کہ جن چیزوں کو ہم حواس سے نہیں دریافت کر سکتے ان کا علم عقل کے ذریعے سے حاصل کیا جا سکتا ہے، ایک غیر فلسفیانہ خیال ہے۔

عقل حواس کے آگے آگے جاتی ہے یا پیچھے پیچھے چلتی ہے؟ اس پر غور کرنا چاہیے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص مادرزاد بہرا ہے، کیا اس کی عقل آواز کے زیر و بم، تال اور سُر کے متعلق کچھ بھی سوچ سکتی ہے؟ حالاں کہ بہرے کے پاس عقل ہوتی ہے اور کامل عقل ہوتی ہے، لیکن قوت سامعہ جس کے ذریعے سے آواز کا علم حاصل ہوتا ہے غریب بہرا اس سے محروم ہے۔ اس لیے اس کی عقل بھی آواز کے متعلق کچھ نہیں سوچ سکتی۔

پس اصل یہ ہے کہ حواس جب کسی چیز کا علم وہم میں لاتے ہیں تو ''اس کے بعد عقل ان کی ترتیب و تقسیم کر سکتی ہے۔ اس سے مناسب نتائج نکال سکتی ہے، لیکن جہاں سرے سے حواس کی رسائی ہی نہ ہو ظاہر ہے کہ عقل کی رسائی وہاں تک ناممکن ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ ''عقل حواس کے تابع ہے نہ کہ حواس کی حکمراں۔'' ڈاکٹر اقبال مرحوم نے شیخ کے اسی خیال کا ترجمہ اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

فروغ دانش ما از قیاس است
قیاس ما زتقدیر حواس است

بہر حال! یہ مسلم ہے کہ ہم اپنا حقیقی معلوم اسی شے کو کہہ سکتے ہیں جس کا احساس ہمارے حواس کر سکیں اور ظاہر ہے کہ ہمارے حواس میں سے ہر حاسے کا تعلق خاص خاص معلومات ہی تک محدود ہے۔ مثلاً شامہ کا تعلق بو سے ہے، قوت سامعہ کا تعلق آواز سے ہے، قوت لامسہ کا تعلق سختی، نرمی، گرمی، سردی وغیرہ سے ہے، قوت باصرہ کا تعلق رنگ، روشنی، مقدار، شکل اور حرکت سے ہے، علیٰ ہذا قوۃ ذائقہ کا تعلق تلخی، شیرینی وغیرہ سے ہے۔

مادّہ کا محسوس ہونا ناممکن ہے:

اب اندازہ کرو کہ جن چیزوں کا احساس ہمارے حواس کو ہو رہا ہے یا جنھیں وہ محسوس کر رہے ہیں، وہ کیا ہیں؟ کیا رنگ مادّہ ہے یا روشنی مادّہ ہے یا مقدار و شکل مادّہ ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ساری چیزیں تو صفات ہیں، پھر وہ چیز جس پر مادّیت کی بنیاد قایم ہے یعنی خود مادّہ، اس کو ان مادّہ پرستوں نے کس راہ سے جانا؟ صرف یہی نہیں، اب ذرا آگے غور کرو کہ خود یہ صفات کیا ہیں؟

کیا یہ محض ہمارے احساسات نہیں؟ اگر حواس نہ ہوں تو کیا پھر بھی ان صفات کے متعلق کوئی حکم کر سکتا ہے کہ وہ موجود ہیں؟ پس اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ صفات کا اثر ہمارے حواس پر نہیں پڑتا بلکہ حواس ہی سے یہ اثرات پیدا ہو رہے ہیں تو اس کو کون غلط ثابت کر سکتا ہے، برکلے نے بہ بانگِ دہل یورپ کے مادّیین کو چیلنج دیا کہ اگر کوئی ہمارے اس دعوے کو غلط ثابت کر سکتا ہے تو میدان میں آئے۔ آج اس دعوے کو دو سو برس کے قریب گزر چکے ہیں، مگر واقعہ ہے کہ مادّیت کے کسی اسکول سے اس کا کوئی معقول جواب نہیں وصول ہوا۔ صرف جرمن کے مشہور فاضل کانٹ نے لکھا:

کانٹ کا مذہب:

>"اس میں تو شک نہیں کہ ہم براہ راست جو کچھ جانتے ہیں وہ صرف مظاہر یا ہمارے ذہن کے تصورات (فنامنا Phenomenon) ہیں۔ باقی ذات یعنی (نومنا Noumenon) یا اشیا کا کما ہی علم تو انسانی عقل کے لیے اس کا حصول قطعاً محال ہے۔ ان کو کوئی شخص نہ جان سکتا ہے نہ کسی نے جانا ہے، مگر ساتھ ہی ہم ان کے خارجی اور واقعی وجود کے قبول کرنے پر بھی بے بس ہیں۔ جو اگرچہ بالذات مجہول ہیں، لیکن ہمارے معلومات حسی اور کیفیات ذہنی کی وہی علت ہیں۔ یہ دعویٰ کہ ہمارے معلومات کا کوئی مثنیٰ یا شبیہ باہر میں ہوتا ہے، غلط ہے۔ درد ہمارا احساس ہے اور وہ ہم میں ہے۔ کانٹے میں اس کا مثنیٰ یا شبیہ موجود نہیں ہے، وہ چیز جسے ہم کانٹے کے لفظ سے

تعبیر کرتے ہیں اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے؟ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ، وہی ہمارے درد کا سبب ہے، اس لیے میں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے ذہنی محسوسات کا کوئی نہ کوئی بیرونی سبب ہم سے باہر ضرور موجود ہے، جس کی تعبیر زیادہ سے زیادہ ہم ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ وہ انجانی کوئی چیز ہے۔ ٹھیک ہماری مثال اس پیدائشی اندھے کی ہے جو اپنی قوت لامسہ سے گرمی کو محسوس کر سکتا ہے، جو آفتاب کا اثر یا (معلول) ہے، لیکن یہ نہیں جان سکتا ہے اس کی علت یعنی خود (آفتاب) کی شکل وصورت کیا ہے۔''

کانٹ کی اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اثرات اور احساسات کا ہم سے باہر کوئی نمونہ یا شبیہ یا مثنیٰ تو موجود نہیں، لیکن کوئی چیز ایسی ضرور ہے جو ہم میں رنگ وبو، آواز وغیرہ کے احساسات کو پیدا کرتی ہے۔

الغرض اس کے نزدیک مادّہ کی حقیقت کل اتنی ہے کہ وہ ہمارے احساسات کی علت ہے۔ باقی وہ کیا ہے؟ زندہ ہے یا مردہ یا کچھ اور؟ اس سے وہ بالکل علاحدہ رہنا چاہتا ہے۔ ہکسلے اس کی تشریح ان لفظوں میں کرتا ہے:

''آخر کار ہم اس ہیبت ناک مادّہ کی نسبت اس سے زیادہ کیا جانتے ہیں کہ وہ ہماری شعوری کیفیات کی ایک انجانی اور فرضی علت کا نام ہے۔''

وہی اپنے مقالہ ہنل ازم یا آئیڈیل ازم میں لکھتا ہے:

''آج کل سائنس اس سے زیادہ کسی بات کو نفرت کا نگاہ سے نہیں دیکھتی کہ ''میٹریل ازم'' مادّیت کا انتساب اس کی طرف ہو۔ اس لیے کہ بہر حال میٹریل ازم کی وقعت ایک فلسفیانہ ادعا (ڈاگما) سے زیادہ نہیں۔''

کیا مادّہ ہمارے احساسات کی علت ہے:

بہ قول کانٹ اپنی شعوری کیفیات کی علت کو خارج میں ماننے پر کیا ہم واقعی بالکل بے بس ہیں؟ کانٹ کے خیال کی بنیاد اس پر ہے کہ ہمارے حواس میں کوئی

شعوری کیفیت یا احساسی اثر اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کسی دوسری چیز سے متاثر نہ ہو۔ مثلاً ٹھنڈک کا اثر منہ اور زبان کو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ برف زبان پر نہ رکھی جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے مختلف احساسات کے لیے مختلف اسباب کو فرض کریں، مگر غور کرو کہ اس میں بھی ایک مغالطہ ہے، بلاشبہ ٹھنڈک کا احساس بغیر برف کے نہیں ہو سکتا، لیکن خود برف کیا ہے؟ کانٹ اس کو بھول گیا۔ جس کو ہم برف کہتے ہیں وہ دراصل ایک سفید سخت دبیز سی چیز ہے اور یہ سارے صفات قوت ذائقہ کے نہیں بلکہ قوت لامسہ اور باصرہ کے احساسات ہیں۔ پس کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ایک حواس کے احساسات جب دوسرے حواس کا سبب بن جاتے ہیں تو اس وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جس طرح پچھلا احساس صرف احساس ہی ہے اسی طرح پہلا بھی ہمارے دوسرے حواس ہی کا اثر تھا۔

خلاصہ یہ کہ جب ہمارا علم صرف ہمارے احساسات تک محدود ہے تو کانٹ کا یہ کہنا کہ ان احساسات کا سبب احساسات کے سوا ہے گویا یہ ماننا ہے کہ ہم احساس سے باہر بھی قدم رکھ سکتے ہیں اور ان کو جان سکتے ہیں۔ حالاں کہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس دایرے سے باہر پاوں نکالنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔

بہر حال کانٹ نے بہت زور لگا کر علت کی آڑ میں مادّہ کو دم توڑتا ہوا چھوڑا تھا، لیکن حقیقت نے ثابت کر دیا کہ یہ آڑ بھی بے کار ہے اور وہ چیز جس کو مادّہ کے نام سے پکارا جاتا ہے اس کا وجود مادّہ پرستوں کے دماغوں میں ہو تو ہو لیکن واقع میں اس کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں۔

کیا مادّہ محل اور موصوف ہے؟

اثبات مادّہ میں بعضوں کا یہ کہنا کہ صفات بغیر موصوف اور محل کے کس طرح پائے جا سکتے ہیں؟ آخر سفیدی بغیر کپڑے کے کیسے متصور ہو سکتی ہے؟ یہ بھی صرف مغالطہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صفات کے لیے موصوف کا ہونا کیا ضرور ہے؟ نارنگی میں کچھ صفات ہیں مثلاً سرخی، زردی رنگ، شیرینی، مزہ، گول شکل وغیرہ، اب اگر ان

تمام صفات کو ایک ایک کر کے نارنگی سے ہم نکال لیں تو پھر اس کے اندر کیا چیز رہ جاتی ہے جس کا نام مادّہ رکھا جائے گا؟ علاوہ اس کے خود یہ صفات جب صرف ہمارے احساسات ہیں تو ذہن کے سوا ان کے لیے کسی اور محل کے تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

کیا مادّہ حقیقت ہے؟:

اسی طرح بعضوں کا خیال ہے کہ صفات تو بدلتے رہتے ہیں لیکن ہر شے کی ایک حقیقت ہوتی ہے، جو تمام تغیرات میں بہ طور قدرِ مشترک کے قایم رہتی ہے اور وہی مادّہ ہے۔ یہ بھی صرف ایک سطحی مغالطہ ہے۔ واقعات سے اس کو بھی کوئی سروکار نہیں۔ یہی تو ہمارا مطالبہ ہے کہ صفات کے علاحدہ کر لینے کے بعد بتاؤ کہ کیا چیز رہ جاتی ہے جس کا نام تم نے مادّہ رکھا ہے؟ جو چیز بتائی جاسکتی ہے وہ صفت ہوگی اور جو صفت نہیں ہے اس کو نہ بتانے والا جان سکتا ہے اور نہ وہ جان سکتا ہے جس کو بتایا جائے گا۔ کیوں کہ حواس کا علم صرف صفات تک محدود ہے اور حواس کے سوا ہمارے پاس صحیح علم کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔

بہرحال مادّہ جس کی تعریف ارسطو کے نزدیک یہ تھی کہ وہ نہ ایک ہے نہ چند، واحد ہے نہ کثیر، ثقیل ہے نہ خفیف، حار ہے نہ بارد، یعنی اس میں کوئی ایجابی (ثبوتی) صفت نہیں پائی جاتی۔ گویا وہ ''کچھ نہیں'' (لاشے) کے مترادف ہے، یا جیسا کہ دیمقراطیس کہتا ہے کہ وہ سالمات اور چھوٹے ذرات کا مجموعہ ہے، یا جیسا کہ اب حال میں کہا جاتا ہے کہ وہ برق پاروں سے مرکب ہے اور ایثر (ایتھر) کے سمندروں میں تیرتا پھرتا ہے، یہ سب ایک ایسے خواب کی تعبیر ہے جسے کسی نے نہیں دیکھا۔ کیوں کہ تفصیل سے بتادیا گیا کہ علمی ذرائع سے ہم بجز احساسات کے کچھ جان ہی نہیں سکتے اور جو چیز ان احساسات کے سوا عقل کے زور سے ثابت کی جائے گی خواہ اس کی تعبیر کسی لفظ سے بھی کی جائے لفظ کے سوا اس کے نیچے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ پس وہ لفظ جس کے بل

ہوتے پر سطحیوں نے یہ غل مچا رکھا تھا کہ اجرام سماوی سے لے کر سمندروں کی تہہ تک جو کچھ ہے سب ازلی اور عدیم الفنا مادّہ اور انرجی (قوت) کی نیرنگیوں کا تماشہ ہے، ارضی، سماوی، عضوی، غیر عضوی، ساری کائنات کا ایک ایک ذرہ اور تمام حوادث بلا استثنا مادّہ ہی کے ناقابل تقسیم ذرات کے باہمی اجتماع کے تعامل سے پیدا ہوئے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ جس اینٹ پر یہ ساری عمارت کھڑی کی گئی تھی وہ مادّہ تھا جس کو تحقیق نے ثابت کر دیا کہ بجز ایک خود تراشیدہ وہم کے اس کی اور کوئی وقعت نہیں ہے۔

اب مادیین کے پاس کیا رکھا ہے جس پر وہ اپنے قدم جما سکتے ہیں؟

پر وہی گر پڑا کبوتر کا
جس میں نامہ بندھا تھا دلبر کا

ہمارے مخدوم و محترم مولانا عبدالباری ندوی نے اپنے رسالہ "مذہب و عقلیات" میں اس موقعہ پر غالب کے اس مشہور شعر کو خوب چسپاں کیا ہے:

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

بہر حال سائنس اور فلسفہ کے حدود کو متعین کرتے ہوئے یکایک ہم اس قطعی نتیجے تک خود بہ خود پہنچ جاتے ہیں کہ یہ سوالات یعنی "ہم اور ہمارے احساسات (عالم) کی ابتدا کیا ہے۔" خود ہمارا، ہماری قوم، ہماری جنس، ہماری گذشتہ اور آیندہ نسلوں کا اور اس عالم کا انجام کیا ہے؟ یہاں ہم کیوں ہیں؟ ہماری فطری آرزو مثلاً بقاے دوام کی خواہش، غیر محدود ہونے کی تمنا، زندگی کی موجودہ کش مکش سے نجات پانے کی کوشش وغیرہ کا لحاظ کرتے ہوئے کس دستور العمل کی پابندی ہمیں کرنی چاہیے؟

ثابت ہو چکا کہ ان مذہبی سوالات کو علم کے معمولی ذرائع (عقل وحواس) کی رہنمائی میں ہم کسی طرح حل نہیں کر سکتے، اور جو شخص بھی ان کو عقل وحواس کے ذریعے حل کرنا چاہے گا وہ یقیناً بغیر جانے ہوئے کسی چیز کو مان لے گا یعنی وہم کا شکار ہو جائے گا۔

کیا مذہبی سوالات فطرت انسانی سے نکل سکتے ہیں؟:

اور جس طرح یہ ناممکن ہے، اسی طرح یہ بھی قطعاً محال ہے کہ ان سوالات کو فطرت انسانی سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے۔ انسان جب تک حیوان نہیں بلکہ انسان ہے، اس کی ذہنی وسعت اور دماغی بلندی باقی ہے، وہ مجبور ہے کہ ان سوالات کو پیدا کرے، ان کے حل کی راہیں ڈھونڈھے، فطرت کے اس زور ہی کا اندازہ کر کے مذہبی سوالات کے متعلق ایک فرنچ فلسفی گسکر نے لکھا تھا:

> ''مذہب ابدی چیز ہے، کیوں کہ مذہب جس سوال کا جواب ہے وہ کسی زمانہ میں کبھی کہیں معدوم نہیں ہو سکتا۔'' (الکلام)

اسی خیال کا اظہار رینان نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''یہ ممکن ہے کہ وہ اشیا جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محبوب ہیں مٹ جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہو جائے یا اس کی قوت میں زوال آجائے۔''

رینان کا خیال ہے کہ انسان کی دماغی قوت کے لیے یہ ناممکن ہے کہ گدھوں اور گھوڑوں کی طرح وہ اپنے ماضی اور مستقبل کے متعلق سوچنا چھوڑ دے۔ اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

> ''مذہب ہمیشہ علانیہ اس کا ثبوت دے گا کہ وہ خیالات قطعاً غلط ہیں جن میں چاہا جاتا ہے کہ انسان کی دماغی قوت اسی پست خاکی زندگی تک محدود ہو جائے۔''

پروفیسر لیٹر نے ان سوالات کی جڑوں کو انسانی فطرت کی جن گہرائیوں میں پایا اس کا اندازہ کرتے ہوئے اس فیصلے پر اپنے آپ کو مجبور پایا، جس کا خلاصہ یہ ہے:

> ''مذہب کو جب کبھی بھی ختم کرنے کی کوشش کی گئی اس نے پھر نئے سرے سے نئے برگ و بار پیدا کر لیے ہیں، اسی بنا پر مذہب ابدی چیز ہے جو کبھی زائل نہیں ہو سکتی۔''

لیٹر نے اس کے بعد بالکل صحیح لکھا ہے کہ جب انسان کی ذہنی طاقت بجائے سمٹنے کے وسیع ہو رہی ہے تو یقیناً مذہبی سوالات کی تڑپ اور بے چینی بھی اسی نسبت سے بڑھتی چلی جائے گی۔ اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''مذہب کا سرچشمہ روز بہ روز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے، فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور گہرا کر رہے ہیں۔ انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قایم ہے اور اسی سے وہ قوت پائے گی۔'' (الکلام)

مذہبی سوالات کے حل کی فطری راہ:

خلاصہ یہ ہے کہ مذہبی سوالات نہ فطرت انسانی سے نکل سکتے ہیں نہ علم کے عام اور معمولی ذرایع یعنی عقل وحواس سے ان کو ہم حل کر سکتے ہیں۔ فلسفہ اور مذہب میں یہی بنیادی فرق ہے کہ اوّل الذکر ان سوالات کو عقل وحواس کے زور سے حل کرنا چاہتا ہے اور مذہب بجائے ان معمولی ذرایع کے ایک جدید ذریعے کی ضرورت ظاہر کرتا ہے اور ہم نے دیکھ لیا کہ مذہبی سوالات کے حل کے لیے ہم علم کے ایک نئے ذریعے کے قطعاً محتاج ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ہم میں پیاس ہو لیکن اس کے بجھانے کے لیے پانی کا سامان نہ کیا گیا ہو۔ مذہبی سوالات کی بے چینی جب انسانی فطرت میں پیدا کی گئی ہے تو ان کے حل کرنے اور جاننے کی بھی فطری راہ ہونی چاہیے اور وہ ہمیشہ سے ہے۔ علم کے اسی جدید ذریعے کا نام مذہبی زبان میں ''وحی'' اور ''نبوت'' ہے۔ جب سے دنیا قایم ہے انسانی فطرت نے مذہبی سوالات کے حل کے لیے ہمیشہ اسی راہ کو اختیار کیا۔ گو وقتاً فوقتاً مختلف قرون وممالک میں فلسفیوں کا ایک گروہ بھی پیدا ہوتا رہا جس نے ان جوابات کے لیے حواس وعقل کی قوتوں کو استعمال کرنا چاہا لیکن اکثریت نے اس کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ اس کے مقابلے میں تاریخ اٹھا کر دیکھو جب کبھی وحی اور نبوت کی روشنی میں یہ سوالات لائے گئے انسانی گھرانوں میں ہل چل مچ گئی، بنی آدم کی بستیوں میں تہلکہ برپا ہو گیا۔ اس طریقے کے فطری اور طبعی ہونے کی اس سے زیادہ روشن شہادت اور کیا مل سکتی ہے۔ ہم تمام دنیا کے علوم وفنون کا جایزہ لینے

کے بعد آج اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہبی سوالات کی گرہ کشائی علم کے عام اور معمولی ذرائع (عقل و حواس) کے ناخن سے ناممکن ہے۔ فطرت کا زور دیکھو کہ ان طویل بحثوں کے بغیر انسانی فطرت نے ہمیشہ یہی سمجھا اور اسی پر عمل کیا کہ ؎

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازاں دیوانہ کردم خویش را

فلسفیوں نے فطری صلاحیت کو بگاڑ کر قدرتی قوانین کے توڑنے کی کوشش کی۔ انھوں نے چاہا کہ نبوت اور وحی کے توسط کے بغیر ان سوالات کے جوابات حاصل کر کے بنی آدم کو مطمئن کر دیا جائے، لیکن تحقیق نے ثابت کر دیا کہ بجز خود تراشیدہ اوہام اور فرضی وسوسوں کے ان کے جیب و دامن میں کچھ نہ تھا، نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اب تک جو کچھ بھی کہا ہے یا اس وقت کہہ رہے ہیں یا آیندہ کہیں گے بغیر جانے ہوئے کہیں گے اور اسی کا نام وہم ہے۔ وہ واقعات نہیں ہوں گے بلکہ دماغی اختراعات اور ذہنی وساوس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ مذہب نے ان چیزوں کا نام اوہام رکھا ہے، جس سے پرہیز کرنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ شیراز کے عارف نے اپنے مشہور شعر میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معمارا

وحی سے منقطع ہو کر جو خدا کو مانتا ہے وہ بھی وہم پرست ہے:

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ جن فلسفیوں نے انبیا کے لائے ہوئے جوابات کے خلاف رائے قایم کی ہے وہی وہم پرست ہیں، بلکہ مذہبی سوالات کے حل کی فطری راہ وحی و نبوت سے قطع تعلق کر لینے کے بعد اگر اتفاقاً ان میں سے کسی نے ایسا جواب پیش کیا ہو جو پیغمبروں کی تعلیم کے موافق ہو وہ بھی اگر غور کیا جائے تو ایک معمولی وہم پرست کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا مثلاً فرض کیجیے کہ عالم کے نقطۂ آغاز کے متعلق جس نے یہ رائے پیش کی کہ ''مظاہر کاینات اور محسوس کے پیچھے صرف مادہ ہی مادہ کا وجود

ہے۔ معلوم ہو چکا کہ ایسا شخص ایک ایسی چیز کا مدعی ہے جسے نہ حواس نے محسوس کیا ہے نہ اس کی عقل وہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے اس کا وہم پرست ہونا تو ظاہر ہی ہے، لیکن جو شخص صرف عقل وحواس کے بھروسے پر وحی ونبوت سے بے تعلق ہو کر یہ کہتا ہے کہ عالم کی ابتدا خدائے زندہ سے ہوئی تو کیا اس کے وہم پرستی میں کچھ شبہ ہے؟ کیا یہ بھی از روے عقل وہم پرست نہیں؟ بلاشبہ یہ ایک ایسی حقیقت کے جاننے کا دعویٰ کر رہا ہے جس کے علم کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ٹھیک اس کی مثال اس اندھے کی سی ہے جس کے سامنے چند رنگین کپڑے پیش کیے گئے اور پوچھا گیا کہ بتاؤ کس کپڑے کا کیا رنگ ہے؟ اندھے نے بجائے آنکھ کے ہاتھ سے ٹٹول کر اس کا جواب دینا چاہا۔ اتفاقاً جو کپڑا زرد تھا اس کے متعلق اس نے یہ کہہ دیا وہ زرد ہے۔ یہ سچ ہے کہ بلاشبہ وہ کپڑا زرد ہے لیکن اسی کے ساتھ اندھے کا یہ علم اور اس کی رائے بھی وہم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی کہ وہ ایک ایسی چیز کے جاننے کا مدعی ہے جس کے جاننے کا صحیح ذریعہ ''قوت بینائی'' اس کے پاس موجود نہیں ہے، اسی طرح انبیا سے بغاوت کرنے کے بعد جو عالم کو خدائے حیّ وقیوم کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار دینا چاہتے ہیں غور کرنا چاہیے کہ ان کے اس فیصلے کی بنیاد کیا ہے؟ ''عالم خدائے زندہ وتوانا کی مخلوق ہے۔'' بجائے خود یہ ایک واقعہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وحی ونبوت کے واسطے کو چھوڑ کر جو اس واقعہ کے جاننے کا مدعی ہے، کیا وہ ایک ایسی چیز کے جاننے کا مدعی نہیں ہے جس کے جاننے کا عقلی طور پر اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں؟ آخر اس اندھے کو تم کیا کہو گے جس نے آفتاب کو نہ تو خود دیکھا ہے اور نہ دیکھنے والوں سے اس کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اعلان کرتا پھرتا ہے کہ میں بھی آفتاب کو جانتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ آفتاب کا وجود یقینی ہے لیکن بایں ہمہ آفتاب کے علم کا دعویٰ اس اندھے کا علم نہیں بلکہ صرف وہم ہے❶۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو پیغمبروں کی اطاعت سے گھبراتے ہیں، لیکن اسی

---

❶ جو چیزیں حواس کی گرفت میں نہیں آسکتیں عقل کی رسائی بھی ان چیزوں تک نہیں ہوسکتی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جو محسوس نہیں ہیں وہ معقول بھی نہیں ہوسکتیں۔ بہرحال یہ مسئلہ شاید بجتوں پر ➤

کے ساتھ خدا کو بھی مانتے ہیں، اور اپنی طرف سے اپنی زندگی پر کچھ قوانین عاید کر کے باور کیے بیٹھے ہیں کہ یہی خدا کی مرضی بھی ہے۔ حالاں کہ آپ نے دیکھ لیا کہ وہ خدا کے نہیں بلکہ خود اپنے دماغ کی تراشی ہوئی باتوں کے تابع ہیں، وہ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں، یعنی خدا نے جو بات ان سے نہیں کہی ہے، اس کو وہ خدا کی مرضی، خدا کی بات قرار دینے کی جسارت کر رہے ہیں۔ چوں کہ خدا کی مرضی سے مطلع ہونے کی جو فطری راہ ہے اس سے انھوں نے بغاوت کی ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اپنے خود تراشیدہ وساوس و اوہام کو خدا کی بات، خدا کی مرضی ٹھیرا رہے ہیں۔ اس مسئلے کی تفصیل کتاب کے آخری باب میں آپ کو زیادہ بسط و وضاحت کے ساتھ ان شاء اللہ ملے گی۔

مذہب اور فلسفہ میں فرق:

بہر حال محسوسات کے پیچھے کیا تھا اور کیا ہے یا کیا ہوگا؟ یہ اور اسی قسم کے تمام مذہبی سوالات فطری ہیں اور ان سوالات کو علم کے کسی جدید ذریعے کے بغیر حاصل کرنا قدرتی قوانین کے توڑنے کی کوشش ہے۔ پس مذہب وہی ہے جس میں ان سوالات کو علم کے جدید ذریعہ (کشف و الہام اور وحی و نبوت) سے حل کیا گیا ہو، بلکہ مذہب مذہب بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کے معلومات کی بنیاد بجائے عقل وحواس کے الہام و وحی اور خدا کے غیر محدود علم پر نہ رکھی جائے اگر دنیا میں کوئی ایسا مذہب ہے تو وہ

◄ گراں گزرے، لیکن تحقیق کا اقتضا بھی یہی ہے اور حکمائے اسلام میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، مولانا رومؒ جیسے اکابر اسی نظریے کے شارح ہیں۔ شیخ اکبرؒ کی جو سوانح عمری میرے زیر ترتیب ہے، ان شاء اللہ نظریۂ علم کے باب میں اس پر مفصل بحث کی جائے گی۔ ایک مختصر سا مضمون اورینٹل کانفرنس میں خاک سار نے اسی موضوع پر پڑھا بھی تھا۔ معارف اعظم گڈھ دار المصنفین میں یہ مضمون شایع ہو چکا ہے۔

شیخ اکبرؒ کا اسی نظریے کی بنیاد پر مشہور قول ہے۔ "**فمن طلب اللّٰہ یعقلہ من طریق فکرہ و نظرہ فھو تلنہ**" (فتوحات) یعنی جو خدا کو فکر و نظر کی راہ سے محض عقلی طریق سے طلب کرتا ہے، یہ تلۂ یعنی سراسیمہ و گم راہ آدمی ہے

مذہب نہیں فلسفہ ہے، وہم ہے، وسوسہ ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ اس جدید حاسہ کی کیا نوعیت ہے اور اس کے ذریعے سے غیبی معلومات کیوں کر حاصل کیے جاتے ہیں؟ یہ الگ مسئلہ ہے، جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا کی قوموں اور امتوں میں شاید ہی کوئی قوم یا کوئی امت ایسی پائی جاتی ہو جو علم کی اس نئی راہ کی قایل نہ ہو، اسی لیے ہمیں جو کچھ بھی اس باب میں کہنا ہے ان ہی چند استثنائی افراد کے لیے کہنا ہے جو سرے سے کسی نبی یا صاحب وحی کے تحت زندگی گزارنے سے منکر ہوں (شاید اس مسئلے پر مجھے ایک مستقل کتاب بھی لکھنی پڑے)۔

یہاں تو مختصراً صرف اتنا اس سلسلے میں عرض کرنا ہے کہ انسانوں کے بعض افراد میں ایک جدید قوت پیدا ہوتی ہے اور اس قوت کے ذریعے سے ان کی رسائی کائنات کے ابتدائی سرچشمے تک ہو جاتی ہے، جس کے بعد وہ ان تمام امور کو کما حقہ جان لیتے ہیں جن کو ہم براہ راست نہیں جان سکتے۔ ان لوگوں کی آنکھ بھی خدا ہوتا ہے اور کان بھی خدا ہوتا ہے ❶، یعنی وہ خدا ہی سے جانتے ہیں، خدا ہی سے سنتے ہیں ❷۔ ہم عوام

---

❶ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا ہی انھیں وہ دکھاتا ہے جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے اور وہ سناتا ہے جو دوسرے نہیں سُن سکتے۔

❷ ہم اپنے خیالات دوسروں تک کس طرح منتقل کرتے ہیں؟ اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے وجود کا وہ غیر محسوس حصہ یا شعوری نقطہ جن پر ہماری خودی اور انانیت کی بنیاد قایم ہے اسی سے خیالات کی موجیں اٹھتی ہیں، جو پہلے دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔ دماغ زبان کو حرکت میں لاتا ہے اور یوں زبان ہمارے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچاتی ہے۔ گفتگو اور بیان کا یہ کاروبار رات دن جاری ہے، ہر شخص کو اس کا ذاتی تجربہ ہے، لیکن یہ سوال کہ دماغ تک خیالات کس طرح پہنچتے ہیں اور دماغ سے زبان تک وہ کیسے پہنچتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب آسان نہیں ہے۔ پھر اگر اس عالم کبیر کا، جو "انا مطلق" ہے اگر جبریلی حقیقت کو متاثر کرتا ہے، جبریلی حقیقت "الرسول" (جو گویا خدا کی زبان ہے) کو متاثر کرتی ہے تو اس میں لوگوں کو حیرت کیوں ہوتی ہے۔"!

الناس کی حالت ان کے سامنے اس اندھے کی سی ہوتی ہے جو آفتاب کو خود نہیں دیکھ سکتا لیکن کسی دیکھنے والے کے ذریعے سے سن کر مانتا ہے۔ اس جدید حاسہ والے کامل ترین نفوس کے کامل ترین افراد کا نام مذہبی زبان میں نبی، رسول اور پیغمبر ہے۔ پیغمبر ان سوالات کے جوابات کو براہ راست جانتے ہیں اور ہم ان سے سن کر ایمان لاتے ہیں۔

ماننا اور جاننا:

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ مذہبی حقایق اور غیبی امور جن کے جاننے کے لیے انسانی فطرت بے چین ہے اور رہے گی، ان کے براہ راست جاننے کی تو عام انسانوں میں صلاحیت نہیں ہے، لیکن ماننے کی صلاحیت ہر فطرت میں ہونی چاہیے ❶۔ کیوں کہ ایسا مذہب جو ہم پر ایسے معلومات پیش کرتا ہو جس کے ماننے کی بھی فطرت انسانی میں گنجایش نہ ہو تو وہ جنوں یا فرشتوں کا مذہب تو ہوسکتا ہے، انسانوں کا مذہب نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید نے مذہب حق کے اسی معیار کا ذکر اپنے مشہور اصول ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَھَا'' میں کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو بھی اس کی فطری گنجایش سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی ہے۔

ایمان ہو یا عمل، ہم میں جس چیز کی صلاحیت پیدا کر دی گئی ہے اسی کا ہم سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔

سچے اور جھوٹے مذاہب میں امتیاز کا معیار:

پس مذہب فلسفہ سے تو اس لیے علاحدہ ہوجاتا ہے کہ اوّل الذکر کی بنیاد کشف ووحی پر ہے اور ثانی الذکر کی بنیاد عقل وحواس پر قایم ہے۔ اسی طرح سچے مذاہب کو

---

❶ شیخ اکبرؒ نے اس کا اظہار کرنے کے بعد کہ عقل سے حق تعالیٰ کا علم حاصل کرنے والا اتلہ اور گم راہ ہے، ارقام فرمایا ہے کہ عقل کا کام علم نہیں بلکہ انما حسبہ التھیو و القبول ما یھبہ اللہ من ذالک فانھم. یعنی عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ خدا کے عطا کیے ہوئے معلومات کو قبول کرے۔

جھوٹے مذاہب سے جدا کرنے کا عام اور سادہ معیار یہ ہے کہ اسے انسانی فطرت پر پیش کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس مذہب کی تعلیمات کو ماننے کے لیے ہماری فطرت کس حد تک تیار ہے؟ اگر عقل وفطرت میں اس کے ماننے کی گنجایش ہے تو یہی مذہب ''دین الفطرۃ'' ہے اور جس مذہب کے معلومات اور نظریات کو ہماری فطرت نہیں قبول کرتی تو اس مذہب کے بطلان کی یہی دلیل ہے۔ لاروس (فرانسیسی) نے مذہب کے متعلق یہ لکھا تھا کہ

''مذہب آتا ہے اور کہتا ہے کہ گردن ڈال دو، کس کے آگے؟ کیا عقل کے آگے؟ نہیں، فطری فرایض کے آگے؟ نہیں احساسات اندرونی کے آگے؟ نہیں۔''

کاش اسے معلوم ہوتا کہ دنیا کا جو فطری مذہب ہے وہ ان تمام سوالات کے جواب میں بجائے ''نہیں'' کے ''ہاں'' کا اعلان کرتا ہے اور اسی کو اپنی صداقت کی دلیل قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنا نام ہی ''دین فطرت'' رکھا ہے اور وہ ہمیشہ اپنی تعلیمات کو پیش کرنے کے بعد عقل انسانی کو جگاتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ تمہاری عقل جس حد تک گہری اور بیدار ہوتی جائے گی مذہبی امور کے ماننے کی بھی صلاحیت تم میں بڑھتی جائے گی۔ جیسا کہ میں نے کہا اس نے اپنا نام ہی دین الفطرت قرار دیا ہے اور اپنا فرض ہی یہ ٹھیرایا ہے کہ جو لوگ اپنی فطرت کے نقطے سے ہٹ کر غیر فطری زندگی بسر کر رہے ہیں، یا غیر فطری احساسات اور معلومات میں اُلجھ کر پریشان ہو رہے ہیں۔ ان کو فطری نقطے تک لایا جائے۔ یہی اس کا حقیقی کام ہے۔

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (الروم:۳۰)

''یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر آدمی کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ دینی دعوت سے فطرت کا بدلنا مقصود نہیں ہے یا اللہ کی پیدا کی ہوئی خلقت کو تبدیل کرنا نہیں ہے۔ یہی سیدھی، لازوال، محکم اور استوار راہ ہے لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے۔''

بہر حال مذہب حق کی صداقت کا ایک بڑا نشان یہی ہے کہ اس کی تعلیمات کے ماننے کی انسانی فطرت میں گنجایش تلاش کرنی چاہیے، نہ کہ جاننے کی۔ اسی لیے پیغمبروں نے ہمیشہ ایمان ''یعنی ماننے'' کا مطالبہ لوگوں سے کیا۔ مغالطہ یہ ہوا کہ پیغمبروں نے ہم سے جن چیزوں کے ماننے کا مطالبہ کیا تھا نادانوں نے سمجھا کہ وہ ہم سے براہ راست ان کے جاننے اور محسوس کرنے کا مطالبہ کرر ہے ہیں، پیغمبر کہتے ہیں کہ ان چیزوں کو مانو، لیکن احمقوں نے کیا کہا کہ ہم ان چیز کو نہیں جانتے ہیں۔ ٹھیک اس کی مثال ایسی ہے کہ ہم کسی سے پھول سونگھنے کا مطالبہ کریں تو اس کے جواب میں کہے کہ ہم پھول کی خوش بو کو کان سے سُن نہیں سکتے ہیں۔ اس زمانے میں مذہب کے غیبی حقایق الملائکہ، الجنتہ، النار، القبر، البرزخ وغیرہ وغیرہ کے متعلق جو مباحث چھڑے ہوئے ہیں، بہ ادنیٰ تامل واضح ہوسکتا ہے کے جاننے اور ماننے کے عدم امتیاز ہی پر اس کی بنیاد زیادہ قایم ہے۔ پیغمبرؑ کہتے ہیں کہ ان امور کو مانو اور انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ ہم ان چیزوں کو جان نہیں رہے ہیں۔

مجھے دنیا کے دوسرے مذاہب سے اس وقت بحث نہیں ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے ذریعے سے جو معلومات انسانی بستیوں میں تقسیم فرمائے ہیں اور جو چیزیں ہم تک پہنچائی ہیں اس کا ایک ایک جز ایک ایک مسئلہ صداقت کے اس معیار پر کھڑا ہو کر اترتا ہے، اتر سکتا ہے، اُتر چکا ہے۔ علمائے اسلام نے اس کے لیے ایک خاص علم بنایا ہے، جس کا نام ''علم الکلام'' ہے۔ اس فن میں یہی کیا جاتا ہے کہ اسلام کے اصولی مسایل میں سے ایک ایک مسئلے کو لے کر دکھایا جاتا ہے کہ اس کے ماننے کے لیے انسانی عقل، ہمارے فطری فرایض، اندرونی احساسات اور اصول فطرت کس حد تک ہم آہنگ ہیں اور ہم اپنے اس درس میں اسلامی حقایق پر اسی حیثیت سے ان شاء اللہ بحث کریں گے۔

ایمان و معرفت یا ماننا اور پہچاننا؟

لیکن کیا مذہبی تحقیقات کا دایرہ اسی حد تک ختم ہو جاتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ علمائے

ظاہر کی کوشش کا یہ آخری نقطۂ پرواز ہے۔ وہ ثابت کر دیتے ہیں کہ

① مذہب کے اصول وعقاید ونظریات ان سوالوں پر مبنی ہیں جو انسانی فطرت سے بے اختیار اُبلتے رہتے ہیں اور ان کے اُبلنے کو کوئی روک نہیں سکتا۔

② وہ یہ بھی ثابت کر دیتے ہیں کہ ان سوالات کے جوابات علم کے عام ذرائع یعنی حواس وعقل سے دینا ناممکن ہے اور ان کے حل کے لیے ہر حال میں ہمیں ایک جدید علمی ذریعے کی، جس کا نام مذہب کی اصطلاح میں ''وحی'' ہے احتیاج ہے اور یہ ساری باتیں گذشتہ بالا مباحث میں بہ تفصیل سمجھائی گئی ہیں۔

③ اس کے بعد یہ علما یہ بھی دکھا دیتے ہیں جیسا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آیندہ معلوم ہوگا کہ وحی اور نبوت کے علمی ذریعے سے جو جواب ہم تک پہنچا ہے عقل وفطرت اور دیگر فطری احساسات کے وہ بالکل مطابق ہے۔ ان سوالات کو براہِ راست جاننے کا تو کوئی ذریعہ ہم میں نہیں ہے، لیکن ماننے اور قبول کرنے کے لیے فطرت انسانی بالکل تیار ہے اور بلاشبہ کسی مذہب کے متعلق اطمینان وتشفی حاصل کرنے کے لیے حکیمانہ روش یہی ہو سکتی تھی۔

لیکن مسلمانوں میں ایک گروہ ہے جس کا دعویٰ ہے کہ صرف ماننے پر جو قناعت نہیں کرنا چاہتے ان کو نبوت ووحی کے معلومات کا مشاہدہ بھی کرایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عام حواس اور عقل کے سوا ہر انسان میں کچھ اور علمی قوتیں بھی پوشیدہ ہیں، جن کی طرف مرزا بیدل نے اپنی مشہور غزل کے مطلع میں بہ ایں الفاظ اشارہ کیا ہے ؂

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو وسمن درآ
تو زغنچہ کم ندمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ

قرآن نے اسی بِرّ انسانی کی تعبیر ''نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي'' (سورۂ ص: ۷۲) سے کی ہے۔ بہر حال یہ اندرونی قوتیں انبیا علیہم السلام کے کامل اتباع اور پیروی کے بعد رفتہ رفتہ بیدار ہوتی ہیں اور جس کی یہ مخفی قوتیں کھل جاتی ہیں وہ ان چیزوں کو دیکھ کر پہچانتا ہے جن کو وہ اب تک صرف مان رہا تھا۔ بہ الفاظ دیگر جس شخص کی یہ باطنی قوتیں

جاگ اُٹھتی ہیں تو اس کو مذہبی حقایق کی معرفت وشناخت شروع ہو جاتی ہے۔ان کے اسی علم کا نام ''معرفت'' یعنی ''شناختن'' ہے۔ کیوں کہ پیغمبروں نے جن چیزوں کو جانا تھا انہی کو وہ پہچانتا ہے اور شناخت ہو یا پہچان اس کا تعلق ان ہی امور سے ہو سکتا ہے جن کے ساتھ گونہ علم بالواسطہ یا بلاواسطہ پہلے متعلق ہو چکا ہو۔ معرفت وشناخت کے اس مقام پر جب عارف پہنچتا ہے تو چلا اٹھتا ہے ؎

صد کتاب و صدورق درنار کن — جان خود را جانب دل دار کن

صیقلے کن یک دو روزے سینہ را — دفتر(ی) خود ساز آں آئینہ را

آئینہ دل چوں کنی صافی و پاک — نقش ہا بینی بروں از آب و خاک

ہم بہ بینی نقش وہم نقاش را — فرش دولت را وہم فرّاش را

اندر آں اشکال غیبی رودہد

عکس حوری و ملک دروے جہد (رومیؒ)

خلاصہ یہ ہے کہ ؎

پنبۂ وسواس بیروں کن زگوش

تاب بہ گوشت آید آواز سروش

بینی اندر دل علوم انبیا

بے کتاب وبے معید و اوستا (رومیؒ)

قرآن کریم اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے اس مخفی قوت کے ظہور کا وعدہ فرمایا ہے اور کوشش کرنے والے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

وَتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ. (سورۂ بقرہ:۲۸۲)

''خدا سے ڈر کر بچو اور اللہ تمہیں سکھائے اور بتائے گا۔''

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. (سورۂ عنکبوت:۶۹)

''اور جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں انھیں ہم اپنی راہیں دکھاتے ہیں۔''

لیکن اس ''معرفت'' اور ''شناختن'' کے لیے طالب کو بجائے مدرسہ اور کسی کالج کے کسی خانقاہ میں اور بجائے ''گفت وقال'' کے ''رفت وحال'' والوں کے پاس جانا چاہیے۔ ہمارے سامنے تو اس وقت صرف متکلمین اسلام کی روش ہے اور اصول اسلام کے اثبات کا یہی وہ طریقہ ہے جسے ''علم الکلام'' کہتے ہیں۔

کلام کے معنی اور اُس کا فایدہ:

اس میں بہت کچھ اختلاف ہے کہ کلام کے کیا معنی ہیں۔ لیکن اگر تاریخی اختلافات سے فایدہ اٹھا کر صرف لغت کی طرف رجوع کیا جائے تو اس لفظ کی تصحیح بہ آسانی ہوسکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ مذہب حق کو باطل سے ممتاز کرنے کا ایک طریقہ تو ''معرفت'' اور شناختن'' کا ہے جو ''عمل'' اور ''مجاہدہ'' پر موقوف ہے اور یہ ہر شخص کو میسر نہیں۔ دوسرا وہی معمولی طریقہ ہے کہ فطرت انسانی کے ساتھ اس مذہب کی تعلیمات کی وابستگی دکھائی جائے یعنی انسان کی فطری اور قدرتی گنجایشوں سے اپیل کی جائے۔ اس میں بھی دو راہیں ہیں۔ بعض لوگ باتوں کے ذریعے سے اس کوشش میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انہی لوگوں کے طریقے کو ''کلام'' یعنی بات کرنے کا طریقہ کہا جاتا ہے اور بعضوں نے کلام کی اس راہ کو دراز و دُور کی راہ پایا کیوں کہ ظاہر ہے کہ اس میں ایک ایک مسئلے کو لینا پڑتا ہے اور فطرت انسانی پر پیش کرکے اس کی وسعت اور گنجایش بتائی جاتی ہے اور پھر اس میں ردوقدح ہوتی ہے، اور یہ سلسلہ دور تک چلتا ہے اور بسا اوقات اس میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جو زبان آور ہوتا ہے وہی بازی لے جاتا ہے۔

پھر قطع نظر دور دراز ہونے کے یوں بھی یہ راہ خطروں سے بھری ہوئی ہے۔ انہی وجوہ سے محققین اسلام نے اس کلامی راہ کو چھوڑ کر ایک اور مختصر راہ نکالی ہے۔

پیغمبرانہ سیرت کے نمونوں کی راہ:

ان بزرگوں نے اندازہ کیا کہ انسانی فطرت جن اعلیٰ اخلاق اور جس اعلیٰ دانش

کے آگے جھکتی ہے، جسے پیغمبروں کی سیرت کہتے ہیں، حتی الوسع اسی کو اپنے اندر پیدا کرلیا جائے۔ جب انسان کسی شخصیت پر اعتماد کر لیتا ہے تو پھر جو کچھ اسے کہا جاتا ہے بغیر دلیل کے مانتا چلا جاتا ہے۔ ارباب علم واخلاص کے ایک بڑے گروہ نے دین کی دعوت کا یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی مسایل اور دینی دعوت کے لیے جتنی کارگر راہ یہ ہے شاید کوئی دوسری نہیں ہوسکتی۔ وہ کہتے ہیں کہ سچ کے آگے ممکن ہے کہ انسان نہ جھکے، لیکن سچے کے نیچے دب جانے پر وہ مجبور ہے۔

پس واقعہ تو وہی ہے کہ مذہب اور مذہبی حقایق کے متعلق خود مطمئن ہونے یا دوسروں کو مطمئن کرنے کی طبعی راہ وہی ہے جس پر ہم ''اللہ والوں'' کو پاتے ہیں۔

علم کلام کا فایدہ:

لیکن اسی کے ساتھ جن لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ مذہب کی بنا صرف روایت پرستی یا خوش اعتقادی پر قایم ہے۔ ''علم کلام'' سے اس غلطی کا ازالہ قطعی طور پر ہوجاتا ہے۔ اس علم کے مطالعے کے بعد ہر مسلمان اپنے کو خاندانی روایات کا شکار یا خوش اعتقادی کا اسیر نہیں بلکہ عقل و دانش کی روشن راہ پر پاتا ہے۔ بوالہوسوں کا یہ غوغا کہ مذہبی ہونا یا دین دار ہونا احمق و بے وقوف ہونے کے ہم معنی ہے۔ ''علم کلام'' سے اس کی تردید پوری قوت کے ساتھ ہوجاتی ہے، بلکہ اُس کے برعکس یہ غیر مشتبہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ بے ایمانی، بداطواری کی زندگی صرف انہی لوگوں کی ہوسکتی ہے جنھوں نے اپنی عقل و بصیرت پر ظلم کیا ہے اور فسق و فجور کے ہتھوڑوں سے اپنے فطری احساسات کو کچل چکے ہیں۔

مذہب کی مخالفت میں جو کچھ کہا جاتا ہے ''علم الکلام'' کا طالب علم اپنے اندر یہ زور محسوس کرتا ہے کہ مذہب کی تائید وحمایت میں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر باتیں کی جاسکتی ہیں اور یقیناً اس علم کا یہ بڑا فایدہ ہے۔ اب میں اسی کلامی طریقے پر حسب وعدہ ان اجزا پر بحث کرتا ہوں۔

باب اوّل:

وجود باری

عالم کی ابتدا کیا ہے؟

فطرت انسانی کے اس اہم اور لازوال مطالبے کے جواب میں تاریخ کے غیر معلوم زمانے سے حضرات انبیا علیہم السلام نے اپنی رائے یا قیاس سے نہیں بلکہ واضح تجربات اور بین مشاہدات کی بنیاد پر جو جواب دنیا کی ہر قوم اور ہر خطے میں پیش کیا ہے اور جس کی توثیق اس وقت بھی ''معرفت'' اور ''شناخت'' کے میناروں پر چڑھنے والے نفوس کر رہے ہیں، اسی جواب کی تعبیر ''مسئلہ وجود باری'' سے کی جاتی ہے۔ ہم سب سے پہلے کلامی معیار پر جانچنے کے لیے اسی مسئلے کو لیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ عالم کی ابتدا بے جان و بے ارادہ مادّہ سے نہیں بلکہ حی و قیوم، علیم وخبیر، زندہ وتوانا خدائے قیوم سے ہوئی ہے۔ اس مجمل دعوے کی اگر تحلیل کرو گے تو اس کے متعلق یہ چند سوالات کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔

(۱) خدا کی ذات کیا ہے؟
(۲) خدا کے صفات کیا ہیں؟
(۳) خدا سے یہ عالم کس طرح ظاہر ہوا؟
(۴) خدا نے عالم کو کیوں پیدا کیا؟ (1)

اب ان میں سے ہر سوال کے جواب میں انبیا علیہم السلام خصوصاً نبی الانبیاء خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جو ذاتی تجربات و مشاہدات پیش کیے ہیں ان کو عقل و فطرت پر پیش کرو اور دیکھو کہ جبلت بشری ان کے ماننے پر کس طرح مجبور اور بے بس ہے۔

---

(1) اسلام کا عملی نظام جو شخصی، خاندانی، قومی اور عام انسانی تعلقات نیز خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ➤

خدا کی ذات:

ابھی صفات سے بحث نہیں ذات سے بحث ہے، صرف خدا کی ذات کو لو اور دیکھو کہ پیغمبروں نے جو کچھ دیکھا اور جانا ہے کیا ہم اس کے سوا کچھ اور بھی مان سکتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ پیغمبروں کا خدا کی ذات کے متعلق جو تجربہ ہے وہ یہی ہے کہ وہ ایک ہستی ہے، جس نے سب کو پیدا کیا ہے، لیکن وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ خود ہمیشہ سے ہے۔ اس تجربے میں خصوصاً دو چیزیں حل طلب ہیں۔

① کیا ہم کسی ایسی ہستی کو سوچ سکتے ہیں جو خود بہ خود موجود ہو؟

② کیا ایسی چیز کا قدیم و ازلی ہمیشہ ہمیشہ ہونا ضروری ہے؟ یعنی اس پر نیستی کا طاری ہونا ناممکن ہے، یا یوں کہو کہ اس کے لیے کوئی ایسا وقت یا زمانہ فرض نہیں کیا جا سکتا جب وہ نہ ہو؟

بلاشبہ نظامِ ہستی میں اس حقیقت و واقعہ کا براہ راست علم و تجربہ تو انہی کو ہو سکتا ہے جو علم کے غیر معمولی ذرائع وحی، نبوت، کشف و الہام سے موصوف ہیں۔

لیکن ہماری عقل و فطرت اور ہمارے اندرونی احساسات کے لیے بھی اس حقیقت کی گرفت ایسی سخت ہے کہ ہم صرف اس کے ماننے پر مجبور و مضطر ہیں۔ بلکہ آپ دیکھیں گے کہ اس حقیقت کا ہر انکار ہمارے دماغ کی فطری ساخت کے لیے اقرار بن جاتا ہے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ ہمیں پیغمبروں نے وہی پانی دیا ہے جس کے لیے ہماری فطرت پیاسی تھی اور ہماری عقل کو وہی روٹی ملی ہے جس کے ہم بھوکے تھے۔

➤ تعلقات کی تفصیل کا نام ہے، دراصل عمل کا یہی نظام اس سوال کا جواب ہے۔ دیباچہ میں اشارہ کر چکا ہوں کہ اس کی تفصیل بھی قلم بند ہو چکی تھی، لیکن تحریر کا رنگ چوں کہ اس میں بدل گیا اس لیے ایک مستقل حصہ قرار دے کر "الدین القیم" حصۂ دوم اس کا نام رکھ دیا گیا ہے، جو ان شاء اللہ شائع ہوگا۔ ناظرین کو اس سوال کا جواب اسی حصے میں ان شاء اللہ ملے گا۔

الدین القیم حصۂ دوم زیرِ نظر کتاب میں شامل ہے۔ (الحسینی)

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۔ (سورۂ روم: ۳۰)

یہ خدا کی ساخت کا نتیجہ ہے جس پر انسان بنایا گیا ہے۔

خدا کی ذات کے متعلق فلسفیانہ دلایل:

عجیب بات ہے کہ ایسی آسان بات کو مذہب کے نادان دوستوں نے عقلی پیچیدگیوں کا بھول بھلیاں بنالیا اور اسی بنیاد پر اس کے انکار اور اقرار کے متعلق ہر ملک کے اہل علم نے دفتر تیار کر دیے، حتی کہ سعدیؒ کو گھبرا کر کہنا پڑا

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست

بر عاقلاں جز خدا ہیچ نیست

حالاں کہ اس سے زیادہ غیر فطری طریقہ اور کیا ہوسکتا تھا کہ تجربہ اور دعویٰ تو لیا جائے ان لوگوں سے جو وحی و نبوت کی غیر معمولی قوتوں سے سرفراز ہیں اور تفہیم و استدلال میں کاسہ لیسی کی جائے ان محرومان سراپردۂ راز کی جن کے متعلق بہ تفصیل معلوم ہو چکا ہے کہ اپنے ذہنی کیسوں اور عقلی پھندوں میں چند لایعنی وسوسوں کے سواوہ کچھ نہیں رکھتے۔ ولیم جیمس نے ان ہی غیر فطری دلایل کے طومار کو دیکھ کر لکھا تھا کہ

"وہ بڑے بڑے دفتر جن میں خدا کو ثابت کیا جاتا تھا اور جو ایک صدی پہلے یقینی سمجھے جاتے تھے آج وہ سب ایسے حقیر ہو گئے ہیں کہ کتب خانوں میں بجائے ان کے خاک بھر دی جائے تو بہتر ہے۔"

ہکسلے نے اس کی تائید میں لکھا، جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ

"جتنی لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا ہے ان میں سب سے بدتر ان لوگوں کے دلایل ہوتے ہیں جو خدا کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں۔"

اثبات خدا کے متعلق مذہب کی راہ:

خدا کے خود بہ خود ہونے کا عقیدہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ نظام ہستی میں

ایک وجود تو خود بہ خود ہے، جس کا نام خدا اور خالق ہے۔ دوسری چیزیں وہ ہیں جو دوسرے سے پیدا ہوتی رہتی ہیں اور ان ہی کو مخلوق کہا جاتا ہے۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ مخلوقات کا انکار نا ممکن ہے، لیکن خدا یعنی وہ ہستی جو خود بہ خود ہو اس کا اقرار مشکل ہے۔ حالاں کہ سوچا جائے تو معاملہ بالعکس نظر آتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ دوسرے سے پیدا ہونے والی ہستیوں کا انکار کر دیا جائے اور انسانوں میں ایک بڑا گروہ ہے جس کا خیال ہے کہ قرآن کی آیت ''هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ'' (سورۂ حدید:۳) کا یہی مطلب ہے مولانا روم فرماتے ہیں:

ماعدمہا ئیم وہستی ہاے ما
تو وجودِ مطلقی فانی نما

اگر چہ فی الحقیقت یہ بھی ایک مشاہدے کا انکار ہے اور اس کا جو صحیح مطلب ہے اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ بہر حال ہستی کے جس سمندر بے پایاں کی صرف ایک موج میں ان لشکروں کا تماشا ہو رہا ہو اور خود مولانا رومؒ کو ہو رہا ہو کہ

لشکرے زاصلاب سوے اُمہات
بہرآں تا دررحم روید نبات
لشکری از ارحام سوئے خاک داں
تا زنر و ماده پرگردد جہاں
لشکرے از خاک داں سوئے اجل
تابہ بیند ہر کسے حسن عمل

تو جہاں یہ ہو رہا ہو دوسرے سے پیدا ہونے والی ہستی کے انکار کی وہاں کیا گنجایش ہے؟ یہی وجہ ہے کہ بیچارے غالب باوجودے کہ مخلوقات کے وجود سے انکار کرنا چاہتا ہے، لیکن پھر بھی گھبرا کر پوچھتا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

تاہم مخلوقات یعنی دوسرے سے پیدا ہونے والی ہستیوں کے وجود میں لوگوں نے شک کیا ہے، لیکن خود بہ خود ہونے والی ہستی کے انکار کی انسانی دماغ میں قطعاً گنجایش نہیں۔

خود بہ خود ہونے والی ہستی کا انکار بھی اس کا اقرار ہے:

آخر انسان کیا کر سکتا ہے؟ اگر نظام ہستی میں خدا کا انکار اس لیے کرتا ہے کہ کسی خود بہ خود ہستی کا تصور اس کے لیے ممکن نہیں تو اب وہ کس چیز کا اقرار کرے گا؟ یہی نا کہ نظام ہستی کی بنیاد خدا پر نہیں بلکہ ایسی ہستی پر ہے جو خود بہ خود ہے اور یہی تو خدا کے تجربے کا پہلا جز تھا۔ دیکھو کہ خدا کے لفظ کا جس نے انکار کیا تھا پلٹ کر پھر اسی خدا تک مادّہ پرست اور خدا پرست دونوں اس خود بہ خود ہستی کے اقرار پر اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ خدا پرست تو خدا کا اقرار کر کے اس خود بہ خود ہستی کا اقرار کرتا ہے اور مادّہ پرست خدا کا انکار کر کے اس خود بہ خود ہونے والی ہستی کا اقرار کر بیٹھتا ہے، جس کا نام وہ مادّہ رکھتا ہے۔ بہر حال اس نقطے تک دونوں گروہوں میں صرف نزاع لفظی ہے۔ ایک اس خود بہ خود ہستی کا نام خدا رکھتا ہے اور دوسرا مادّہ۔ ہاں! ان میں حقیقی اختلاف صفات کی آیندہ تشریحات میں پیدا ہو جاتا ہے۔ پیغمبروں نے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ان غیر محدود پیمانے پر کمالات اور برکات کو اس خود بہ خود ہستی میں پایا ہے، جن کی جلوہ آرائیاں محدود پیمانے پر کاینات کے مختلف طبقات میں ہمارے سامنے ہو رہی ہیں اور مادّہ پرستوں نے بے دیکھے بے جانے یہ بے پر کی اڑا دی کہ نظام ہستی میں جن کمالات اور اوصاف کی نمایش ہو رہی ہے ان سے وہ خود بہ خود ہونے والی ہستی جس سے سب ہوئے ہیں، مفلس ہے۔

بہر حال اس کی بحث تو آیندہ آئے گی، اس وقت تو مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ جس خود بہ خود ہستی پر ایمان لانے کی پیغمبروں نے دعوت دی ہے انسان اس کے سوا کچھ مان بھی نہیں سکتا اور آپ نے دیکھا کہ فطرت اور عقل اس کے متعلق کتنی مضطر ہے۔ اقرار کرتے ہیں تو اقرار ہے۔ انکار کرتے ہیں تو وہ بھی اقرار بن جاتا ہے۔ اس

سے زیادہ یقینی حقیقت ہمارے لیے اور کیا ہو سکتی ہے؟

عام طور پر یہ جو مشہور ہو گیا ہے کہ خدا کا اثبات نہایت دشوار ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام الناس میں یہ خیال پھیل گیا ہے کہ نظام ہستی کو مذہب دوسرے سے پیدا شدہ مانتا ہے۔ حالاں کہ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ہستیاں دوسرے سے نکل رہی ہیں ان کو ہم دوسرے سے پیدا شدہ مانتے ہیں تو بتایا جائے کہ مذہب اس کے سوا اور کیا مانے؟ اور اگر یہ مطلب ہے کہ ہستی کے اس نظام کو مذہب والے کسی خود بہ خود ہونے والی ہستی پر ختم نہیں کرتے ہیں تو یہ بالکل غلط ہے۔

ہم جو کچھ محسوس کر رہے ہیں پیغمبر بھی اس کو ایک خود بہ خود ہستی کا جلوہ اور اثر قرار دیتے ہیں اور جو پیغمبروں سے باغی ہیں وہ بھی اس کے سوا کچھ سوچ نہیں سکتے، کیوں کہ پیغمبروں کے نزدیک ہستی کا نظام خدا سے وابستہ ہے اور خدا چوں کہ خود بہ خود ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ہستی کا سارا نظام ان کے نزدیک ایک خود بہ خود ہستی کا نظام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مذہب، کائنات کی بنیاد ایک ایسی ہستی پر قایم کرتا ہے جو خود بہ خود ہے اور اسی بنیادی وجود کا نام مذہبی زبان میں خدا ہے۔ اس کا حاصل بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہستی کا نظام ایک خود بہ خود ہستی کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ ایک ایسی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جنھوں نے اس کا انکار کیا ہے مجبور ہو کر اسی کا ان کو پھر اقرار کرنا پڑا ہے۔ آخر خدا کے منکروں میں جو اپنے آپ کو شمار کرتے ہیں اس کے سوا وہ اور کیا مانتے ہیں کہ ہستی کا یہ سارا نظام ایک خود بہ خود ہستی جس کا نام وہ کچھ ہی رکھیں، اسی کا مظہر ہے۔ ان مسکینوں سے پوچھنا چاہیے کہ اس حد تک مذہب بھی اور کس بات کا مدعی ہے؟ پس واقعہ یہ ہے کہ خود بخود ہستی پر ہستی کے اس نظام کا اختتام اور انتہا اس کا اقرار بھی اقرار ہے اور اس کا انکار بھی اسی کا اقرار ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ

کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

خداوند قدوس کی ہمیشگی:

اور جس طرح عقل کے لیے یہ ایک بدیہی حقیقت ہے، اسی طرح ہم اس بات

کے سوچنے سے بھی قطعاً عاجز ہیں کہ بغیر لکڑی کے یکایک کرسی پیدا ہوگئی ہے۔ ہم جو کچھ جانتے ہیں یا جان سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ ہمیشہ ہستی، ہستی ہی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ فطرت انسانی میں قطعاً اس کی گنجایش نہیں ہے کہ وہ نیستیِ محض سے ہستی کے نکلنے کا تصور کر سکے۔ پس وہ خود بہ خود ہستی جس کے ساتھ نظام ہستی وابستہ ہے، اگر اس کے متعلق کوئی یہ سوچ کہ ایک زمانے تک وہ نہ تھا پھر یکایک وہ ہوگیا، تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ نیستی یعنی عدم سے وجود پیدا ہوا۔ حالاں کہ میں بتا چکا ہوں کہ اس مفہوم کے سوچنے کی ہم میں قطعاً گنجایش نہیں۔ اور یہی مراد ہے پیغمبروں کے اس تجربے کی، جہاں خداوند قدوس کا وجود خود بہ خود ہے، اسی کے ساتھ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے بھی ہے۔ جس کا حاصل یہی ہے کہ ہستی، ہستی ہی سے نکلی ہے اور ہستی ہمیشہ سے ہے اور رہے گی۔

آریائی مادّہ اور روح کا فالتو وجود:

سنا جاتا ہے کہ بازاروں میں آریوں نے غل مچا رکھا ہے کہ مسلمانوں کا ایک عام عقیدہ یہ بھی ہے کہ عالم نیست محض سے ہست ہوا ہے۔ حالاں کہ پیغمبروں کا تجربہ یہ ہے کہ موجودہ نظام ہستی ایک خود بہ خود ہستی کی جلوہ گاہ ہے اور اس کا مطلب بغیر اس کے اور کیا ہے کہ ہستی، ہستی ہی سے پیدا ہوئی ہے اور مسلمان جب اس خود بہ خود ہستی کو جس پر کاینات کی بنیاد قایم ہے، ازلی مانتے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ وہ نیست سے ہست نہیں ہوا ہے یا یہ کہ ''وہ نہ تھا اور پھر ہوگیا'' ایسا نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ سے ہے۔ تو پھر ان آریوں کی یہ تہمت نہیں تو اور کیا ہے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمان جب عالم کو خدا سے پیدا شدہ مانتے ہیں تو ہستی سے ہستی کو نکلی ہوئی تسلیم کرتے ہیں یا نیستی سے عالم کو نکالتے ہیں؟ بلاشبہ جس کا عقیدہ یہ ہو کہ ''خدا نہ تھا اور پھر کچھ مدت کے بعد ہست ہوا'' ان پر ضرور یہ سوال وارد ہوسکتا ہے کہ نیستی سے ہستی کس طرح پیدا ہوئی؟ لیکن جو خدا کی ہستی کو ہمیشہ ہمیشہ سے ازلی مانتے ہیں ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ نیستی سے ہستی کے پیدا ہونے کے قایل ہیں بالکل عجیب بات ہے۔ قرآن پاک میں اسی

نظریے کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ○ (سورۂ طور: ۳۵)

''کیا انسان نیست محض (غیر شے) سے پیدا ہوا ہے؟ یا اس نے اپنے آپ کو خود پیدا کیا ہے۔''

ظاہر ہے کہ نیستی سے ہستی کی پیدائش کو ہم سوچ ہی نہیں سکتے اور اس سے بھی زیادہ جھوٹ یہ ہوگا کہ ہم اپنے آپ کو اپنا خالق مانیں۔

باب دوم:

توحید

آریوں نے مسلمانوں پر یہ الزام لگا کر کہ ''وہ نیستی سے ہستی کے پیدا ہونے کے قایل ہیں'' اپنا ایک خود تراشیدہ وہم یہ پیش کیا ہے کہ ''عالم صرف خدا سے نہیں بلکہ مادّہ سے بھی ظاہر ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس فطری یقین کو محفوظ رکھنے کے لیے کہ ''ہستی، ہستی ہی سے پیدا ہوتی ہے'' خدا کی ہستی کیوں کافی نہ تھی؟ جو مادّہ کے وجود کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہستی کو ہستی ہی سے پیدا ہونا چاہیے۔ یہی پیغمبروں کا مشاہدہ بھی ہے کہ موجودہ نظامِ ہستی اس ہستی سے ظاہر ہوا ہے جس کا نام خدا ہے، پھر خدا کے پہلو میں کسی فالتو ہستی (مادّہ یا روح) کے اضافے کی کیا ضرورت ہے؟ قرآن پاک میں توحید کے جہاں اور دلایل بیان کیے گئے ہیں ان میں زیادہ زور اسی دلیل پر ہے کہ ہستی کی پیدایش کے لیے خدا یعنی ایک خود بخود ہستی کے ماننے کے لیے تو آدمی یقیناً مجبور ہے، لیکن اس ہستی کے سوا کسی اور خود بہ خود ہستی کی ضرورت کیوں بتائی جاتی ہے؟ قرآن کا ارشاد ہے کہ کسی کے پاس کوئی دلیل، کوئی شہادت ہو تو پیش کرے[1]:

---

[1] ان لوگوں پر حیرت ہے جنھوں نے توحید جیسے آسان اور سہل مسئلے کو طریقۂ بحث کی غلطی سے خواہ مخواہ ایک پیچیدہ مسئلہ بنادیا۔ ورنہ قرآن نے اس سلسلے میں جو فطری راہ پیش کی تھی فیصلے کے لیے وہی کافی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ شرک و توحید پر بحث کرنے سے پیشتر یہ طے کرلینا چاہیے کہ ان دونوں دعووں میں کس دعوی کی حیثیت اثبات کی ہے اور کس کی انکار کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک خدا کو مان کر مشرک ہی دوسرے خدا کا اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ پس مدعی تو مشرک ہی ہے۔ رہا موحد تو اس کا مقام صرف انکار کا مقام ہے یعنی مشرک کے اضافہ کردہ خدا کا وہ صرف انکار چاہتا ہے۔ بحث و تحقیق کا عام قاعدہ ہے کہ صرف مدعی ہی پر بارِ ثبوت ہے، منکر کے لیے صرف انکار کافی ہے۔ افسوس ہے کہ قرآن نے توحید کے باب میں یہی فطری راہ پیش کی تھی، لیکن ہمارے متکلمین کا ایک گروہ بلاوجہ مدعی بن بیٹھا اور محض اس غلط طریقہ کی وجہ سے ◄

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى قُلْ لَّآ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ O

''پوچھیے ! کیا تم مشرکین اس کی شہادت دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کہیے کہ میرے پاس اس کی شہادت نہیں ہے اور کہیے کہ وہ تو یکتا واحد معبود ہے اور بلاشبہ ہم ان سے قطعاً جدا ہیں جنھیں تم اللہ کا ساجھی ٹھیراتے ہو۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى O (سورۂ نجم:۲۳)

''یہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ داداؤں نے تراش لیے ہیں۔ اللہ نے اس کے متعلق کوئی دلیل نہیں اتاری، یہ مشرکین صرف اٹکل پچو باتوں اور اپنی خواہش کے پیچھے چلے جا رہے ہیں، حالاں کہ ان کے پروردگار کی رہنمائی ان کے سامنے آچکی ہے۔''

ایک اور جگہ چیلنج دلایا گیا ہے کہ ان کے فالتو معبودوں کے متعلق ان مشرکین کے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کریں!

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍۢ بَيِّنٍ O (سورۂ کہف:۱۵)

''ہماری قوم کے لوگوں نے اللہ کے سوا جو معبود بنا لیے ہیں۔ کیوں نہیں وہ

◄ ان کو تمانع وغیر اقناعی دلائل پیش کرنے پڑے اور لطف یہ ہے کہ توڑ مروڑ کر قرآنی آیتوں کو بھی ان خود ساختہ دلائل پر منطبق کرنا پڑا، جس دلیل کا نام متکلمین نے ''برہان تمانع'' رکھا ہے اور قرآن کی جس آیت سے وہ اسے نکالنا چاہتے ہیں آیندہ اوراق میں اس آیت کی ایک جدید توجیہ آپ کو نظر آئے گی۔ ضرورت ہے کہ اس پر خاص توجہ کی جائے۔

کوئی کھلی دلیل اس پر لاتے ہیں؟''

بہر حال اسی مسلک کی طرف قرآن نے اعلان کیا ہے کہ

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ. (سورۂ مومنون:۱۱۷)

''اور خدا کے سوا جو دوسرے معبود کو پکارتا ہے اس کے پاس اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں ہے؟''

توحید کے سلسلے میں قرآن کا لازوال اور لاجواب مطالبہ:

توحید کے متعلق قرآن اس ٹھوس مطالبے سے بھرا ہوا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس مطالبے کا نہ کوئی جواب کسی نے اب تک دیا ہے اور نہ کوئی دے سکتا ہے۔ صرف خیر وشر کی تقسیم سے مغالطہ کھا کر قدیم ایرانی فلاسفروں کے ایک گروہ نے یزدان کے ساتھ اہرمن کے وجود کے اضافے کو عقل کا تقاضا ٹھیرانا چاہا ہے۔ اس مسئلے پر ہم فلسفۂ غم کے تحت میں کافی بحث کریں گے، لیکن پارسیوں سے اتنا اس وقت ہی پوچھتے چلنا چاہیے کہ تمہاری مراد خیر وشر سے کیا ہے؟ اگر خیر سے نفع بخش اور شر سے ضرر رساں چیزیں مراد ہیں تو کیا اس قسم کے خیر کا وجود شر سے علاحدہ ہو کر پایا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو شاید شر کے لیے علاحدہ خالق کی تلاش ممکن بھی تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جس آگ سے ہمارے گھر جلتے ہیں اسی سے کھانا بھی پکتا ہے، اور جس پانی سے اناج پیدا ہوتا ہے اسی سے طوفانی مصایب بھی آتے ہیں اور علیٰ ہذا جس آفتاب کے نور وحرارت سے روشنی ملتی، توانائی پیدا ہوتی اور کھیتی پکتی ہے اسی کی حرارت سے کھیتیاں جھلس بھی جاتی ہیں۔

الحاصل ایک ہی چیز کے صحیح استعمال سے نفع بھی ہوتا ہے اور استعمالی غلطی سے وہی چیز شر بھی بن جاتی ہے۔

اضداد کی باہمی آویزش اور مسئلۂ توحید:

بہر حال جب خیر کا وجود شر سے علاحدہ ہو کر نہیں پایا جاتا ہے بلکہ استعمالی غلطی سے خیر ہی شر بن جاتا ہے تو ایک کے لیے دو خالق کی تلاش نہ صرف فضول بلکہ قطعاً غلط

ہے۔ لہٰذا پارسیوں کے دو خداؤں میں سے بھی ایک اسی طرح فالتو ہو جاتا ہے جس طرح آریوں کا مادّہ اور روح۔ ہاں! اگر بجائے خیر و شر کے یہ کہا جائے (اور غالباً ایرانی فلاسفہ کی یہی مراد بھی ہوگی) کہ نظام عالم کی بنیاد متضاد قوتوں پر مبنی نظر آتی ہے، نیستی کے ساتھ ہستی اور حیات کے ساتھ موت لگی ہوئی ہے، حرارت کے ساتھ برودت اور رطوبت کے ساتھ یبوست۔ علیٰ ہذا سکون کے ساتھ حرکت اور ضعف کے ساتھ قوت کے مظاہرے یہاں ہر آن اور ہر لمحہ دیکھے جاتے ہیں، تو ان تماشوں کا کون انکار کر سکتا ہے؟ بلکہ سچ یہ ہے کہ مظاہر فطرت میں شاید ہی کوئی ایسی صفت ہو لی جس کی ضد یہاں موجود نہ ہو، لیکن کیا اس سے بجائے ایک کے دو کی ضرورت ثابت ہوتی ہے؟ تم اضداد کو دیکھتے ہو لیکن ان اضداد کی باہمی آویزشوں اور پیچیدہ پیوستگیوں سے آنکھیں کیوں بند کر لیتے ہو؟ غور تو کرو! بیچاری عقل جو دو ضدوں کے باہمی اجتماع کو سوچ بھی نہیں سکتی اسی کی پیٹھ پر کائنات کی ان غیر محدود لامتناہی اضداد کی کثرتوں کے اجتماع کے بوجھ کو کیسے لادا جا سکتا ہے جب تک کہ کسی شیرازہ وحدت کے ساتھ انھیں جکڑا نہ جائے؟ قرآن نے اسی حقیقت کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے:

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ م بِمَا خَلَقَ وَلَعَلٰى بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ O (سورۂ مومن: ۹۱)

''اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہ اپنی مخلوق کو (یا ہر الٰہ اپنے مظاہر و آثار کو) لے بھاگتا اور بجائے آویزش و ترکیب کے ایک دوسرے پر چڑھ جاتے۔''

اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا تو ہستی کے جس نظام کی بنیاد انھیں اضداد پر قائم ہے کیا وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی قائم رہ سکتا تھا؟ رطوبت کے مظہر پانی کو حرارت کے مظہر آگ کو الغرض اس قسم کے اضداد کے مظاہر میں سے کسی ایک چیز کو نکال لو! تو کیا پھر یہ دنیا یہی دنیا رہ سکتی ہے؟ قرآن میں وحی کا اگر یہ تجربہ پیش کیا گیا ہے کہ

لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا. (سورۂ انبیاء: ۲۲)

''اگر آسمان وزمین میں خدا کے سوا اور کوئی معبود ہوتا تو یہ دونوں برباد ہو جاتے۔''

خود غور کرنا چاہیے کہ پیغمبروں کے اس مشاہدے کے سوا کیا عقل کچھ اور بھی سوچ سکتی یا مان سکتی ہے؟ بلاشبہ ہم سے وہی منوایا گیا جس کے سوا ہم کچھ مان ہی نہیں سکتے اور وہی سمجھایا گیا جس کے سوا ہم کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اضداد کے جس ایرانی فلسفے کو پیغمبروں کے تجربۂ توحید میں شک اندازی کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ یہی فلسفہ الٹ کر شرک کے گلے کا پھندا بن گیا اور لے دے کر توحید کے دشمنوں کے ہاتھ میں ایک حربہ تھا۔ آخر اضداد کا یہ مجموعہ جو باہم اتنی سختیوں کے ساتھ جکڑا ہوا ہے، موحد اگر اسے جکڑا ہوا مانتا ہے تو کیا بکھرا ہوا مانے؟ سچ کو جھوٹ نہیں بنایا جا سکتا اور بلاشبہ وحی اور نبوت کے تجربات اور مشاہدات کا انکار بغیر اس کے ہو نہیں سکتا۔ قرآن نے سچ فرمایا:

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ. (سورۂ بقرہ: ۱۳۰)

''ابراہیم کی ملّت (دین اسلام اور دین فطرت) سے وہی کترا سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو احمق وسفیہ بنالیا ہو۔''

پارسیوں کو اپنی کتاب کا صحیح علم نہیں ہے ورنہ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ ان کو اپنی کتابوں میں بھی ملتا۔ ژنداوستا میں زرتشترا کی طرف یہ عبارت منسوب کی گئی ہے:

''نیک اندیشوں اور سچے خیال والوں کے نزدیک اہرمزدرا، رب دوجہاں ہے، جو لوگ بتوں کے خیال میں منہمک رہتے ہیں اور مشرک ہیں یا وہ جو شرارت یا بدنفسی میں مبتلا رہتے ہیں، رذیل ہیں۔'' (ژنداوستا حصہ پاسا)

الحاصل حق سبحانہ تعالیٰ کا خود بہ خود موجود ہونا، ہمیشہ ہمیشہ سے ہونا، ایک ہونا نبوت کے یہ ایسے روشن تجربات ہیں جن کے اقرار پر یہ بھی مجبور ہیں، جو بے دیکھے بے جانے خدا کا بلاوجہ انکار کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ان حدود تک مذہب اور لامذہبیت کوئی اختلاف نہیں۔ پیغمبروں سے جو باغی ہیں ان کو بھی یہی ماننا پڑتا ہے اور ایمان لانے والوں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

باب سوم:

مسئلہ صفات

خدا پرستوں اور منکرین خدا کے درمیان اختلاف کا حقیقی خط:

بہر حال مادّہ اور خدا کے متعلق یہاں تک جتنے جھگڑے ہیں صرف لفظوں کی لڑائی ہے۔ البتہ اس کے بعد پیغمبرانہ تجربات نے حق تعالیٰ کے لامحدود کمالات اور صفات اعلیٰ یا اسمائے حسنیٰ کے متعلق جن واقعات کا مشاہدہ اور علم حاصل کیا ہے، حقیقی اختلاف کی سرحد یہیں سے شروع ہوتی ہے اور دراصل پیغمبروں اور دہریوں کی بحث کا اصل خط جنگ یہی ہے۔ انبیا علیہم السلام کا مشاہدہ ہے کہ جس خود بخود ہستی کی یہ عالم نمایش گاہ ہے وہ ان تمام کمالات سے موصوف ہے جن کو ہم کاینات کے طویل و عریض سلسلے میں مختلف نوعیتوں کے ساتھ مختلف پیمانوں پر مشاہدہ کرر ہے ہیں۔ مثلاً زندگی، حیات، علم، بینائی، شنوائی، ارادہ، قوت اور اسی قسم کے جتنے کمالات اور فیوض ہیں جن کی غیر محدود موجیں مختلف صورتوں سے محسوسات کے مختلف مظاہر میں چاروں طرف سے ابل رہی ہیں، پیغمبروں کا دعویٰ ہے کہ ان ہی کمالات کے ساتھ حق سبحانہ وتعالیٰ اپنی شان اعلیٰ کے مطابق موصوف ہیں، لیکن مادّہ پرست، منکر مذہب اس کے برخلاف مدعی اور صرف مدعی ہے (کیوں کہ بہ تفصیل معلوم ہو چکا ہے کہ سرچشمۂ صفات تک عقل وحواس کے ذریعے سے رسائی قطعاً ناممکن ہے)۔ بہر حال مادّہ پرستوں، منکرین خدا کا یہ گروہ بے دیکھے، بے جانے، بے سمجھے اپنے اس وہم میں گرفتار ہے کہ وہ خود بہ خود ہستی جس پر نظام کاینات کی انتہا ہوتی ہے ان تمام کمالات سے مفلس اور عاری ہے۔ اور اسی لیے انھوں نے اپنے آپ کو پیغمبروں سے جدا کرنے کے لیے اس خود بخود ہستی کا نام بجائے خدا کے مادّہ رکھ لیا ہے۔ مادّہ کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ خود بہ خود ہستی جس پر نظام عالم کی بنیاد قایم ہے اور ان تمام کمالات سے وہ معرّا ہے

جو خدا کے لیے ثابت کیے جاتے ہیں۔ قرآن پاک کی جن دلیلوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اثبات خدا کے دلایل ہیں دراصل ان کا زیادہ تر تعلق صفات ہی کے اثبات سے ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآنی روشنی میں نبوت کے اس مشاہدہ اور تجربے کے متعلق یہ دکھاؤں کہ عقل و فطرت میں بھی ان دعوؤں میں سے کس دعوے کے ماننے کی گنجایش ہے اور کس کے انکار پر ہم مجبور ہیں۔

نابود کے نمود کا دعویٰ:

مسئلہ صفات کے متعلق مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ نے یہ عجیب وغریب سوال پیش کیا ہے:

''نہ تھا تو ہوا کہاں سے؟''

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم جن کمالات واوصاف کو ہستی کے مختلف مظاہر میں محسوس کر رہے ہیں مثلاً ارادہ، اختیار، حیات، علم، بینائی، شنوائی، قدرت وغیرہ کے متعلق مادّہ پرستوں کا یہ وہم یعنی بغیر جانے ہوئے یہ ادّعا ہے کہ ابتدا میں ہستی ان کمالات سے بالکل مفلس تھی، اس میں نہ زندگی تھی، نہ علم تھا، نہ ارادہ، نہ شعور، غرض کچھ نہ تھا، پھر رفتہ رفتہ ارتقا کے مختلف مدارج کو خود بہ خود طے کرتے ہوئے ان نابود اور معدوم صفات کا اس میں نمود اور بود شروع ہوا، جس کا حاصل یہی ہوا کہ ان لوگوں کے نزدیک جو نہ تھا وہ ہوا اور ہو رہا ہے۔ سوچنا چاہیے کہ وہی عقل جو نیست محض کے ہست ہونے کو سوچ نہیں سکتی تھی، جس کے نزدیک نیستی سے ہستی کی پیدایش ایک ناقابل تصور خیال تھا، اسی عقل اور اسی فطرت میں کیا یہ عجیب وغریب دعویٰ سما سکتا ہے کہ جو نہ تھا اس کے ہونے کا یقین کرے؟ آخر جس میں ارادہ نہ تھا اس سے قدرت نکلنے کے کیا یہی معنی نہ ہوئے کہ جو نہ تھا وہ ہوا، جو نیستی تھی وہ ہستی بنی؟ [1]۔ سچ یہ ہے کہ انسان

---

[1] پروفیسر اسٹارٹ ذہنی صفات کی نیرنگیوں کا اندازہ کرتے ہوئے اس بے ربطی کو جو مادّہ اور ذہنی مظاہر میں ہے ان الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ جہاں کہیں سے بھی ذہن شروع ہوتا ہوا سمجھا جائے وہ اس طرح ◄

جب تک اپنی موجودہ عقل اور فطرت کو برباد نہ کرلے، اس وہمی دعوے کے آگے سر جھکانے کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہوسکتا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ''لامذہبیت کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان میں لاعقلیت پیدا ہو جائے۔'' اب آؤ اس کے مقابلے میں ان تجربات اور مکاشفات کو سنو جو دنیا کے ہر خطے اور ہر آبادی کے برگزیدہ اور راست باز انسانوں نے، اُن انسانوں نے پیش کیے ہیں جن پر فطرت انسانی نے سب سے زیادہ اعتماد کیا ہے، یعنی وحی اور نبوت والوں کا ارشاد سنو! ابھی اس سے بحث نہیں کہ زندگی کیا چیز ہے؟ علم کی حقیقت کیا ہے؟ ارادے کی کیا تعریف ہے؟ لیکن اتنا تو سب کو معلوم ہے کہ ہستی کے یہ اوصاف ہیں جنھیں وجود کا کمال اور اس کی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ جس سے بینائی جاتی رہتی ہے ہم اس اندھے کو ناقص سمجھتے ہیں، یہی حال تمام کمالات کا ہے۔

بہرحال پیغمبروں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان جن چیزوں کو کمال سمجھتا ہے یا کمال سمجھ سکتا ہے، کائنات کا بنیادی وجود ان تمام کمالات سے ازلاً اور ہمیشہ سے موصوف ہے۔ مطلب کیا ہوا؟ یہی کہ ہمارے سامنے ''نابود'' کی ''نمود'' نہیں بلکہ ''بود'' ہی کی ''نمود'' اور ''بود'' ہو رہی ہے، جو نہ تھا وہ نہیں ہوا، بلکہ جو تھا وہی ہوا اور وہی ہو رہا ہے۔ اب غور کرنا چاہیے کہ ''جو تھا وہی ہوا اور وہی ہو رہا ہے'' عقل کے لیے اس کا ماننا آسان ہے یا ''جو نہ تھا وہ ہوا اور ہو رہا ہے'' اس دشوار اور جھوٹی حقیقت کو فطرت اپنے اندر اتار سکتی ہے؟ اس مسخرے نے سچ کہا تھا کہ میں بھینس سے انڈا اور انڈے سے روغن گل اور روغن گل کے ساتھ کل دوائیں بھینس کے انڈے سے کس طرح نکالوں؟ مگر مادّہ پرست اسی کے ماننے پر آدمی کو مجبور کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ یہی عقل کی بات ہے۔ سوچو! کیا اس سے بڑے درجے کی بھی کوئی سفاہت اور دیوانگی ہوسکتی ہے؟

➤ ناگہانی طور پر نمودار ہوتا ہے جس طرح طپنچہ سے گولی، جو طپنچہ میں پہلے سے موجود نہ ہو...... ذہن کا مادّہ سے پیدا ہونا مادّی دنیا میں فطرت کے سارے نظام کے منافی و متناقض ہے۔ یہ گویا عدم سے وجود کی تخلیق کے معجزے کا قایل ہونا ہے۔ (کتاب مائنڈ اینڈ میٹر: صفحہ ۱۱۰ تا ۱۱۶)

صفات کے متعلق قرآن کا طریقۂ خاص:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ! قرآن مجید کی پہلی سورت سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت ہے، جس میں بجائے ذات کے (جو متفقہ مسئلہ ہے) خدا کی صفات کے اثبات سے مذہب کے درس کی ابتدا کی گئی ہے۔ کیوں کہ مذہبیت و لا مذہبیت کے اختلاف کا پہلا اصولی نقطہ جیسا کہ معلوم ہو چکا یہی ہے ❶۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ جس کسی کی جہاں کہیں بھی کوئی تعریف وستایش کی جائے وہ اسی اللہ کے لیے ہے جو عالمین (یعنی تمام وہ چیزیں جو ہمارے علم کی گرفت میں آرہی ہیں) کی تربیت کرنے والا ہے یعنی بہ تدریج کسی کمال الٰہی کا اسے مظہر بنا رہا ہے، مثلاً ایک نطفے میں بہ تدریج ان کمالات کی نمایش کرتا ہے جسے ہم انسانی کمالات کہتے ہیں۔ لوگ جب ابتدا میں قرآن کے اس دعوے کو سنتے ہیں تو انھیں حیرت ہوتی ہے، کیوں کہ اس دنیا کا ہر ذرہ کوئی نہ کوئی کمال رکھتا ہے اور ہر ایک اپنے کمال کے مطابق سراہا جاتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ سارے کمالات اور ان کمالات کی ساری تعریفیں خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، ایک عجیب سی بات ہے، لیکن بات سمجھی نہیں گئی، یہی تو قرآن پوچھنا چاہتا ہے کہ ہستی کے ہر ذرّے میں جن کمالات اور خوبیوں کی نمایش ہو رہی ہے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ نہ تھے اور ہو گئے ہیں؟ کیا تمھاری عقل اس بات کو سوچ سکتی ہے کہ نیستی سے ہستی بنی؟ پس جب ایسا نہیں ہے تو یقین کرو کہ جہاں کہیں، جس کسی میں جب کوئی ایسا کمال نظر آتا ہے جس کی تعریف کی جاتی ہے تو ان سب کا مرجع اور سرچشمہ وہی ازلی وجود ہے، جو ان کمالات سے ازلاً و ابداً موصوف تھا اور ہے، اور جو ہمارے تمام محسوسات و معلومات

---

❶ اسی مقام سے اس راز کا انکشاف ہو سکتا ہے کہ قرآن نے اپنے درس کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، سے کیوں کی؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا ذات کی حد تک تو خدا کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، دونوں ہی عالم کے اس نظام کو ایک خود بہ خود ہستی کا نظام مانتے اور اسی خود بہ خود پر اس نظام کو ختم کرتے ہیں، پس مانی ہوئی چیز کے منوانے کی حاجت ہی کیا تھی؟ اختلاف کا نقطہ تو صفات سے شروع ہوتا ہے، اسی لیے قرآن نے اسی سے اپنی بحث کا آغاز کیا۔

(عالمین) کے آئینے میں اپنے کمالات کو مختلف طریقوں سے چمکا رہا ہے اور وہ جو کائنات کے ہر ذرّے کی ستائش وحمد کے گیت گاتے ہیں، لیکن اپنی بدعقلی سے جو ان کا بنیادی وجود اور حقیقی سرچشمہ ہے اس کا مادّہ نام رکھ کر ہر قسم کے کمالات سے اسے بے بہرہ سمجھتے ہیں یا سمجھنا چاہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ جو نہ تھا اس کے ہونے کا دعویٰ کر کے انسان کے اندرونی احساسات کو زیروزبر کر رہے ہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو فطرت پر ان کے جاہلانہ مظالم کا سلسلہ بہت وسیع نظر آئے گا۔ مثلاً:

قانون تناسب کی خلاف ورزی:

اونٹ کے گزرنے کے لیے صرف یہ کہہ دینا کہ سوراخ موجود تھا اس لیے گزر گیا، کیا عقل کی تسلیم کے لیے اتنا کافی ہے؟ عقل اس بات کو کیا مان سکتی ہے کہ سوئی کے ناکے میں بھی چوں کہ سوراخ موجود ہے اس لیے اونٹ کو اس سے گزر جانا چاہیے؟ اس کی تسلیم سے عقل کیوں سرتابی کرتی ہے؟ ظاہر ہے کہ سبب ومسبب اثر وموثر میں کوئی تناسب نہیں ہے، پھر سوئی کے ناکے سے اونٹ کے گزر جانے پر اصرار عقل کے ساتھ اگر ظالمانہ چیرہ دستی ہے تو کیا یہی ظلم عقل انسانی پر وہ نہیں کر رہے ہیں جو ہر قسم کے کمالات سے مفلس مادّہ سے کائنات کے اس محیر العقول حیرت ناک نظام کو نکالنا چاہتے ہیں؟ آسمان وزمین، ثوابت وسیارے، دریا وپہاڑ، حیوانات وانسان وغیرہ کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ یہ سب کہاں سے آئے؟ اب جو اس کے جواب میں مجبور ولاچار، بےعلم وبےجان مادّہ کا نام بغیر کسی مشاہدہ اور تجربے کے لیتا ہے بتاؤ اس نے اپنی عقل پر پتھر مارا یا جو اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر خدائے قادر وتوانا کا نام جپتا ہے اس نے ہماری فہم کے فطری قوانین کے ساتھ انصاف کیا؟ قرآن اپنے مختلف صفحات میں تناسب کے اس قانون پر غور کرنے کے لیے کہتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی اثر اور معلول کے لیے کسی موثر کسی علت کا صرف فرض کر لینا کافی نہیں بلکہ علت ومعلول اور اثر وموثر میں تناسب کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ کسی مجذوب نے سچ کہا تھا کہ ”تم انگور سے ہاتھی کب تک ٹپکاؤ گے۔“

قانون ترتیب سے چشم پوشی:

کیسی عجیب بات ہے کہ اس عالم میں دیکھتے ہیں کہ آنکھیں بن رہی ہیں، چند خاص پردوں کے ساتھ بن رہی ہیں، ہر پردہ خاص قوانین کے تحت بن رہا ہے، یہی آنکھیں حیوانات میں بھی بن رہی ہیں، انسانوں میں بھی بن رہی ہیں، امریکہ میں بھی بن رہی ہیں، ایشیا میں بھی بن رہی ہیں، ہر جگہ ہر پردہ اپنے قوانین کے تحت بن رہا ہے الغرض جس چیز کو دیکھو گے اس میں ایک خاص قسم کی ترتیب، یک سانیت اور ہم واری نظر آئے گی اور کیسی ترتیب، کیسی ہم واری؟ بہ قول بعض ''فطرت کے قوانین کیا ہیں ایک بلیغ نظم، ایک ایسا موزوں شعر کہ اگر اس کا ایک لفظ بھی اپنی جگہ سے نکال دیا جائے تو سارا نظم شعری ہی بگڑ جاتا ہے۔'' یہی حال اس عالم کا ہے، کسی ایک چیز کو نکال کر دیکھو اور اندازہ کرو۔ بہرحال پوچھا جاتا ہے کہ یہ کس کی قدرت کے کرشمے ہیں؟ اب عقل کے ساتھ کیا یہ تمسخر نہیں ہے کہ اس کے جواب میں اس کا نام لیا جائے جس کو ہر قسم کی قدرت سے مفلس فرض کیا جاتا ہے۔

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ. (سورۂ ابراہیم: ۱۰)

قوانین فطرت کے استحکام اور ہمہ گیری سے غفلت:

آفتاب نکلتا ہے یا زمین گھومتی ہے، جو طریقۂ تعبیر بھی اختیار کیا جائے بہرحال ٹھیک چوبیس گھنٹوں میں یہ یومیہ دورہ ختم ہو جاتا ہے اور تین سو پینسٹھ دن اور کچھ منٹ وغیرہ میں یہ سالانہ گردش پوری ہوتی ہے، اور جس وقت تک کی تاریخ ہمارے پاس موجود ہے، معلوم ہے کہ اس وقت سے یہی ہوتا رہا ہے اور اب بھی یہی ہو رہا ہے اور ایک آفتاب اور زمین ہی کیا، عالم کی ہر چیز چند ایسے اٹل قوانین کی گرفت میں جکڑی ہوئی ہے کہ آج انہی کے اس استحکام پر ہمارے تمام علوم وفنون کی بنیاد ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ ان دقیق، نازک، مضبوط اور مستحکم ہمہ گیر قوانین کی باگ کس کے ہاتھ میں ہے؟ قرآن پاک اس کے جواب میں

ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ. (سورۂ حم سجدہ: ۱۲)

''یہ سب اس کے ناپنے اور جانچنے کا نتیجہ ہے جو ہر چیز پر غالب اور علم والا ہے۔''

کہتا ہے، بتاؤ انسانی عقل کی تشنگی اس سے بجھتی ہے، یا اس جواب سے کہ کہا جائے:

ذٰلِكَ اِتِّفَاقُ الْمَجْبُوْرِ الْجَاهِلِ. (یہ ایک لاچار اور علم وقدرت سے یکسر عاری مادّہ کے اتفاقی اثرات کا نتیجہ ہے)۔

اور سچ یہ ہے کہ اس قسم کی مضحکہ انگیز حماقتوں کا صدور ان ہی لوگوں سے ہوسکتا ہے جنھوں نے فطرت اور اس کے نازک استوار قوانین پر کبھی غور ہی نہیں کیا یا جن کی زندگی صرف فسق وفجور، مسخرگی اور اوباشی میں گزری ہو، ورنہ سچے سوچنے والوں نے ہمیشہ وہی کہا جسے پیغمبروں نے دیکھا۔ عہد جدید کا سب سے بڑا مفکر نیوٹن جس نے اپنے ایک معلوم کردہ قانون کے ذریعے انسانی سمجھ کا رخ پھیر دیا، قانون جذب و کشش کی تشریح کرنے کے بعد لکھتا ہے:

> ''کاینات کے اجزا میں باوجود ہزاروں انقلابات زمان و مکان کے جو ترتیب اور تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایسی ذات کے پایا جاسکے جو سب سے اوّل صاحب علم وارادہ وبااختیار ہو۔''

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورۂ انعام: ۴۵)

الحاصل نظامِ ہستی کا ایک خود بہ خود ہستی پر ختم ہونا، اس کا ہمیشہ ہمیشہ سے ہونا، ایک ہونا، اس کا ہر قسم کے اعلیٰ کمالات اور برتر وگرامی صفات سے موصوف ہونا ثابت ہوچکا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے متعلق پیغمبروں کے یہ ایسے ذاتی تجربے اور مشاہدے ہیں کہ عقل انسانی اس کے سوا کسی اور چیز کو مان بھی نہیں سکتی اور یہی وجہ ہے کہ چند ماؤف العقل پیشہ ور فلسفیوں کے سوا فطرت بشری قریب قریب ہر زمانے میں اور ہر ملک میں ایمان کے اس جز کے ساتھ متفق رہی ہے۔ پروفیسر میکس مولر نے دنیا کے قدیم آثار و شواہد کے مطالعے اور جستجو کے بعد اسی بنیاد پر اپنے اس تاریخی فیصلے کا اعلان کیا ہے کہ

''ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے خدا کو اس وقت جانا جس وقت وہ اس کا شاید نام بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔''

خدا کے متعلق ایک اور سوال:

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اصلی بحث اسی نقطے پر ختم ہو جاتی ہے، لیکن وسواسی انسان اسی پر بس کرنا نہیں چاہتا، وہ خدا کے متعلق کچھ اور سوالات بھی رکھتا ہے۔

دنیا کے عام مذاہب نے غالباً غیر ضروری سمجھ کر ان سوالات کو شاید نہیں چھیڑا، یا چھیڑا بھی تو اس کے مختلف پہلوؤں کو اتنا روشن نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے مختلف زمانوں میں بجائے وحی و نبوت کے عقل و حواس ہی کی اس روشنی میں ان سوالات کو حل کرنا چاہا، جو ہمیشہ ''عالم غیب'' میں جا کر گل ہو جاتی ہے۔ نظیروں اور مثالوں کی غلط رہنمائی نے مختلف غلطیوں کے خندقوں میں لوگوں کو گرادیا، مگر قرآن جو غیبی حقایق کی تشریح کی آخری روشنی ہے اس نے وضاحت کے ساتھ ان سوالات کو اٹھایا اور وہ جوابات دیے ہیں جنھیں فطرت و عقل بے چینی کے ساتھ، ڈھونڈھتی تھی۔ اس سلسلے میں جو کچھ کہا جائے گا ممکن ہے کہ ڈھونڈھنے سے دوسرے مذاہب کی الہامی یادداشتوں میں بھی اس کے متعلق کچھ تسلی مل سکے، لیکن جہاں تک میری جستجو کا تعلق ہے قرآن کریم کا بیان اس باب میں جتنا روشن ہے یقیناً یہ روشنی کسی دوسری جگہ میسر نہیں آسکتی۔

خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟

پہلا سوال یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وجود کے سرچشمے سے ہر لحظہ اور ہر لمحہ جو گونا گوں موجیں علویات و سفلیات، جمادات و نباتات، حیوانات و انسان وغیرہ کی شکل میں پیدا ہوتی ہیں اور ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی آخر ان کی پیدایش کی نوعیت کیا ہے؟ اسی سوال کی اجمالی تعبیر یہ ہے کہ

''خدانے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟''

تقریباً یہ سوال ہر اس دل میں پیدا ہوتا ہے جو اس عالم کی انتہا خدائے قدوس پر ختم کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک فطری سوال تھا، لیکن اسی کے ساتھ کیا یہ بھی غیر فطری راہ نہیں تھی کہ بجائے وحی ونبوت کے اس سوال کا جواب عقل وحواس سے طلب کیا جائے، انسان نے ظلم کیا کہ اپنے محدود معلومات ومشاہدات کو سامنے رکھ کر اس کا جواب دینا چاہا، اس کے بعد غلط جوابوں کا جو طلسم قایم ہوا وہ عجیب وغریب تھا اور یہی وہ طلسم ہے جس کی تعبیر مذہبی دنیا میں ''مسئلۂ وحدۃ الوجود [1]'' سے کی جاتی ہے۔

---

[1] تعبیروں کی غلطی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک قابل احترام سنجیدہ گروہ میں وحدت الوجود کا لفظ قریب قریب ہوَے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ابن خلدونؒ جیسے متبحر وانصاف پسند عالم نے اپنے مشہور علمی مقدمہ میں ''وحدت الوجود'' کی تشریح میں جو الفاظ نقل کیے ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ کاینات کی ان گونا گونیوں کو صوفیہ صرف نظر کا دھوکا اور انسانی احساس کا ایک غیر واقعی تاثر قرار دیتے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ دنیا سے اگر انسان اور اس کے احساسات غایب ہو جائیں تو وحدۃ الوجود والوں کے نزدیک عالم کا یہ نظام بھی باقی نہ رہے گا۔ لکھا ہے کہ ''خواب میں خواب دیکھنے والوں کو سب کچھ نظر آتا ہے لیکن واقع میں کچھ نہیں ہوتا۔'' وحدۃ الوجود والوں کے نزدیک یہی حال بیداری کا بھی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

یَعْتَبِرُوْنَ ذَالِكَ بِحَالِ النَّائِم فَاذَا نَامَ وَفقد الْحِسّ فقد كُلُّ مَحْسُوْسٍ.

''جب گھر والوں کی بدگمانیوں کا یہ حال ہو، تو غیروں کا کیا گلہ کیجیے۔ آیندہ معلوم ہوگا کہ غلط فہمیوں کے سوا یہ اور کچھ نہیں ہے۔''

باب چہارم:

مسئلہ وحدۃ الوجود کی حقیقت

وحدۃ الوجود کی ایک عام فہم مگر غیر صحیح توجیہ:

وحدۃ الوجود کے ایک تو سیدھے سادہ معنی یہ ہیں کہ نظامِ ہستی کی بنیاد دو وجودوں مثلاً یزداں واہرمن یا خدا اور مادّہ پر نہیں بلکہ صرف ایک خدا پر قایم ہے۔ سب چیزیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں اور اسی پر ختم ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وحدت الوجود کا اگر یہی مطلب ہے تو خدا کے ماننے والوں میں ایسا کون ہے جو اس کا انکار کرسکتا ہے [1]؟ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ لوگ جواب کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اس جواب سے وہ کس سوال کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ پس جیسا کہ میں نے عرض کیا مسئلۂ وحدۃ الوجود اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ ''عالم ایک وجود سے پیدا ہوا ہے یا دو سے؟'' بلکہ یہ مسئلہ دراصل اسی سوال کا جواب ہے جسے میں نے عنوان میں درج کیا ہے یعنی ''خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟''

قبل اس کے کہ اس باب میں قرآنی تشریح کو پیش کروں، ان غلط تاویلوں کا پیش کرنا مناسب ہے جن کی وجہ سے عموماً اس مسئلے کی جانب سے لوگوں میں غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ سوال کے متعلق تو معلوم ہو چکا وہ صرف اس قدر ہے کہ خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟ ظاہر ہے کہ انسان اور انسان کے علمی ذرایع، عقل وحواس نہ اس وقت موجود تھے جس وقت کاینات کی بنیاد پڑی، نہ اس وقت عالم کے اس سرچشمے تک

---

[1] بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ وحدۃ الوجود کے یہ وہ معنی ہیں جس کے اقرار پر وہ بھی مجبور ہوئے ہیں۔ جنھوں نے عالم کا سرچشمہ بجائے خدائے حی وقیوم کے مادّہ کو ٹھیرایا ہے۔ آخر مادّہ پرستوں کا خیال اس کے سوا اور کیا ہے کہ عالم میں جو کچھ ہے صرف ایک ہی ہستی اور ایک ہی وجود یعنی مادّہ ہی کی یہ نیرنگیاں ہیں۔ بھلا اس سے بھی زیادہ کوئی بدیہی مسئلہ الٰہیات کا ہوسکتا ہے جس کے ماننے پر مادّہ پرستوں کے دل ودماغ بھی مجبور ہیں؟

ان کی رسائی ہے جہاں سے نت نئی ہستیاں مختلف صفات وکمالات کو لے کر برآمد ہو رہی ہیں۔ اب جو صرف عقل وحواس کے ذریعے اس سوال کو حل کرنا چاہے گا تو اس کے لیے بجز اس کے اور کیا چارہ کار ہے کہ اپنے محدود معلومات کو سامنے رکھ کر مثالوں اور تشبیہوں سے اس کا جواب دے اور یہی کیا بھی گیا۔ مختلف نظیروں کو سامنے رکھ کر مختلف لوگوں نے جوابات دیے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں۔

بعض غلط تر تشریحیں اور تشبیہیں:

بعضوں نے کہا کہ (معاذ اللہ) خدا کی مثال ایک انڈے کی سی تھی اور جس طرح انڈا پھٹ کر مرغی بن جاتا ہے اس طرح خدا بھی پھٹ کر عالم بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کے فلسفہ ویدانت کی تعبیر ہے۔ وید کی ایک مشہور عبارت سے اس کی تائید پیش کی جاتی ہے۔ یجر وید میں لکھا ہے:

> ''اس پرماتما کی نابھی (ناف) سے درمیانی عالم، سر سے بالائی عالم، پاؤں سے زمین اور کانوں سے سمت بن گئے۔ اسی طرح وہ سب لوگوں کو پیدا کرتا رہتا ہے۔'' (یجر وید ادھیائے نمبر ۲۱)

یہ اور اسی قسم کی اور بھی تشبیہیں ہیں جو عوام الناس میں مشہور ہیں۔ مثلاً خدا اور عالم کی باہمی نسبت کو کبھی دریا اور موج اور کبھی عنکبوت اور اس کے تار اور کبھی سیاہی اور حروف وغیرہ [1] سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن سے بہ ظاہر یہ خیال گزرتا

---

[1] مطلب یہ ہے کہ مکڑی جس طرح باہر سے نہیں بلکہ اندر سے رطوبت خارج کرتی ہے اور اسی سے اپنے اردگرد جالا تنتی ہے یوں ہی (العیاذ باللہ) خدا نے بھی اپنے اندر سے بعض اجزا خارج کیے۔ انہی سے عالم بنایا، سیاہی اور حروف والے کہتے ہیں کہ مختلف حرف مثلاً الف با یا تا اگرچہ اپنی صورتوں اور خصوصیتوں کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں، لیکن سیاہی سب ہی میں مشترک ہے، یوں ہی جمادات و نباتات، حیوانات وانسان وغیرہ گو اپنی اپنی صورتوں اور خصوصیتوں کے لحاظ سے مختلف ہیں، لیکن خدا یا وجود ان سب میں مشترک ہے، بعض یوں بھی کہتے ہیں کہ اعداد کے مراتب اگرچہ مختلف ہیں لیکن اکائی سب میں مشترک ہے، یہی حال خدا کا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں خدا اور عالم کے صحیح تعلق کو واضح نہیں ◄

ہے کہ ان تشبیہوں والے فلسفۂ ویدانت کی اتباع میں گویا اس کے قایل ہو گئے ہیں کہ خدا یا اس کا کوئی حصہ عالم بن گیا ہے۔ حالاں کہ عیاذاً باللہ اگر ایسا واقعہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ خدائے کامل و قادر حیّ و قیوم آخر کیا ہوا کہ وہ خود بیٹھے بٹھائے بغیر کسی مجبوری کے ناقص و مجبور اور معذور بن گیا؟ دکھ، درد، گندگی و ناپاکی اور ہر قسم کے عیوب میں لتھڑ گیا، جو کامل تھا ناقص ہوگیا، جو زندہ تھا مردہ بن گیا، پاک تھا ناپاک ہوگیا؟ کیوں کہ عالم اور اس کے اجزا کا تقریباً یہی حال ہے۔

معاذ اللہ خدا غایب:

بلکہ اگر زیادہ غور کیا جائے تو گویا اس صورت میں یہ بھی لازم آتا ہے کہ جب تک عالم نہ تھا اس وقت تک تو خدا موجود تھا لیکن جب عالم پیدا ہوگیا تو خدا غایب ہوگیا۔ آخر مرغی یا درخت کے پیدا ہونے کے بعد کیا انڈا یا تخم باقی رہتا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس مذہب کا خدا ہی معدوم ہوگیا وہ مذہب، مذہب اور دھرم کہلانے کا مستحق کس طرح ہو سکتا ہے؟ نہ معلوم ایسے مذاہب میں کس کی پوجا کی جاتی ہے اور کس کے احکام و قوانین کی پابندی کو فرض ٹھیرایا جاتا ہے۔

خدا کے مخلوق ذہنی ہونے کا نظریہ:

اسی سلسلے میں بعضوں کا بیان ہے کہ خدا ایک وجود کلی ہے اور عالم اس کی

➤ کرتیں۔ مکڑی والی تشبیہ میں لازم آتا ہے کہ خدا کو مختلف اجزا سے مرکب مانا جائے، دریا اور موج والی مثال بھی اسی لیے سمجھ میں نہیں آتی کہ دریا طول و عرض اور عمق رکھتا ہے، اسی لیے تقسیم کو قبول کرتا ہے اور اسی لیے اس کے جس جزو میں ایک موج بنتی ہیں وہ اس جزو سے مختلف ہوتا ہے جس پر دوسری موج کی ہیئت قایم ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا سیاہی کو حروف میں مشترک قرار دینا بھی مغالطہ ہے۔ سیاہی کے مختلف اجزا اور قطرات سے مختلف حروف بنتے ہیں، اس لیے جس قطرہ سے مثلاً الف بنتا ہے وہ اس قطرہ سے مختلف ہوتا ہے جس سے با تا وغیرہ حروف لکھے جاتے ہیں، یوں ہی اعداد اکائیوں کے مجموعے کا نام ضرور ہے لیکن دو میں اگر دو اکائی ہوتی ہیں تو تین میں تین، پھر کیا عالم میں بھی ہر ہستی کے ساتھ خدا کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے؟ دراصل یہ ناقص تشبیہات ہیں، جن سے لوگ مغالطے میں مبتلا ہوئے۔

جزئیات وتفصیلات کا نام ہے۔ اس کو یوں سمجھایا جاتا ہے کہ مثلاً انسان ایک کلی یا حقیقت مطلقہ ہے، جس طرح اس کا تحقق یعنی پایا جانا زید وعمر وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے اسی طرح خدا بھی عالم کے مختلف افراد کی شکل میں رونما ہوا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس تشبیہ کے لحاظ سے خدا کوئی واقعی ہستی باقی نہیں رہتا، جس طرح مختلف افراد مثلاً زید وعمر کے اشتراکی اوصاف کو پیش نظر رکھ کر ایک مفہوم مشترک ان سب سے پیدا کرلیا جاتا ہے، جس کا وجود بجز ذہن کے اور کہیں نہیں ہوتا، گویا خدا بھی اسی طرح ہمارے ذہن کا ایک خودتراشیدہ مفہوم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بنیاد پر خدا خالق نہیں بلکہ ہمارے ذہن کی ایک خودتراشیدہ مخلوق بن جاتا ہے۔

معمار کمہار کی تمثیل:

اس سوال کے حل کی ایک راہ وہ ہے جو گزشتہ مثالوں میں دکھائی گئی، اس کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت ہے جو اسی مسئلے کا جواب اس مثال سے دینا چاہتی ہے کہ جس طرح صانع مصنوعات کو بناتا ہے، مثلاً معمار مکان، یا کمہار برتن بناتا ہے، گویا اسی طرح خدا نے عالم کو بنایا ہے۔ عوام کے ذہن میں عالم اور خدا کی باہم نسبت کے متعلق کچھ اسی قسم کا خیال ہے۔ اس پر کھلا ہوا سوال ہوتا ہے کہ صانع مصنوع کو بغیر مادہ کے پیدا نہیں کرسکتا، کمہار بغیر مٹی کے، نجار بغیر لکڑی کے کیا اپنی صنعتی قوت کا اظہار کرسکتا ہے؟ اور جب خدا اسی طرح کا صانع ہے تو اس نے بغیر مادہ کے کس طرح عالم کو بنایا؟ ہندو فلاسفروں کی ایک جماعت نے اسی بنیاد پر یہ مان لیا کہ ابتدا میں صرف خدا نہ تھا بلکہ خدا کی طرح مادّہ بھی خود بہ خود موجود تھا، اسی مادہ سے خدا نے عالم کو پیدا کیا۔ آریہ کے نام سے اس زمانے میں ہندوؤں میں جو ایک فرقہ پیدا ہوا ہے اس نے قدیم ہندی فلسفے کے اسی مکتب خیال کو اپنا مذہبی عقیدہ قرار دیا ہے۔

لیکن یہ خیال اتنا مہمل ہے کہ فلسفہ اور مذہب کی کسی جماعت میں بھی اس خیال نے اعتماد پیدا نہیں کیا۔ فلسفہ والے تو یہ کہتے ہیں کہ جب ابتدا میں مادّہ کو مان لیا گیا تو اب عالم کی پیدائش کے لیے خدا کا وجود فالتو ہو جاتا ہے۔ اسی لیے یورپ کے مادئین

صرف اسی کے قایل ہو گئے اور مذاہب چوں کہ توحید کے حامی ہیں اس لیے ان کے لیے مشکل ہے کہ مادّہ کو خدا کی مخلوقیت سے نکالیں۔ کیوں اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب مادہ ہی خدا کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے تو مادّہ کی مختلف صورتیں جن کا نام عالم ہے اُس کو خدائی مخلوق کہنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ پھر قطع نظر اس کے اگر عالم اور خدا میں وہ نسبت مان لی جائے جو صانع اور مصنوع میں ہے تو یہ ایک مشاہدہ ہے کہ صانع یعنی معمار کے مر جانے کے بعد مصنوع یعنی مکان معدوم نہیں ہوتا یعنی مصنوعات کے موجود اور پیدا ہو جانے کے بعد صانع کا وجود بے ضرورت ہو جاتا ہے۔ پس اس نظریے کی بنیاد پر کہ عالم خدا نے اس طرح پیدا کیا جیسے معمار مکان بناتا ہے، یہ لازم آتا ہے کہ پیدایش عالم کے لیے ممکن ہے کہ ابتدا میں دنیا کو خدا کی ضرورت ہو لیکن اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، حالاں کہ تمام مذاہب عالم کو بہر نوع خدا کا محتاج ہر حال اور زمانے میں قرار دیتے ہیں۔

اسلامی وحدۃ الوجود یا مسئلۂ قیومیت:

وہی سوال کہ خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟ اس کے جوابات تم سن چکے، جو غیر اسلامی دایروں سے دیے گئے۔ اب آؤ اور دیکھو کہ قرآن اس کا کیا جواب دیتا ہے۔ قبل اس کے قرآنی تصریحات کو پیش کروں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسئلے کے اندر پیچیدگی کیوں پیدا ہوگئی؟ بات یہ ہے کہ انسان میں جہاں اور بہت سی فطری خصوصیات ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ بغیر نظیر اور مثال کے کسی چیز کے ماننے میں اسے سخت دشواری پیش آتی ہے۔ یوں ماننے کے لیے کہا جائے تو جبراً قہراً آدمی سب ہی کچھ مان سکتا ہے اور مان لیتا ہے، لیکن اطمینان و تشفی کے لیے وہ نمونہ اور مثال و نظیر کا بالکلیہ محتاج ہے۔ اسی مسئلے میں دیکھیے! واقعہ تو یہی ہے کہ مسلمان ہو یا ہندو، عیسائی ہو یا یہودی، الغرض کسی مذہب کا آدمی ہو، نہ تو کوئی پیدایش عالم کے بعد خدا کو معدوم سمجھتا ہے، نہ خیال کرتا ہے کہ وہ گندگیوں، نجاستوں اور عیوب و نقایص میں مبتلا ہو گیا ہے، حتیٰ کہ آریوں کے سوا کوئی سچا ہندو بھی یہ نہیں مانتا کہ مادہ عالم کا خالق خدا نہیں ہے،

بلکہ سب کے سب کاینات کی تمام کثرتوں کو ایک ہستی واحد پر ختم کرتے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب کا اس پر اتفاق ہے، لیکن بہ ایں ہمہ جب آفرینش عالم کی کیفیت کے متعلق سوال اٹھا تو انھوں نے غلط مثالوں اور نظیروں کے ذریعے سے اس کو حل کرنا چاہا، جن سے ان پر ایسے الزامات قایم ہو گئے جن کے خود وہ قایل نہیں ہیں۔ انہی ''یجر وید'' کی عبارت گزری جس میں بہ ظاہر خدا کو تخم فرض کر کے عالم کے درخت کو اس سے اگایا گیا ہے، اس کے بعد لازم آتا تھا کہ پیدایش عالم کے بعد خدا غایب ہو گیا، لیکن یجر وید کے اسی فقرے کے آخر میں ''اسی طرح وہ سب کو پیدا کرتا رہتا ہے۔'' اس کا اضافہ کر کے صاف صاف ظاہر کر دیا گیا کہ خدا عالم کو پیدا کرنے کے بعد بھی اس طرح موجود ہے جس طرح اس سے پیشتر تھا۔

قرآن کا خاص طریقہ:

لیکن قرآن نے اس قسم کے مسایل میں رہنمائی بخشنے کے لیے ایک کلیہ ہمارے لیے پیش کر دیا ہے۔ مشہور صوفی شاعر مغربی نے اسی کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

چو نیست چشم دلت تا جمال او بینی
نگر بہ صورت خود تا مثال او بینی

ان کا اشارہ قرآن کی اس حقیقت کی طرف ہے کہ ''خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ اور نمایندہ قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک ''حدیث شریف'' میں اسی کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ

خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ ❶۔

مطلب یہ ہے کہ خدا کے افعال و صفات کی مثال اگر مل سکتی ہے تو باہر نہیں بلکہ

---

❶ ''پیدا کیا اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر۔'' واضح رہے کہ یہاں صورت سے مراد وہی ہے جو میں نے متن میں عرض کیا ہے کہ انسان اس عالم میں خدا کے افعال و صفات کا ایک نمونہ ہے، نہ کہ معاذ اللہ جسمانی اور مادی صورت کہ وہ اس سے وراء الوراء ہے۔ نیز حدیثوں کے سوا یہ فقرہ بائبل میں بھی پایا جاتا ہے۔

آدمی کے اندر ہی کچھ مل سکتی ہے۔ مرزا بیدل نے سچ کہا ہے ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو وسمن درآ
تو زغنچہ کم ندمیدہ دردل کشا بچمن درآ

پس یہ اہم سوال کہ خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟ اس کے جواب کے لیے بھی بجائے بیرونی مثالوں اور خارجی نظیروں کے یہ مناسب ہوگا کہ ہم اپنے ''تخلیقی افعال واعمال'' پر غور کریں۔ عام مسلمانوں نے ایک حد تک یہی کیا بھی ہے، لیکن انھوں نے خلق (پیدا کرنا) اور صنعت (بنانا) میں فرق نہیں کیا۔ خدا کس طرح خلق کرتا یا پیدا کرتا ہے؟ اس سوال کو انھوں نے اس مثال سے حل کرنا چاہا کہ انسان کس طرح بناتا ہے اور گو وہ خود اس کے قایل نہیں ہیں کہ عالم اور خدا میں وہ نسبت ہے جو معمار اور مکان میں ہے۔ ہر مسلمان یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اس کو رکھنا چاہیے کہ جس طرح عالم اپنی پیدایش میں خدا کا محتاج ہے اسی طرح اپنی بقا میں بھی ہر وقت ہر لحظہ وہ خدا کا دست نگر ہے، لیکن انھوں نے جو مثال دی ہے اس سے لازم آجاتا ہے کہ عالم صرف اپنے بننے میں خدا کا محتاج ہو، بننے کے بعد اب اسے خدا کی اسی طرح ضرورت نہ رہی جس طرح مکان کو معمار کی نہیں رہتی ہے۔

اپنے خیالی عمل تخلیق فی الذہن پر غور کرو:

پس اصل یہ ہے کہ اگر کوئی اس سوال کو حل کرنا چاہتا ہے تو اس پر غور کرنا چاہیے کہ انسان اپنی ''مخلوقات'' کو کس طرح پیدا کرتا ہے؟ شاید لوگوں کو تعجب ہو کہ کیا انسان بھی کوئی چیز پیدا کرتا ہے یا کرسکتا ہے؟ آپ کو یاد ہوگا ابتدا میں میں نے ہی آپ کو بتایا تھا کہ ''انسان صرف جان سکتا ہے، کسی چیز کے پیدا کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے۔'' مگر سچ یہ ہے کہ انسان کے تمام اندرونی افعال پر ابھی غور نہیں کیا گیا۔ یہ درست ہے کہ باہر کی چیزوں کے حساب سے انسان ان پر صرف صنعتی عمل ہی کرسکتا ہے، قوانین فطرت کو جان کر ان کی صلاحیتوں کو کھول سکتا ہے، مثلاً وہ پتھر پیدا نہیں کرسکتا، لیکن پتھر میں مورت یا صورت بننے کی جو صلاحیت ہے اسے وہ پتھر اور لوہے

کے قوانین جاننے کے بعد ظاہر کرسکتا ہے۔

یہ تو باہر کا حال ہے (اور اسی لحاظ سے میں نے پہلے وہ بات کہی تھی) مگر اب اس کے اندرونی افعال پر غور کرو، انسان جب عالم خیال میں عمل کرتا ہے اس وقت سوچو کہ وہ کیا کرتا ہے؟ دیکھو! نہ اینٹ ہوتی ہے نہ چونا، نہ پتھر ہوتے ہیں نہ اور کچھ، لیکن آدمی چاہتا ہے کہ میں مثلاً چار مینار ❶ کو (ذہن کی دنیا میں) پیدا کروں، ارادہ کرتا ہے اور چار مینار کو اپنے سامنے کھڑا پاتا ہے اور اسی طرح اپنے علم میں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی ہر قسم کی چیزوں کو وہ پیدا کرتا ہے۔

دماغوں میں تصویریں چھپنے کا سلسلہ:

احمقوں کا گروہ ہے جو خیال کرتا ہے کہ دیکھنے کے بعد مثلاً چار مینار کا عکس ہمارے دماغ میں چھپ جاتا ہے اور جب ہم التفات کرتے ہیں تو وہی عکس ہمارے سامنے آجاتا ہے، لیکن کاش وہ سوچتا کہ اگر چار مینار کا عکس ہمارے دماغ میں اترتا ہے تو انسانی بھیجے کی تشریح و تحلیل سے یہ عکس اس سے کیوں برآمد نہیں ہوتا؟ اگر واقعی دماغ میں تصویروں کے چھپنے کا سلسلہ جاری ہے تو ایک کھوپڑی کے توڑنے کے بعد چاہیے کہ تصویروں کا ایک انبار ہمارے دماغوں سے ابل پڑے، حالاں کہ یہ مشاہدے کے خلاف ہے اور یہی نہیں انطباع کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ ایک پلیٹ یا ایک چیز پر جب کسی چیز کی تصویروں کے باہمی اختلاط سے دونوں ہی کی اصل بگڑ جائے گی۔ حالاں کہ عالم خیال (یا علمی عالم) میں ہر ایک چیز دوسری سے ممتاز اور اپنی اصلی حالت میں محسوس کی جاتی ہے۔ یہ عجیب لوگ ہیں، اتنا بھی خیال نہیں کرتے کہ ہم قوت تخیل سے جب چار مینار کو اپنے ذہن میں پیدا کرتے ہیں تو وہ اپنی وسعت کے

---

❶ یہ حیدر آباد کی ایک مشہور تاریخی عمارت کا نام ہے، اس کی تاریخیت ہی کا یہ اثر ہے کہ سلطنت آصفیہ کے طلائی و نقرئی سکوں پر اسی عمارت کی تصویر طبع ہوتی ہے۔ طلبائے جامعۂ عثمانیہ قدرتاً اس عمارت سے مانوس ہیں۔ اسی لیے درس میں تفہیم کے لیے اسی عمارت کا انتخاب کیا گیا۔ عام قارئین بجائے چار مینار کے کسی اور عمارت یا چیز کو فرض کر سکتے ہیں۔ ۱۲ منہ عفی عنہ

لحاظ سے سیکڑوں گز کی لمبی چوڑی عمارت ہوتی ہے، پھر کیا چند انچ کے دماغ میں اتنی لمبی چوڑی وسیع وکشادہ عمارت سما سکتی ہے؟

پس واقعہ یہ ہے کہ چھپنے اور انطباع کا قانون قطعاً ایک بازاری اور عامیانہ خیال ہے۔ بلکہ صحیح بات وہی ہے جیسا کہ فلاسفۂ اسلام اور صوفیہ ❶ کا نظریہ ہے کہ انسان کو جب کسی چیز کا علم حواس کے ذریعے سے ہوتا ہے تو اس علمی اثر کے بعد انسان میں اس کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی معلوم کی ہوئی شے کو اپنی خیالی قوت سے پیدا کرے اور یہی انسان کا ''تخلیقی عمل'' ہے۔ تفہیم کے لیے ہم اپنی اصطلاح میں اس تخلیقی قوت کا ایک نام ''کُن فیکونی قوت'' رکھتے ہیں ولا مشاحة فی الاصطلاح.

قرآن کا بیان ہے کہ اس کُن فیکونی قوت سے خدا بھی اپنی مخلوقات کو پیدا کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّمَا اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

(سورۂ یٰسین:۸۲)

''اس کا کام یہ ہے کہ جب کسی چیز کے متعلق ارادہ کیا تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے۔''

اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے خیالی اور علمی یا ''کُن فیکونی مخلوقات'' سے جس قسم کے تعلقات انسان کے ہوتے ہیں قرآن پاک نے ان سارے روابط کو خدا اور عالم کے درمیان ثابت کیا ہے۔ میں ان تعلقات اور نسبتوں میں سے بعضوں کو یہاں درج کرتا ہوں۔

① پہلا تعلق: قرآن کا دعویٰ ہے کہ حق تعالیٰ نے عالم کو بغیر مادہ کے پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ

---

❶ شیخ اکبر اپنی کتاب فصوص الحکم میں فرماتے ہیں۔ بالوهم يخلق كل انسان فى قوة خياله مالا وجود له الا فيها وهذا هو الامر العام۔ فتوحات مکیہ، اسفار اربعہ وغیرہ میں اس مسئلے کی تفصیلات پڑھیے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (سورۂ بقرہ:۱۱۷)

''نیا پیدا فرمانے والا آسمان اور زمین کا۔''

کے قرآنی الفاظ کا اقتضاء یہ ہے اسی کی تفسیر حدیث میں ہے کہ

كَانَ اللّٰهُ وَلَنْ يَّكُنْ مَّعَهٗ شَيْءٌ.

جس کے معنی یہی ہیں کہ آسمان وزمین کچھ نہ تھے اور پھر پیدا ہو گئے۔

حاصل یہ ہے کہ ابتدا میں خدا کے سوا کچھ نہ تھا یعنی مادّہ وغیرہ کچھ نہیں تھا اور پھر خدا نے قوتِ کُن سے اس عالم کو پیدا کیا۔ٹھیک جس طرح ہمارے خیال یا (علم) میں کچھ نہیں ہوتا ہے پھر محض اپنے ارادۂ کُن سے اپنے معلومات کو ہم وجود عطا کرتے ہیں۔پس اگر خدا نے بھی ایسا ہی کیا تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

② اسی طرح قرآن کا بیان ہے کہ

وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ. (سورۂ نحل:۷۷)

موجودہ نظام عالم کی بربادی کے لیے (یا قیام قیامت کے لیے) پلک جھپکانے بلکہ اس سے بھی کم زمانے کی ضرورت ہے۔''

ہم بھی جب اپنے خیال اور علمی مخلوق مثلاً اسی چار مینار کو جسے خیال میں پیدا کرتے ہیں اگر برباد کرنا چاہیں تو اس کے لیے لَمْحِ بَصَرْ (پلک جھپکانے) سے زیادہ وقت کی ضرورت نہیں صرف توجہ کا ہٹالینا کافی ہے۔توجہ ہٹا لینے کے ساتھ ہی ہمارے خیالی مخلوقات معدوم ہو جاتے ہیں اور بغیر کسی مادّہ چھوڑنے کے معدوم ہو جاتے ہیں۔

③ ہماری خیالی اور علمی مخلوق مثلاً چار مینار جس طرح پیدا ہونے میں ہمارے ارادے اور توجہ کی محتاج ہے ٹھیک اسی طرح ہر لحظہ اور ہر لمحہ اپنے قیام و بقا میں بھی ہماری توجہ اور التفات کی وہ دست نگر ہے۔یہی قرآن کا بھی بیان ہے کہ خدائے تعالیٰ عالم کا صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ قیوم بھی ہے،یعنی وہی اسے تھامے ہوئے ہے (یعنی عالم اسی سے قایم ہے)۔

اگر ادنیٰ التفات اس کی طرف سے ہٹالے تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔

جیسا کہ ارشاد ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ.

(سورۂ بقرہ:۲۵۵)

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے (یعنی مردہ مادّہ نہیں ہے)، قیوم ہے، (یعنی عالم کو تھامے ہوئے ہے۔ ایسا خالق نہیں ہے جیسا کہ معمار مکان کا یا صانع مصنوع کا، بلکہ وہ خالق قیوم ہے)، اسے نہ غنودگی پکڑتی ہے اور نہ نیند چھوتی ہے (کیوں کہ اگر ایسا ہو تو نظام عالم قایم نہیں رہ سکتا)۔"

خیال میں کسی مخلوق کو پیدا کر کے اگر کوئی اونگھ جائے یا سو جائے تو اس کی یہ پیدا کی ہوئی مخلوق کیا باقی رہ سکتی ہے؟

④ اب اس پر غور کیجیے کہ مثلاً زید اپنی "کن فیکونی قوت" سے عالم خیال میں جس وقت چار مینار کو پیدا کرتا ہے، کیا زید چار مینار ہو جاتا ہے یا چار مینار زید بن جاتا ہے؟ ہم بالبداہتہ جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے [1]۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کو سوچیے کہ اس خیالی اور علمی چار مینار کا وجود زید کے وجود اور ارادے سے کیا جدا ہے؟ اس کے ہونے کے معنی بجز اس کے اور کیا ہیں کہ اس کا ارادہ اس کی توجہ اس کی طرف ہے، یہ نہ ہو تو چار مینار کی نہ دیواریں ہوں نہ محراب اور نہ مینار..... تو اسی طرح سمجھیے کہ نہ عالم خدا بن گیا ہے نہ خدا عالم بن گیا ہے، لیکن عالم کا وجود بجز اللہ کے وجود اور ارادے کے کچھ نہیں ہے۔

⑤ اس پر بھی غور کیجیے کہ آپ جس وقت اپنی خیالی مخلوق کو ذہن میں پیدا کرتے

---

[1] آخر خود غور کرنا چاہیے کہ اپنے ذہن میں جو کوئی مثلاً گدھے کا تصور کرتا ہے کیا اس وقت وہ گدھا بن جاتا ہے یا گدھا وہ ہو جاتا ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ پس خالق قیوم کے متعلق بھی یہ باور کرنا کہ قیومی نسبت کی وجہ سے وہی عالم ہے اور عالم وہی ہے، اپنی ہی حماقت ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک علوا کبیرا۔

ہیں کیا اپنے آپ **کو** اس خیالی مخلوق کے کسی فوقانی، تحتانی، ظاہری و باطنی حصے سے غایب پاتے ہیں؟ **غور کیجیے** کہ آپ جس طرح اپنے کو اس کی دیواروں کی جڑ کے پاس پاتے ہیں اسی طرح اس کے میناروں پر بھی یقیناً پائیں گے، آپ کو جو نسبت اس کے ظاہر سے ہے اس کے باطن سے بھی وہی نسبت آپ کو ہوگی۔ قرآن یہی کہتا ہے کہ خالق قیوم عالم کے اوّل میں بھی ہے اور آخر میں بھی ہے، باطن میں بھی۔ ارشاد ہے:

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (سورۂ حدید:۳)

''وہی اوّل ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے اور وہی ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

کہیں فرمایا جاتا ہے کہ خدا عرش پر ہے، کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ انسان کی رگ گردن کے پاس بھی ہے۔ خود ہی غور کیجیے ایک خالق اور اس کی مخلوق میں اس کے سوا اور نسبت ہی کیا ہوتی ہے؟ آخر آپ بھی تو اپنے آپ کو اپنے خیالی چار مینار کے کنگروں پر بھی پاتے ہیں اور اس کی دیوار کی جڑوں کے پاس بھی، پھر اگر اس عالم کا خالق اگر عرش پر بھی ہو اور آپ کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہو تو اس کے سوا اور عقل سوچ ہی کیا سکتی ہے؟

⑥ اب دیکھیے! چار مینار ایک طویل وعریض عمارت ہے، آپ اپنے ذہن میں جس وقت اسے پیدا کرتے ہیں اس کے طول وعرض کے ساتھ پیدا کرتے ہیں، اس لمبائی اور چوڑائی کے باوجود آپ اپنے کو کیا اس کے ذرّے ذرّے پر محیط نہیں پاتے؟ لیکن کیا اگر اس ذہنی چار مینار کو آپ دو حصوں میں تقسیم کر دیں گے تو اس کی تقسیم کی وجہ سے آپ کے بھی دو حصے ہو جاتے ہیں؟ قطعاً نہیں، قرآن بھی یہی کہتا ہے:

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۝

''اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہیں۔''

لیکن اس احاطے کی وجہ سے خدا کی ذات میں کوئی تقسیم اور تجزی نہیں ہوتی۔

⑦ اسی طرح آپ اپنے ذہنی وعلمی چار مینار کے کسی مینار کو توڑ دیجیے یا اس کے کسی حصے میں کوئی گندگی، نجاست وغیرہ مثلاً فرض کیجیے پھر کیا اس شکست وریخت اور اس گندگی ونجاست کا اثر آپ پر بھی مرتب ہوتا ہے؟ یقیناً نہیں، پھر اگر قرآن خدا کو عالم کی ہر چیز کے ساتھ ہر جگہ مانتا ہے لیکن باوجود اس کے عالم کے کسی تغیر، کسی عیب ونقص کا اثر خدا کی ذات پر نہیں پڑتا تو کیا ''کن فیکونی مخلوقات'' کے ساتھ خالق کے تعلقات کی یہی نوعیت نہیں ہوتی؟

⑧ آپ جس وقت اپنے ذہن میں کسی پہاڑ یا کسی شہر کو پیدا کرتے ہیں کیا اس ذہنی، خیالی یا علمی مخلوق میں کسی دوسرے کے ارادے سے کوئی چیز اپنی جگہ سے ہل سکتی ہے؟ غور کیجیے اس کا ہر ذرہ آپ ہی کی مرضی اور آپ ہی کے ارادے کا پابند ہے، دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

پس مذہب بھی اگر یہی کہتا ہے کہ

اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ. (سورۂ یونس: ۱۰۷)

''اگر چھوئے اللہ تجھے کسی ضرر کے ساتھ پر اسے کوئی کھولنے والا نہیں لیکن وہی اور اگر ارادہ کرے تیرے ساتھ بھلائی کا کوئی اس کی مہربانی کا پلٹانے والا نہیں۔''

یعنی اس عالم کے کسی حصے میں کوئی واقعہ بھی ہو بغیر ارادہ واذن حق کے نہیں ہوسکتا اور کسی دوسرے کا تصور یا ارادہ یا فعل اس میں قطعاً موثر نہیں ہوسکتا، تو کیا عقل اس کے سوا کچھ اور بھی سوچ سکتی ہے؟

⑨ آپ جب خیالی چار مینار کو پیدا کرتے ہیں تو جہاں آپ ہوتے ہیں کیا چار مینار بھی وہیں نہیں ہوتا؟ جب ایسا ہے تو خدا نے جب عالم کو پیدا کیا اور خدا اس کا خالق اور وہ اس کا مخلوق ہے تو اس کے بعد یہ سوال کتنا بے معنی ہوجاتا ہے کہ عالم کہاں ہے اور خدا کہاں ہے؟

یہ سچ ہے کہ ایک ہی نوعیت یا ایک ہی ظرف کے دو وجود یعنی دو مخلوق یا اگر دو خالق فرض کیے جا سکتے ہوں تو ایسے دو ہم ظرف ❶ وہم مثل وجودوں کی ایک ہی فضا یا ایک ہی مکان میں گنجایش نا قابل تصور ہے، لیکن دو ہستیوں میں ایک خالق اور دوسری مخلوق ہو تو ایسی حالت میں مخلوق کے پائے جانے کے لیے خالق کا علم و ارادہ اور اس کی توجہ ہی کافی ہوتی ہے۔ جب قرآن میں فرمایا گیا کہ

هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ. (سورۂ حدید:۴)

تو لوگوں کو تعجب ہوا کہ جہاں ہم ہوتے ہیں وہیں خدا کس طرح ہو سکتا ہے؟ لیکن لوگ اپنے مخلوقات کے متعلق نہیں سوچتے کہ جہاں وہ ہوتے ہیں کیا وہاں ان کے مخلوقات ان سے باہر ہوتے ہیں؟ اسی کے ساتھ اگر آدمی اپنے ذہنی مخلوقات کے متعلق غور کرے تو کیا اپنے آپ کو ان کے نیچے یا اوپر یا کسی اور سمت میں پاتا ہے؟ یقیناً خالق و مخلوق میں کوئی ایسی سمتی نسبت نہیں پیدا ہوتی، پھر کیا ہوا اگر قرآن میں اعلان کیا گیا کہ

اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ. (سورۂ بقرہ:۱۱۵)

''جدھر تم رخ کرو گے وہیں خدا ہے۔''

---

❶ عموماً موجودات کی تقسیم یوں کی جاتی ہے کہ ان کا وجود انسانی ارادے اور خیال کا اگر تابع ہے، مثلاً ذہنی اور خیالی مخلوقات کا جو حال ہے ان ہی کا نام موجودات ذہنیہ رکھا جاتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے وجود کا ظرف انسان کا ذہن ہے، لیکن انسانی ارادے اور خیال کا تابع اگر ان کا وجود نہ ہو، بلکہ حق تعالیٰ کے تخلیقی ارادے اور ایجادی قیومیت کے ساتھ ان کا وجود وابستہ ہو تو ان ہی کو خارجی موجودات کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے تحقق اور یافت کا مقام و ظرف خارج ہے۔ یعنی انسانی ذہن و خیال سے ان کا وجود خارج ہے۔ ان ذہنی اور خارجی موجودات کے سوا ایک وجود حق تعالیٰ کا ہے، جو ظاہر ہے کہ خود بخود ہے اور حق تعالیٰ کے تخلیقی ارادے کے تابع نہیں ہے، لیکن عام ارباب فکر اس تیسری قسم سے غافل ہو کر وجود کو صرف دو ہی قسموں خارجی و ذہنی میں منحصر سمجھتے ہیں۔ اسی لیے خالق اور مخلوق کے وجود میں نوعیت اور ظرف و مقام کے لحاظ سے ان کو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ گویا دو مخلوق وجودوں میں جو تعلق ہوتا ہے سمجھتے ہیں کہ یہی تعلق خالق و مخلوق کے وجود میں بھی ہے، یہی بے تمیزی لغزش اور مغالطے کا مقام ہے۔

سوچنا چاہیے کہ آخر اس کے سوا اور کیا کہا جاتا؟

الحاصل خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟ وہ عالم کو کس طرح محیط ہے؟ وہ ہر چیز کے ساتھ کس طرح ہے؟ عالم کے ہر ذرّے کی حرکت وسکون حق کے ارادے کے ساتھ کس طرح وابستہ ہے؟ وہ اپنی مخلوقات کے ظاہر و باطن میں کس طرح پایا جاتا ہے؟ ان سارے سوالات کا حل بجائے باہر کے اگر آدمی سوچے تو خود اپنے اندر پا سکتا ہے اور یہی مطلب ہے اس فقرے کا کہ "عالم کا وجود بجز وجود حق کے اور کچھ نہیں۔" صحیح حدیث میں:

اِلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ.

"ہاں! ہر چیز اللہ کے سوا ہیچ ہے۔"

کے مصرع کی توثیق فرمائی گئی ہے۔ بہ ایں ہمہ نہ خدا عالم بنا ہے نہ عالم خدا بن گیا ہے، اور آپ نے دیکھا کہ خالق ومخلوق کی باہمی نسبتوں پر غور کرنے کے بعد فطرت انسانی اس اسلامی اور قرآنی بیان کے سوا کسی اور راہ سے کیا تسلی پا سکتی ہے؟ اسی مسئلے کو مسئلۂ قیومیت کہتے ہیں۔ عارف جب اثر وموثر، خالق ومخلوق میں ان نسبتوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو چیخ اٹھتا ہے ؎

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست
خیال آب و گل در رہ بہانہ

(العارف الشیرازیؒ)

یعنی آب وگل خدا کا خیالی یا تخلیقی عمل ہے۔ مغربی نے اور واضح لفظوں میں تشریح کی ہے، ان کی اسی غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے، جس کے مطلع کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

خیال بازی اوبیں کہ پردۂ اوخیالی
فگندہ بررخ خود تا خیال اوبینی

باب پنجم:

مسئلۂ ربوبیت

ایسا خالق قیوم اگر اپنی مخلوقات کو دفعۃً نہیں بلکہ آہستہ آہستہ پیدا کرتا ہو، مثلاً دفعتاً درخت کو نہ پیدا کرے بلکہ تدریجی طور پر، مثلاً تخم سے درخت بنائے اور درختوں میں پھل لگائے تو اب وہ علاوہ قیوم کے رب بھی ہے۔ ایسی صورت میں مخلوقات صرف باقی رہنے ہی میں خالق کی محتاج نہیں رہتی ہیں بلکہ اپنے کمال تک پہنچنے میں بھی ہر آن و ہر لحظہ مسلسل ارادہ کن اور فیض تخلیقی کی انھیں ضرورت ہوتی ہے اور اسی تدریجی تخلیق کی وجہ سے اس شے کا تخیل یا توہم ہوتا ہے، جسے ہم ''زمانہ'' کہتے ہیں جس کے متعلق فلسفیوں کو اب تک نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کیا ہے اور کس حاسہ کی معلومات سے اس کا تعلق ہے؟ مسئلۂ ربوبیت پر غور کرنے کے بعد اس کا سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے [1]۔

معجزات و خوارق ایک عام غلط فہمی:

اور یہی قیومی تخلیق جب ربوبیت کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس کا نام ''قانون فطرت'' رکھ دیا جاتا ہے، پھر چوں کہ اس عالم میں عموماً تخلیق کا عام طریقہ قانون ربوبیت کے زیر اثر انجام پا رہا ہے، اس لیے صرف قیومی تخلیق کے سمجھنے سے

---

[1] زمان کا مسئلہ فلسفے کے مبہمات میں شمار کیا جاتا ہے۔ قدیم و جدید دونوں فلسفوں میں زمانہ اور ٹائم کا مسئلہ ''جذر اصم'' بنا ہوا ہے۔ ارسطو کا مشہور قول ہے کہ زمانے کا شمار ان چیزوں میں ہے جو بدیہی الانیۃ اور غریق النظریۃ ہیں۔ سب ہی جمعہ، جمعرات، دن رات، صبح و شام اور ماہ و سال کو جانتے ہیں، لیکن جس چیز کی تعبیر ان الفاظ سے کی جاتی ہے اس کا علم آدمی کو کس حاسہ سے ہو رہا ہے؟ عجب سوال ہے۔ ظاہر ہے کہ جمعہ کو نہ آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے نہ کانوں سے سنا جاتا ہے، نہ ناک سے سونگھا جاتا ہے نہ ہاتھ سے چھوا جاتا ہے، مگر باوجود اس کے سب جانتے ہیں کہ جمعہ کو ہم جان رہے ہیں۔

لوگ گھبراتے ہیں، مثلاً اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ لکڑی کیمیائی عمل کے بعد مٹی ہوگئی اور مٹی گیہوں اور گیہوں روٹی، پھر روٹی مرغی کا بچہ بن کر سانپ کی غذا بنی اور اس میں سانپ کا نطفہ بن کر بالآخر وہی لکڑی پھر سانپ کی صورت میں لہرانے لگی، تو عوام الناس کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوتی، لیکن اسی سلسلے کو ربوبیت کی تدریجی منزلوں سے ہٹا کر اگر یوں کہہ دیا جائے کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ کی لکڑی سانپ بن گئی، تو بازاریوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور ''ناممکن، ہو نہیں سکتا'' کا شور افلاک تک پہنچ جاتا ہے۔ حالاں کہ ان دونوں شکلوں میں بجز ربوبیت اور قیومیت کے اور کوئی فرق نہیں بلکہ انسان اپنے ''تخلیقی کارناموں پر'' اگر غور کرے تو اسے نظر آئے گا کہ قیومی تخلیق ربوبی تخلیق سے بدرجہا آسان اور سہل ہے۔ قیومی تخلیق خالق کی صرف معمولی توجہ اور التفات کی دستِ نگر ہے، بہ خلاف ربوبی تخلیق کے کہ اس میں کامل توجہ مسلسل اور غیر منقطع التفات تام کی حاجت ہے۔ حیرت ہے کہ ربوبی تخلیق پر ہم جس ذات کو بہ درجہ اتم قادر اور مقتدر دیکھ رہے ہیں جب اسی کی طرف کبھی کبھی قیومی تخلیق کی نسبت کی جاتی ہے تو نافہم اس کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک ذیلی بات تھی، لیکن ضروری تھی اس لیے ضمناً یہاں اس کا ذکر کر دیا گیا۔

چند اور ذیلی سوالات:

اب میں چاہتا ہوں کہ مسئلۂ قیومیت و ربوبیت کو ختم کرنے سے پہلے چند اور ایسے ہی ذیلی سوالات کو بھی جو یہاں پیدا ہوتے ہیں حل کر دیا جائے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ

ہمارے ذہنی مخلوقات کا وجود فقط ذہنی ہوتا ہے، ان کا اثر نہ ہمارے حواس پر پڑتا ہے نہ دوسرے اس کو محسوس کر سکتے ہیں، بہ خلاف خدائی مخلوقات کے کہ ان کا مشاہدہ ہر شخص کر رہا ہے۔

جواب: مگر ظاہر ہے کہ ہماری ''تخلیقی قوت'' اتنی زوردار نہیں ہو سکتی یا نہیں ہے جتنی خالق عالم کی ہے۔ اسی لیے اگر ہمارے ذہنی مخلوقات بیرونی وجود نہ حاصل کر سکیں

تو یہ ہماری تخلیقی قوت کے ضعف کا نتیجہ ہے اور یہ ضعف اس سے بھی ظاہر ہے کہ ہم عام طور پر کسی خیالی مخلوق پر چند سیکنڈ سے زیادہ اپنی توجہ کو قایم نہیں رکھ سکتے، لیکن وہ جو دیر تک کسی ایک نقطے پر توجہ کو مرتکز کرنے کی مشق بہم پہنچا لیتے ہیں، آپ کو معلوم ہوگا کہ بہ تدریج ان کے ذہنی مخلوقات بھی خارجی وجود کا بھیس بدلنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ دوسروں کو بھی اس کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے، مثلاً عموماً مسمریزم کی جو لوگ مشق کرتے ہیں، وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے خیالی تصورات کا عکس دوسروں کے حواس پر بھی ڈال دیتے ہیں اور جو ان سے بھی قوی تر ہوتے ہیں، وہ کچھ دیر کے لیے نہیں بلکہ اس سے زیادہ مستقل، ٹھوس اور نمایاں قسم کے کام انجام دینے لگتے ہیں [1]۔

اس سلسلے میں اس بیماری کا ذکر اس مسئلے کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر سکتا ہے جسے اطبا کابوس کہتے ہیں اور عموماً عنفوان شباب میں بعض آدمی اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس بیماری میں اضطراری طور پر انسان کی تخلیقی قوت اور اس کی توجہ ایک نقطے پر نیند میں ٹھیر جاتی ہے، جس کے بعد آدمی بے چین ہو کر بیدار ہو جاتا ہے، لیکن توجہ میں پھر بھی انتشار نہیں پیدا ہوتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہی خیالی مخلوق جسے سونے والے کے "کن فیکونی ارادے" نے نیند میں پیدا کیا تھا اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ دوسرے لوگ جو اس بیمار کے پاس ہوں وہ کچھ نہیں جانتے، کچھ نہیں دیکھتے لیکن خود یہ بیمار نہایت صفائی کے ساتھ اپنی اس "خیالی مخلوق" کے رنگ اور مقدر کو دیکھتا

---

[1] شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ "فصوص الحکم" میں لکھتے ہیں:

العارف یخلق بهمتهِ مایکون له وجود من خارج محل الهمة ولکن لاتزال الهمة تحفظ ولا یؤدهٗ حفظه ای حفظ ما خلقته ومتی هوء علی العارف غفلة عن حفظ ماخلق عدم ذالك المخلوق. (ص ٦٩)

"عارف اپنی ہمت سے ایسی چیز بنا دیتا ہے جس کا وجود خارج میں ہوتا ہے یعنی خارجی آثار اس پر مرتب ہوتے ہیں، پھر عارف کی ہمت اور ارادہ اس مخلوق کی نگرانی کرتا رہتا ہے، لیکن اس نگرانی سے تھکتا نہیں، مگر عارف کو اگر اس کی جانب سے غفلت ہو جائے تو اس کی وہ "مخلوق" معدوم ہو جائے گی۔"

ہے، وزن کو محسوس کرتا ہے اور چلا اٹھتا ہے کہ کوئی بھوت پریت اس کے سامنے ہے۔ حالاں کہ وہ خود اس کی خیالی مخلوق ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو بعض دفعہ ویرانوں اور جنگلوں میں بہ حالت بیداری بھی اسی طرح کا دورہ پڑ جاتا ہے اور یہ اپنے پیدا کیے ہوئے اس بھوت سے خود ہی بھاگتے ہیں۔

دوسرا سوال: اس سلسلے کا دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ پیدائش سے پیشتر خدا کو عالم کا علم کس طرح ہوا؟ حتیٰ کہ کُن فیکونی قوت سے اس کی تخلیق پر وہ قادر ہوا، کیوں کہ جو چیز موجود نہ ہو اس کے معلوم ہونے کی کوئی نظیر ہمارے سامنے نہیں ہے۔

جواب: ظاہر ہے کہ اس سوال کی بنیاد حق تعالیٰ کے علم ازلی کے انکار پر مبنی ہے، جس میں قادر ذوالجلال کو کم زور انسان پر قیاس کیا گیا ہے، گویا جس طرح انسان کسی چیز کو اس کے موجود ہونے سے پیشتر نہیں جان سکتا، سمجھا گیا ہے کہ یہی حال خدا کا بھی ہے۔ حالاں کہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ چیونٹی جس بوجھ کو نہیں اٹھا سکتی اس پر قیاس کرکے ہاتھی کے لیے بھی اس بوجھ کا اٹھانا ناممکن بتلایا جائے، اور یہ کلیہ بھی صحیح نہیں کہ کسی چیز کا معلوم ہونا اس کے موجود ہونے پر موقوف ہے، ہم بہت سی ایسی چیزیں سوچتے ہیں اور سوچ سکتے ہیں جن کو کبھی نہیں دیکھا، مثلاً جزو کو دیکھ کر کل کے متعلق سوچتے ہیں، موجود عالم کو معدوم فرض کر سکتے ہیں، حالاں کہ عالم کو جب ہم نے دیکھا موجود ہی دیکھا ہے، پس جس طرح ہم موجود کو معدوم خیال کر سکتے ہیں، کیا ہوا اگر خدا نے بھی معدوم عالم کو موجود فرض کر لیا؟

عالم کی حقیقت:

اور یہ تو اجمالی جواب تھا، مسئلے کی صحیح تحقیق کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ جس چیز کو عالم یا کائنات کہتے ہیں خود اس کی حقیقت کیا ہے؟ سنا ہوگا کہ قدیم سطحی فلسفیوں نے تمام چیزوں کی آخری حقیقت خاک، باد، آب و آتش قرار دی تھی، پھر اس خیال میں ترمیم ہوئی اور اسّی (۸۰) تراسی (۸۳) کیمیائی بسایط کا نظریہ قایم کیا گیا اور اب کہا جاتا ہے کہ تمام کائنات کی آخری تحلیل برق پاروں پر ختم

ہوتی ہے، اور بعضوں نے تو اب اس کا بھی اعلان کیا ہے کہ یہاں جو کچھ ہے صرف انرجی اور توانائی کی مختلف شکلیں ہیں...... بہرحال حقیقت عالم کے متعلق یہاں تک سائنس والوں کی پرواز ہے۔

نیز آپ کو یاد ہوگا، ابتدا میں میں نے فلسفیوں کے اس گروہ کا ذکر کیا تھا جو سارے عالم کو چند گنے گنائے اوصاف پر ختم کردیتے ہیں، ان کو نارنگی میں زردی، ترشی، طول وعرض وغیرہ چند صفات کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا، وہ شجر وحجر، ثوابت وسیارات، شمس وقمر سب کو صرف رنگ وروشنی کے مختلف مظاہر سمجھتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ ان دوصفتوں یعنی رنگ وروشنی کو عالم سے سلب کرلو تو پھر آنکھ کے لیے یہاں کچھ بھی نہیں رہتا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رنگ بھی بالآخر روشنی ہی کے چند بھیسوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

الغرض کثرت کی ان گونا گوں اور لامحدود موجوں کو جن کا دوسرا نام کائنات یا عالم ہے، وحدت کے سمندر میں گم ہوتے ہوئے وہ بھی پاتے ہیں جنھوں نے واقعہ یہ ہے کہ اب تک کچھ نہیں پایا ہے، لیکن جس شخص کی پہلی یافت "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" کی ہو اور جو اس حقیقت کو سمجھ چکا ہو کہ اس عالم میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اصلا نہ تھی، بلکہ یہاں ساری "نمود" "بود" ہی کی ہے اور اس عالم میں جہاں کہیں جو کمال، جو صفت جس شان، جس شکل میں بھی نظر آتی ہے وہ اس کا ذاتی کمال یا صفت نہیں بلکہ سب رب العالمین کے شیون وصفات، کمالات وحسنات کی مختلف شانیں ہیں، جو مختلف مدارج کے لحاظ سے مختلف پیمانوں پر نمایاں ہورہی ہیں۔ پس جس نے اس حقیقت کو پالیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ عالم کی پیدائش کے لیے عالم کے جاننے کی ضرورت نہیں بلکہ حق تعالیٰ کو اپنی ذات وصفات کا جاننا اور ان کا علم بس کافی ووافی ہے کہ یہی کمالات وشیون وصفات دراصل عالم کی حقیقتیں ہیں۔ الغرض ظاہر ہے کہ ازل میں خدا تھا اور خدا کے ساتھ اس کے لامحدود کمالات وصفات تھے، وہ ان تمام چیزوں (ذات وصفات) کا عالم تھا، پس اس نے اپنی جن صفات کو جس پیمانے پر جن

دوسرے صفات کے ساتھ جس ترتیب کے ساتھ تصور کیا ❶ اور جب اور جس وقت چاہا، اس تصور کو کن فیکونی قوت سے خلق اور آفرینش کا رنگ دے کر ظاہر فرمایا، تو اس کے لیے خدا کا خود اپنی ذات وصفات کا علم یقیناً کافی ہے۔ گویا یہ قول عراقی باہر سے نہیں بلکہ پیدائش عالم کے لیے

نخستیں بادہ اندر جام کردند
زچشم مست ساقی وام کردند

یعنی خود ساقی کی چشم مست سے وام وقرض لیا گیا۔ قرآن نے اسی مسئلے کی طرف اپنی مشہور آیت:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (سورۂ نور: ۳۵)

"اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی۔"

میں اشارہ کیا ہے، نیز مشہور حدیث ہے:

كُنْتُ كَنْزًا مَّخْفِيًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ.

"میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ جانا جاؤں تو پیدا کیا میں نے مخلوقات کو۔"

مطلب یہ ہے کہ اسمائے حسنیٰ جس قدوس اور سبوح کے ساتھ مخصوص ہیں اور جس کے کمالات یا کلمات کے لکھنے کے لیے نہ سمندر کا پانی اور نہ دنیا کے درخت کافی ہو سکتے ہیں اور جس کے متعلق خود سرور کائنات کا ارشاد ہوا:

لَا اُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ.

---

❶ اسماوصفات کی باہمی ترکیبوں سے لاتعداد لاتحصیٰ جو صورتیں علم الٰہی میں پیدا ہوئیں انہی کا نام اعیان ثابتہ، اسمائے کونیہ وغیرہ ہے۔ کن فیکونی قوت کے زیر اثر آنے سے پہلے اجمال وتفصیل کے حساب سے علم الٰہی کی ان صورتوں کے جو مراتب فرض کیے جا سکتے ہیں ان ہی کی تعبیر علم تصوف میں احدیت، وحدیت واحدیت وغیرہ اصطلاحی الفاظ سے کی جاتی ہے، لیکن ان اصطلاحات سے واقعات کے سلجھانے میں بہ ظاہر کوئی مدد نہیں ملتی، اس لیے میں نے ان غیر ضروری تفصیلات کا ذکر بھی غیر ضروری خیال کیا۔

"تیری خوبیوں کو میں تو گن نہیں سکتا۔ بس تو ایسا ہے جیسا کہ تو نے خود اپنے متعلق فرمایا۔"

پس اسی حی و قیوم نے اپنے غیر محدود اسما اور بے شمار صفات کو جب اپنا غیر فرض کیا تو اسی کا نام عالم ہو گیا۔ اگر چہ حق تعالیٰ مثل سے پاک ہے لیکن صرف سمجھنے کے لیے یہ مثال دی جا سکتی ہے کہ جس طرح کبھی کبھی شاعر اپنی بینائی کو نرگس میں، گویائی کو سوسن میں، شنوائی کو غنچے میں، حسرت و درد کو لالہ میں، اپنے استقلال کو ساحل میں اور بے چینی کو دریا میں فرض کرتا ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تنہائی میں خود اپنی ذات کو اپنا غیر اعتبار کر کے گھنٹوں اس سے سوال و جواب بھی کیا کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ اپنی ذات و صفات کے متعلق اس عمل کے کرنے سے ہماری ذات یا صفت میں کوئی عیب یا نقص نہیں پیدا ہو جاتا۔ مثلاً اگر ہم کسی میں اپنی صفت بینائی فرض کریں تو اس فرض کی وجہ سے میری بینائی میں تو کوئی کمی پیدا نہیں ہو جاتی، پھر اگر غیر محدود اسما و شیون، صفات و کمالات والے نے مختلف مدارج کے لحاظ سے ان کو اپنا غیر فرض کیا تو اس سے ذات حق کی طرف کیا نقص عاید ہوتا ہے یا اس میں کیا کمی پیدا ہوتی ہے؟ البتہ فرق ضرور ہے کہ ہماری ارادی قوت اور کن فیکونی طاقت چوں کہ کمزور ہوتی ہے اس لیے ہمارے مفروضات صرف مفروضات بن کر رہ جاتے ہیں اور ان سے واقعی آثار کا ظہور نہیں ہوتا۔ مثلاً آگ کو اپنے ذہن میں پیدا کر لیتے ہیں لیکن اس سے سوزش اور روشنی کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ بہ خلاف حق تعالیٰ کے کہ اپنی جس صفت جس کمال کے جس درجے کو جس جگہ جس مقدار میں فرض فرماتے ہیں اسی حد تک ان کا یہ فرض خلق اور آفرینش بن جاتا ہے۔ مثلاً جس میں اپنی صفت حیات جس مقدار میں فرض کرتے ہیں وہ اسی حد تک زندہ ہو جاتی ہے اور جس میں علم فرض کرتے ہیں اس میں علم پیدا ہو جاتا ہے، الیٰ غیر ذالک۔ بہر حال ان کے مفروضات، مخلوقات بن جاتے ہیں اور ان سے واقعی آثار کا ظہور ہونے لگتا ہے۔

الحاصل! عالم کو خدا نے کس طرح پیدا کیا؟ اس کا جواب تو مسئلۂ قیومیت تھا۔

خدا نے عالم کو کس چیز سے پیدا کیا؟

اب دوسرا مستقل سوال یہ ہے کہ خدا نے عالم کو کس چیز سے پیدا کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کثرت کی بنیاد ان غیر متناہی اسمائے حسنیٰ اور بے شمار کلمات پر قایم ہے جو ہر لحظہ و ہر آن

کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ. (سورۂ رحمٰن: ۲۹)

"ہر روز اس کی ایک شان ہے۔"

کے سرچشمہ جلال سے ابل رہے ہیں بہ قول جامی:

زاں سایہ کہ افگندی برخاک گہ جلوہ
دارند ہمہ خوباں ۔ سرمایۂ زیبائی!

اسی کی طرف مغربی نے بھی اشارہ کیا ہے:

زدریا موج گوناگوں بر آمد
زبے چونی برنگ چوں بر آمد
گہے در کسوت لیلی فرو شد
گہے در صورت مجنوں بر آمد

رہ گئی یہ بات کہ عالم کثرت کی کون سی چیز حق تعالیٰ کی کس صفت اور کس اسم کی آئینہ بردار ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا بتانا آسان نہیں ہے۔ کامل طور پر اس کا علم اسی کو ہوسکتا ہے جو اسماء الحسنیٰ میں سے ہر اسم کے ہر درجے کا علم رکھتا ہو اور اسی طرح عالم کی ہر چیز کی آخری حقیقت کی معرفت بھی اسے حاصل ہوئی ہو۔ میں بتا چکا ہوں کہ علم و معرفت کا یہ مقام ہے کہ جہاں انسانیت کی آخری رسائی نے بھی "مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ" کا اقرار کیا ہے، تا بہ دیگراں چہ رسد۔

ایک عامی انسان کی لذت پذیری کے لیے معرفت کی یہ اجمالی روشنی بھی

دیدۂ آئینہ دار طلعت اوست
دل سرا پردۂ محبت اوست

کا حال پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ تفصیلی طور پر سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن حواس ظاہری یا باطنی سب پر ع

ہر جا کہ نظر کر دم سیمائے تو می بینم

کی خنک اور شیریں موجیں ٹکراتی رہتی ہیں ❶ اور قرآن کی تعلیم کا سب سے پہلا ابتدائی سرا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ'' جو بہتوں کے لیے صرف تقلیدی معرفت کی حیثیت رکھتا ہے، مگر جاننے والوں کے لیے حقیقت کے آغاز کا ابتدائی نقطہ یہی ہے، جس نے یہ پالیا وہ ان شاء اللہ آخر تک پاتا چلا جائے گا۔ لیکن جسے الفاظ کے علاوہ قرآن کی اس اساسی وافتتاحی تعلیم میں معنی کا کوئی حصہ نہ ملا اسے آیندہ بھی مشکل

---

❶ حقیقت تو یہ ہے کہ جب تحلیل و تجزیہ کے بعد عالم کی تعمیر کا آخری سرمایہ صرف صفات واسمائے حق ٹھیرتے ہیں پھر ان ہی کی باہمی ترکیب سے جو مختلف صورتیں علم الٰہی میں قایم ہوئیں، حق تعالیٰ اپنے ان ہی معلومات کی شکل میں متجلی ہوا ہے۔ مظاہر تو حقایق عالم ہیں، لیکن ظاہر اس میں خود ذات حق ہے۔ علی الخصوص جب خالق کسی شعوری مخلوق کی شکل میں ظاہر ہوا اور اسے اپنی کُن فیکونی مخلوق بنائے تو ایسی مخلوق کے شعور سے خالق کا علم جدا نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے صوفیہ کے نزدیک حق کی یافت کی قریب ترین شکل یہ ہے کہ اپنے ''انا'' میں اس کے شعور کو بیدار رکھا جائے۔ اجمالاً اس کا شعور اگرچہ ہر عامی کو ہوتا ہے، اسی لیے حق تعالیٰ کو مخاطب کرنے کے لیے اپنی شعوری توجہ کو ہر شخص کافی سمجھتا ہے، لیکن صوفیہ اسی اجمال کی تفصیل کی مشق کرا کے دوام حضور کے مقام پر مرید کو پہنچا دیتے ہیں۔ حدیث:

اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ.

''تو ہی پہلے ہے تجھ سے پہلے کچھ نہیں ہے، تو ہی آخر ہے تیرے بعد کچھ نہیں ہے، تو ہی ظاہر ہے تیرے اوپر کچھ نہیں ہے، تو ہی باطن ہے تیرے آگے کچھ نہیں ہے۔''

یا حدیث:

اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ.

''خدا کو یاد رکھو اسے اپنے سامنے پاؤ گے۔''

وغیرہ میں انہی اعتبارات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سے کوئی ایسی چیز مل سکے جس کا ملنا دراصل ملنا ہے۔ بہر حال بجائے تفصیل کے اس مسئلے میں ہمارے لیے اجمال بھی بہت کچھ ہے۔ تاہم اس اجمال کے باوجود صفاتِ الٰہیہ کے ظہور کی دو کلی شکلوں کی طرف قرآن میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ صوفیۂ اسلام کی اصطلاح میں اسی کی تعبیر آفاق وانفس سے کی جاتی ہے۔

آفاق وانفس:

درحقیقت ان دونوں اصطلاحوں کا ماخذ بھی قرآن ہی کی وہ مشہور آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ○ (سورۂ حٰمٓ السجدۃ: ۵۳،۵۴)

"میں اپنے پتے لوگوں کو آفاق اور انفس میں دکھاؤں گا، یہاں تک کہ کھل جائے گا ان پر کہ وہی خدا حق اور ثابت ہے۔ کیا تیرے رب کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ خبردار! یہ لوگ اپنے مالک کی ملاقات میں شک کے اندر ہیں۔ خبردار وہ ہر چیز کو محیط ہے۔"

اربابِ معرفت نے ان آیات میں "آفاق" سے مراد کائنات کا وہ عریض و طویل سلسلہ لیا ہے جو انسان کے باہر ثوابت و سیارات، نباتات و جمادات، حیوانات و ملائکہ اور جن و شیطان وغیرہ کی شکل میں پھیلا ہوا ہے، اور "نفس" سے مراد خود انسان کی حقیقت اور اس کی ذات ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات اللہ کی تجلی ان دونوں چیزوں میں دو جداگانہ حیثیتوں سے ظاہر ہوئی ہے۔

صوفیۂ کرام فرماتے ہیں کہ اسمائے حسنیٰ کی ایک تفصیلی جلوہ گاہ وہ ہستیٔ اعظم ہے جسے اصطلاح میں "شخص کبیر" کہتے ہیں۔ جس میں حق تعالیٰ اپنے تمام اسما وصفات

کے مختلف مدارج کے لحاظ سے جلوہ ❶ فرما ہوئے ہیں۔ اسی کا نام عالم اور آفاق ہے اور اسی "شخص کبیر" کو چھوٹے پیمانے پر بہ طور خلاصہ کے دوبارہ جب اعتبار فرمایا گیا اور اس کو مجمل اور مختصر کر کے ایک اور ہستی نکالی گئی تو اسی کا نام انسان اور نفس ہو گیا ہے۔ اس چھوٹی شخصیت میں وہ سب کچھ ہے جو اس سے باہر ایک ایک چیز میں جدا جدا پایا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر جدید زمانہ قدیم، ہمیشہ انسان "خلاصۂ کائنات" یا بہ اصطلاح حال "ارتقا کی آخری منزل" قرار دیا گیا ہے۔

تصوف کی کتابوں میں اس کی تفصیل مل سکتی ہے کہ کس طرح اس چھوٹے پیمانے میں وہ سب چیزیں اتر آتی ہیں جو وسیع سے وسیع تر پیمانوں پر عالم کبیر میں پائی جاتی ہیں۔ کم از کم اتنا تو ہر عامی بھی جانتا ہے کہ انسانی وجودان تمام خواص و آثار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جن کے مظاہر عام طور پر جمادات و نباتات اور حیوانات وغیرہ مرکبات ہیں۔ اسی طرح کون نہیں جانتا کہ انسان سے باہر اگر مٹی ہے، پانی ہے، ہوا ہے، حرارت ہے تو تاریخ کے نامعلوم زمانے سے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری جسدی ترکیب میں بھی یہ ساری چیزیں شریک ہیں۔ اور جب یہ ہیں تو جن کیمیائی بسایط سے ان عناصر کی ترکیب ہوئی ہے، کیا کوئی اس کا انکار کر سکتا ہے کہ وہ بھی انسانی بدن کے اجزا نہیں ہیں؟ بلکہ عہد جدید کے کیمیائیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جتنے کیمیائی بسایط انسان سے باہر پائے جاتے ہیں ان کا ایک بڑا حصہ ہماری جسدی تعمیر میں خرچ ہوا ہے، البتہ بعض بسایط کا اب تک ان کو پتا نہیں چلا ہے۔ لیکن جو معلوم نہیں ہیں کیا

❶ یہاں تصوف کی ایک اصطلاح لفظ تجلی کو سمجھ لینا چاہیے۔ عالم کا اپنے معلومات کی شکل میں ظاہر ہونا، مثلاً جبرئیل علیہ السلام کبھی دحیہ کلبیؓ صحابی یا مسافر، یا رجل سوالی کی شکل میں جو ظاہر ہوتے تھے تو اس کی حقیقت یہی تھی کہ اپنے معلومات کی شکل میں وہ ظاہر ہوتے تھے۔ آدمی بھی جب اپنے ذہن میں اپنے کسی معلوم کو عالم خیال میں پیدا کرتا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ معلوم کی شکل میں وہ متجلی ہوا۔ ظاہر ہے کہ عالم خیال میں جو گدھے کا تصور مثلاً قایم کرتا ہے اس وقت وہ گدھا نہیں ہو جاتا بلکہ صرف اسی کا ظہور اپنے ایک معلوم کی شکل میں ہوتا ہے، عالم کی مختلف چیزوں کی شکل میں حق کے ظہور اور تجلی کو بھی کچھ اسی پر قیاس کیا جاتا ہے۔

ضروری ہے کہ وہ موجود بھی نہ ہوں؟ بہر حال کم از کم ہر شخص اتنا تو ضرور جانتا ہے کہ انسانی وجودان تمام خواص وآثار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جو عام طور پر حیوانات، جمادات، نباتات وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

الحاصل جمادات ہوں یا معدنیات، نباتات ہوں یا حیوانات، بلکہ وہ ساری چیزیں جو حواس کی گرفت میں آسکتی ہوں کون نہیں جانتا کہ انسانی ہستی (وجود) ان تمام طبقات محسوسہ کے آثار وخواص کی ''کتاب مجمل'' اور ''نسخۂ جامع'' ہے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ علاج ومعالجہ وطبی دواؤں کی بنیاد عالم صغیر وکبیر کی اسی باہمی مناسبت پر قایم ہے۔ حتیٰ کہ وہ نورانی اجرام جو اتھر کے لامحدود سمندر میں تیر رہے ہیں یا جوان کے پیچھے ہیں، گو عوام الناس کو اس کا علم نہ ہو لیکن جن لوگوں نے انسان کے باطنی قویٰ کو کریدا ہے انھیں اس چھوٹے قالب میں عالم انوار کے وہ سارے نظامات منکشف ہوئے ہیں جو حواس سے باہر پائے جاتے ہیں۔ نہ صرف صوفیانہ مجاہدات والے بلکہ جو گیت ورہبانیت کی راہوں سے بھی جو انسان کے ان اندرونی حدود میں اترے ہیں ان کو قالب انسانی کے مختلف مقامات میں مختلف الوان انوار کے مراکز کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مستقل مقامات پر سرخ، سفید، سبز یا نیلگوں انوار کے نقطے قایم ہیں۔ ان کے کھل جانے کے بعد آدمی پر ان نت نئے حالات کا انکشاف ہوتا ہے، جن کا صحیح اندازہ صرف عقل وحواس رکھنے والوں کو نہیں ہوسکتا۔

مسئلۂ لطایف واسرار اور مسئلۂ شق صدر:

انوار باطنی کے ہی انشراح کا نام نبوت کی وہبی مقام میں ''شق صدر'' یا ''شرح صدر'' ہے اور جب کسب وکوشش ریاضات ومجاہدات سے اس کے دروازے کھولے جاتے ہیں تو ان کو صوفیانہ اصطلاح میں ''لطایف واسرار'' کہتے ہیں [1]، اور صرف یہی

---

[1] یہاں اگر اس امر کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ شق صدر کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ پانچ دفعہ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت حلیمہؓ کے گھر میں دس سال کی عمر میں، نزول وحی کے آغاز کے وقت، معراج کے وقت، ایک دفعہ اور تفصیل تفسیر عزیزی (از حضرت شاہ عبدالعزیزؒ) میں ◄

نہیں بلکہ عالم انسانیت میں جس طرح مختلف مقامات میں علم واحساس تدبیر وتصرف کے مختلف ذرایع وآلات مختلف حواس وقویٰ کی شکلوں میں جڑے ہوئے ہیں جن سے اس عالم صغیر کے مختلف فرایض متعلق ہیں جنھیں ہم سامعہ، باصرہ، غاذیہ، نامیہ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ اسی طرح سے اس بڑے لمبے چوڑے شخص کبیر میں بھی ایسے مستقل ذرایع ووسایل زندہ ہستیوں کی صورت میں موجود ہیں، جو اس بڑے عالم کے مختلف فرایض کو بغیر کسی سرکشی وعصیان کے انجام دیتے ہیں۔

انرجی یا توانائیوں کے ان زندہ مظاہر کو مذہبی زبان میں ملائکہ فرشتے، دیوتا وغیرہ الفاظ سے موسوم کیا جاتا ہے، بلکہ انسانی زندگی کا وہ تباہ کن رخ جس کی طرف ڈھلک جانے کے بعد اچھا خاصہ آدمی صرف شرارتوں اور گم راہیوں کا ڈھیر بن جاتا ہے، جس کا مذہب کی زبان میں ''شیطان'' نام ہے، اور وہ جو صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک غیر مرئی ہستی پیدا کی جاتی ہے اور جس کا نام قدیم عالموں کی زبان میں ہمتا یا ہم زاد تھا اور جس پر عہد جدید کے اسپریچول ازم والوں کے تجربات کی بنیاد قایم ہے ❶، کیا اس کے بعد اس میں شک رہ جاتا ہے کہ انسانیت کے

➤ دیکھیے (سورۃ الم نشرح، نیز روض الانف سہیلی وزرقانی شرح مواہب وغیرہ)۔ دوسری بات یہ ملحوظ رکھنی چاہیے کہ حضرات صوفیہ خصوصاً مجددیہ نقشبندیہ میں لطایف واسرار کی مجموعی تعداد بھی پانچ ہی بتائی جاتی ہے۔ اس کے لیے کچھ نہیں تو فیض رحمانی وغیرہ مجددیہ نقشبندیہ کی کتابوں کا دیکھنا کافی ہوسکتا ہے۔

❶ یورپ وامریکہ کے ایک بڑے طبقے میں آج کل ایسے اعمال کی مشق کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ جس کی بنیاد پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مثلاً مُردوں سے گفتگو کی جاسکتی ہے، بلکہ کی جاتی ہے۔ حالاں کہ عموماً ان دعاوی کا ایک بڑا حصہ ادعا سے آگے نہیں بڑھتا ہے اور بالفرض اگر کسی کو اس میں بہ ظاہر کامیابی نظر آتی ہو تو جہاں تک ارباب کشف وبطون کا تجربہ ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کا اسپریچو کا یہ گروہ مردوں کی روح باور کرتا ہے وہ واقعی مرے ہوئے لوگوں کی روحیں نہیں ہوتیں بلکہ عموماً شیاطین، اجنہ، اور ہم زاد وغیرہ جیسی چیزیں ہوتی ہیں۔ وہی اپنا نام مردوں کا نام رکھ کر ان لوگوں پر ظاہر ہوتی ہیں۔ چوں کہ ان باتوں کا بالکلیہ تعلق تجربہ ومشاہدہ ہی سے ہے، اس لیے جو اس میدان کے مرد نہیں ہیں وہ ان حقایق کی اصلیت تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی کے ساتھ دجال والی ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں آیا ➤

عالم صغیر میں وہ چیز بھی موجود ہے جس کا پتا آفاقی کائنات میں جن، بھوت، چڑیل، وغیرہ الفاظ کے ذریعے سے دنیا کی ہر قوم نے ہر زمانے میں دیا ہے۔

الحاصل! صفاتی لحاظ سے جن جن چیزوں کا مظاہرہ آفاق میں ہوا ہے نفس میں کسی نہ کسی طرح وہ سب چیزیں کسی نہ کسی پیمانے میں ضرور پائی جاتی ہیں۔ صوفیہ کے نزدیک بھی یہی مطلب ہے قرآن کی اس آیت کا جس میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ

لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ. (سورۂ ص:۷۵)

''میں نے آدم علیہ السلام کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔''

بہ الفاظ دیگر اپنی تمام صفات جلالی و جمالی، سلبی و ایجابی کا اسے مظہر بنایا ہے، لیکن یہ صرف صفات کی حد تک بات تھی۔ الحاصل! آفاق میں بھی انہی صفات کو فرض کر کے ''کن فیکونی'' عمل کے زیر اثر ایجاد کا رنگ بخشا گیا اور پھر چھوٹی تقطیع پر اسی عمل کا ظہور انفس میں بھی ہوا۔

خلافت:

اب صرف ایک بات رہ گئی کہ اب تک خدا نے اپنے اسما و صفات کو اپنے سے باہر فرض کیا یا پیدا کیا، لیکن خود اپنی ذات کو اپنا غیر فرض کر کے کوئی مخلوق نہیں بنائی، یہی وہ ارادہ تھا جس کا اعلان ملائکہ کے سامنے ازل میں:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً. (سورۂ بقرہ:۳۰)

سے کیا گیا اور یہی کہ صفات کے اس نسخۂ جامعہ میں یا عالم صغیر میں خود اپنے آپ کو اپنا غیر فرض کر کے:

نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ. (سورۂ ص:۷۲)

➤ ہے کہ دجال کے ساتھ شیطانی روحوں کی بھی امداد ہوگی۔ اپنا نام لوگوں کے مرے ہوئے ماں باپ واعزہ کا رکھ کر دجال کی تصدیق کر کے یہ مغالطہ لوگوں کو دیں گے کہ واقعی ان کے مرے ہوئے اعزہ جی زندہ ہو کر دجال کی تصدیق کر رہے ہیں۔

کا اعلان کیا گیا۔ جمادات سے لے کر ملائکہ تک کو اس کے آگے جھکنے کا حکم ہوا اور اب جا کر پیکر آدم احسن تقویم کے سانچے میں ڈھل کر خدا کا خلیفہ بن کر آیا، یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے، یعنی

خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِه.

پس شخص کبیر یا آفاق کے لیے جس طرح ایک روح یا نقطۂ مرکزی یا انا (خدا) تھا اور ہے اسی طرح اس شخص صغیر میں بھی ایک ایسا شعوری نقطہ پیدا ہو گیا جس کو ہر شخص ہم میں سے ''انا'' یا ''میں'' وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، جس میں وہ سارے شیون و اوصاف ہیں جن پر شعوری یا غیر شعوری طور پر الوہیت کا دھوکا ہوتا ہے اور خدا جانے کتنوں کو ہوا ہے۔

انسانیت کا یہی بلند مقام ہے جس کی بلندی کا اظہار روم کے عارف نے ان لفظوں میں فرمایا:

منگر بہ ہر گدائے کہ تو خاص ازاں پاکی مفروش خویش ارزاں کہ تو بس گراں بہائی

بہ عصا شگاف دریا کہ تو موسیٰ زمانی بہ دراں قبائے مہ را کہ تو نورِ مصطفائی

بہ خراش دست خوباں کہ تو یوسفِ جمالی چو مسیح دم فرودم کہ تو نیز ازاں نوائی

بہ صف اندر آئی تنہا کہ سفندیارِ وقتی درِ خیبر است برکن تو علیٔ مرتضائی

چو خلیل رو در آتش کہ تو خالصی و دل کش چو خضر بہ آب حیواں کہ تو جوہر بقائی

بگسل زبے اصولائی مشنو فریب غولاں تو آں شریف اصلی کہ تو از بلند جائی

تو زِنورِ لایزالی زِدرونہ خوش جمالی کہ تو فیضِ ذوالجلالی کہ تو پرتو خدائی

تو ہنوز ناپدیدی کہ جمالِ خود نہ دیدی سحرے چو آفتابی زدرون خود برائی

تو زخاک سر برآور کہ درختِ بس بلندی تو بپر بہ کوہ وحدت کہ شریف تر ہمائی

تو ئی آں ذرے کہ فانی دو ہزار بحر در تست تو ئی بحرِ بیکرانہ زصفاتِ کبریائی

(منقول از دیوان مولانا رومیؒ مشہور بہ دیوان شمس تبریز است)

باب ششم:

حقیقت محمدیہ علی صاحبہا الف تحیہ

یہی خلافتِ الٰہیہ ہے جس کا انسان مظہر ہے، لیکن جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ شیون الٰہی اپنے مدارج کے لحاظ سے غیر محدود ہیں۔ اسی طرح خلافت عامہ تو ہر انسان کو حاصل ہے، لیکن اس کے ساتھ مدارج کے اختلاف نے اس کے بے شمار افراد میں بانٹ دیا ہے۔ تاہم عقل یہ تجویز کرتی ہے کہ خلافت کے درجات کو مکمل ہوتے ہوئے بالآخر ایک ایسی ہستی پر ختم ہونا چاہیے جو تمام اسماو صفات اور ذات کا مظہر اتم ہو اور وہی ''درفرید'' نوع انسانی کا کامل ترین فرد بلکہ تکوین و تخلیق کا آخری نتیجہ قرار پا سکتا ہے۔ کائنات کے ارتقائی درجات وطبقات کی رفتار کو دیکھ کر نہ صرف وجدان وبصیرت والے عقلی روشنی کے سہارے چلنے والوں نے بھی کبھی کبھی اس فرد کامل کو انسانیت کی طویل الذیل تاریخ میں تلاش کیا ہے، حتیٰ کہ متاخرین فلاسفہ میں جرمنی کے مشہور مفکر نیٹشے نے تو اپنے سارے فلسفے کی بنیاد ہی ارتقا کی اسی آخری تقویم یا قالب کی تلاش پر رکھ کر مافوق البشر کا نظریہ قایم کیا، لیکن جس مسئلے میں عقل سے زیادہ نور ایمان کی روشنی درکار ہے، وہاں صرف عقلی احتمالات سے کسی یقینی نتیجے تک پہنچنا مشکل ہے۔ کاش! اسے معلوم ہوتا کہ اس سے بہت پہلے آسمانی آواز نے خلق عظیم والے کو عالمین (سارے جہاں) کے لیے رحمت بنا کر دنیا میں یہ کہتے ہوئے متعین کر دیا ہے کہ وہی کمالات انسانی جو رفتہ رفتہ ارتقا پا کر نبوت و رسالت تک پہنچتے ہیں اب نبیوں کے ان ہی کمالات کا خاتم نسل آدم میں آ کر سارے اسماو صفات کے تخلیقی دایرے کا انتہائی اور آخری نقطہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ظاہر ہو گیا اور یوں عالمین کے رب کی ساری حمد، ساری ستایش، سارے کمالات مخلوق بن کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطہر میں مکمل ہو گئے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ''محمد'' صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ قدرت کا آخری کام بھی ہے۔

ختم نبوت:

آخر بتایا جائے کہ کیا انسانی کمالات کے آخری زینے وہ نہیں ہیں جہاں انبیا ورسل کھڑے ہیں؟

ماننے والوں کو جانے دیجیے، کیا انکار کرنے والوں نے نبوت ورسالت کے الفاظ کو چھوڑ کر ریفارم اور اصلاح کی آڑ میں کسی نہ کسی طرح پھر اسی کا اقرار نہیں کیا ہے؟ اب سوچنا چاہیے کہ ہم میں رسول بن کر وہ کون آیا جو اپنی نبوت کے ساتھ ساتھ پیہم ختم نبوت کے دعوے کا بھی اعلان کر رہا تھا۔ ''میرے بعد صرف قیامت کا انتظار کرو۔'' اس تاریخی پیشین گوئی کا چھوڑنے والا نسل انسانی میں کون تھا؟ ❶ دیکھتے سب ہیں لیکن کم لوگوں کو سوجھا کہ اس دعوے کے بعد نبوت کا کوئی دعویٰ بنی آدم کی بستیوں میں کیوں سرسبز نہیں ہوا اور نہیں ہو رہا ہے؟ کیا بات ہے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کی تاریخ اس دعوے سے پہلے کیوں شروع ہوتی ہے؟ آخر جس نوع کے اکثر افراد اب بھی کسی نہ کسی نبی کو مانتے ہیں کیسے کہا جائے کہ انھیں لوگوں میں نبوت پر اعتقاد کرنے کا جذبہ مفقود ہو گیا؟ ہاں مفقود ہو گیا ہے۔ لیکن صرف خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے پچھلوں پر، ورنہ اگلوں پر جو آپ سے پہلے نبوت کے دعوے کے ساتھ آئے ان پر ایمان لانے والوں کی دنیا میں کیا کمی ہے؟ اس انگریزی مفکر کا سوال خود اس کے ہم وطنوں کے لیے قابل غور ہے کہ جب جذبات انسانی کے ہر شعبے میں انقلاب برپا کرنے والے آ رہے ہیں تو پھر بتایا جائے کہ جذبہ مذہبی کے انقلابوں کا سلسلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کیوں رک گیا؟ حالاں کہ مذہب کی تاریخ

---

❶ ظہور اسلام کے بعد بعض یہودیوں نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ختم نبوت کے دعوے کو منسوب کرنے کی جسارت کی لیکن من جملہ بیسیوں سوالات کے ایک بڑا سوال یہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے جب نبوت کا دعویٰ یہودیوں کے آگے پیش کیا تھا تو ان پر یہودیوں نے یہ اعتراض کیوں نہیں کیا کہ نبوت تو موسیٰ علیہ السلام پر ختم ہو چکی؟ بہر حال ختم نبوت کے دعوے کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا محض مسلمانوں کے مقابلے میں ایک افترائی دعویٰ یہودیوں کی طرف سے پیش ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھو ''الاقتصاد فی الاعتقاد'' مصنفہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

میں اتنے طویل وقفے کا تجربہ نسل انسانی کو کبھی نہیں ہوا۔

نبوت محمدیہ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ فالتو نبوت کا دعویٰ ہے:

اور سچ تو یہ ہے کہ قدرت اور اس کی کار فرمائی نے مختلف ذرائع سے دور محمدی کے بعد بکھری ہوئی دنیا کو وحدت کے جس نقطے تک پہنچا دیا ہے اور پہنچا رہی ہے، نیز تعلیمات و ہدایات کی حفاظت بلکہ نشر و اشاعت کے لیے مختلف شکلوں میں اتنے ساز و سامان مہیا کر دیے گئے ہیں کہ اس کے بعد کسی فالتو نبی اور اس کی فالتو کتاب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے۔

اب دنیا ایک ہے، ایک بستی ہے، ایک آبادی ہے، پس اس کا نبی بھی ایک ہے، اس کی کتاب بھی ایک ہے۔

الحاصل اگر درخت سے پھل پہچاننے کا لوگوں میں سلیقہ نہیں ہے تو پھل ہی سے درخت کو یہ کیوں نہیں پہچانتے؟ اور ان شاء اللہ دنیا اس کو پہچان کر رہے گی، جو آج نہیں پہچانے گا اسے منتظر رہنا چاہیے کہ کل اسی کو مقام محمود والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لوائے حمد کے نیچے اس واقعے کا اعتراف اس وقت کرنا پڑے گا جب حقیقت انسانیہ ایک دفعہ سمٹ کر وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کا نعرہ لگائے گی۔ یہ تھی اس مسئلے کی ایک گونہ تفصیل، جسے عام طور پر وحدۃ الوجود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وحدت شہود اور مسئلہ شر کی توجیہہ:

لیکن ابھی اس مسئلے کا ایک پہلو اور تشنہ ہے، سوال یہ ہے کہ جب کائنات و مافیہا کا سارا سرمایہ ''چشم ساقی'' سے ''وام'' (1) لے کر حاصل کیا گیا ہے یعنی حق تعالیٰ نے اپنے ہی کمالات و صفات، اسماء و شیون کو اپنے سے باہر فرض کر کے پیدا کیا ہے تو پھر اس عالم میں ناقص و عیب دار، مضر اور موذی چیزیں کیوں ہیں؟ کیوں کہ ظاہر ہے کہ خداوند

---

(1) یعنی قرض لے کر۔

قدوس اور اس کے سارے اسما ہر قسم کے عیوب ونقایص سے پاک ہیں۔

شر کی توجیہ میں بعضوں کے خیالات:

اس مسئلے کے متعلق بدھسٹ، ہندو، پارسی مذاہب اور ابن رشد وغیرہ کے خیالات بھی پڑھنے چاہییں ❶۔

---

❶ بدھ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ وہ شر کی علت انسان کی جزئی تمناؤں کو قرار دیتا تھا۔ ان ہی جزئی تمناؤں کا تصادم جب ارادۂ کلیہ سے ہوتا ہے تو انسان اس کی تعبیر شر سے کرتا ہے، یا یوں کہو کہ جب جہل علم سے ٹکراتا ہے تو اس سے وہ شے پیدا ہوتی ہے جسے ہم شر کہتے ہیں۔ اس کے بعد ازالۂ شر کی تدبیر یہ بتائی جاتی ہے کہ انسان ہر قسم کی آرزوؤں اور تمناؤں سے معریٰ اور خالی ہو کر اپنے جہل کو علم مطلق کے دھارے پر بے تھاہ چھوڑ دے، پھر نہ شر رہے گا نہ دکھ، نہ درد، یقیناً یہ ایک اچھا شعر ہے جو کہا گیا لیکن کیا یہ تمنائی حقیقت جس کا دوسرا نام انسان ہے وہ تمناؤں سے دست بردار ہو سکتا ہے؟ قدرت پر ہی تو اعتراض ہے کہ آرزوؤں سے بھرے ہوئے انسان کو کیوں پیدا کیا؟ اور پیدا کیا تھا تو اس کی تکمیل کی صورت پیدا کی ہوتی، پیاسا بنا کر پانی سے محروم رکھنا اس سے بڑا الزام قدرت پر اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں نے مسئلۂ تناسخ سے اس کو حل کرنا چاہا ہے، مگر صفاتی تفاوت کی بنیاد اگر تناسخ پر رکھی جائے تو سارا عالم صرف سزا یافتہ بن کر رہ جاتا ہے، یعنی جمادات میں نباتات کے مقابلے میں، نباتات میں حیوانات کے مقابلے میں، حیوانات میں انسان کے مقابلے میں، پھر انسانوں میں عورتوں کے اندر مردوں کے حساب سے جو فطری کوتاہیاں پائی جاتی ہیں، کہنا پڑے گا کہ یہ سارے نقایص وشروران سب میں ان کے گزشتہ کرم اور عمل کا نتیجہ ہیں۔ گویا عالم کا ذرہ ذرہ اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے، عالم نہ ہوا سزا یافتوں کا گویا ایک کیمپ ہو گیا۔ یوں ہی پارسیوں نے ایک ہی چیز کے دو پہلو خیر وشر کو دیکھ کر دھوکا کھایا اور ایک مخلوق کے لیے دو خالق کا احمقانہ نظریہ پیش کیا۔ آخر کھلی ہوئی بات ہے کہ دنیا کی ایک ہی چیز مثلاً آگ سے جب روٹی پکتی ہے، روشنی ملتی ہے تو ہم اسے خیر سمجھتے ہیں، پھر یہی آگ جب گھروں کو جلاتی ہے تو اسی کو شر قرار دیتے ہیں۔ الغرض خیر وشر عموماً ایک ہی چیز کے صحیح وغلط استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ پس ایک ہی شے کے لیے دو خالق کی تھیوری ابلہی نہیں تو اور کیا ہے؟ ابن رشد نے قدرت پر حملہ کیا۔ اس نے کہا کہ خدا اس آگ کو کس طرح پیدا کر سکتا ہے جس سے کھانا تو پک جائے لیکن گھر نہ جلے؟ کیا اس کے معنی یہ نہ ہوئے کہ خدا عاجز ہے؟ وہ شر سے جدا کر کے اس خیر محض کو پیدا کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا۔ تعالی اللّٰہ عن ذلک علوا کبیرا!

اصل یہ ہے کہ اس مسئلے کے سمجھنے میں ایک اصولی غلطی کی جاتی ہے یعنی ناقص اور مضر چیزوں کو ایک ہی سوال میں درج کر کے جواب دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے اس طرح سوچنا چاہیے کہ عالم میں ناقص چیزیں کیوں ہیں؟ یعنی کائنات کے مختلف انواع مثلاً جمادات، نباتات کے نباتات حیوانات کے اور حیوانات انسان کے صفات سے کیوں محروم ہیں؟ یا یوں کہو کہ ایک ہی نوع کے مختلف افراد میں صفاتی تفاوت کیوں ہے؟ مثلاً انسان ہی کے مختلف افراد صورت و شکل، دل و دماغ، بلکہ کبھی کبھی مختلف حواس و آلات ادراک کے اعتبار سے کیوں مختلف ہیں؟ مثلاً کوئی خوب صورت ہے، کوئی بدصورت کوئی ذہین ہے کوئی غبی۔ حتیٰ کہ کسی کی بینائی تیز ہے اور کسی کی شنوائی بلکہ جہاں عام طور پر لوگ بینائی کا کمال لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ کبھی کبھی آدمی اس کمال یا صفت سے محروم بھی پیدا ہوتا ہے۔ الحاصل! غور اس پر کرنا چاہیے کہ اشیائے عالم کے اس صفاتی تفاوت کا راز کیا ہے؟ اسی کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ عالم میں ناقص چیزیں کیوں پائی جاتی ہیں؟ مگر عام طور سے یہ غلطی کی جاتی ہے کہ یہاں اس نقص ہی کو شر قرار دے کر پوچھا جاتا ہے کہ ''کامل خدا سے ناقص مخلوقات کی پیدائش کیسے ہوئی؟''

لیکن غالباً گزشتہ بالا تفصیل پر غور نہیں کیا گیا، ورنہ میں بتا چکا ہوں کہ عالم کی ہر ہر چیز حق تعالیٰ کے تمام صفات اور اس کے اسمائے حسنیٰ کی مظہر اور آئینہ بردار نہیں ہیں، بلکہ بہ تدریج مختلف اشیا میں مختلف صفات کے مختلف مدارج کا ظہور ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ کسی میں ایک، کسی میں دو، علیٰ ہذا القیاس بڑھتے ہوئے ایک ذات پر ظہور کی یہ جنبش ختم ہوتی ہے۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ ایسی صورت میں کسی ایک شے میں ان تمام کمالات کو تلاش کرنا جن سے مستجمع کمالات یعنی ذات حق موصوف ہے، کس قدر عجیب تلاش ہوگی۔ وہ دیوانہ ہے جو صرف آکسیجن یا صرف ہیڈروجن میں ان آثار و خواص کو تلاش کرتا ہے، جو ان دونوں کے باہمی اجتماع سے پانی کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن جہاں آکسیجن پانی کے خواص سے محروم ہے تو کیا اپنی جگہ وہ خود ذاتی خواص و آثار

بھی نہیں رکھتا ہے؟ اور یہی حال تمام اشیائے عالم کا ہے۔ بلا شبہ ان میں ایک چیز ان کمالات واوصاف سے قطعاً محروم ہے جو ذات حق کے ساتھ مخصوص ہیں، جہاں سارے بکھرے ہوئے کمالات سمٹ کر بہ شان اجتماعی پائے جاتے ہیں، لیکن اپنی جگہ پر وہ جس کمال کا جس حد تک مظہر ہے، کون ہے جو اس سے بھی اس کو محروم قرار دے سکتا ہے، لوگوں کو مغالطہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ عالم کی چیزوں کا باہم ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں اور اس کے بعد عیب یا نقص کا حکم لگاتے ہیں۔ مثلاً نباتات کو حیوانات سے، یا اندھوں کو سونکھوں سے ناپتے ہیں اور پھر ان کی طرف نقص یا عیب کو منسوب کرتے ہیں، حالاں کہ اگر وہ کمالات کی کسی ایک صنف سے محروم ہیں تو کیا اسی وقت دوسرے کمالات کی وہ آئینہ برداری نہیں کررہے ہیں؟ یقیناً جو چیز جس صفت کی مظہر نہیں تھی پھر اس صفت کو اس میں تلاش کرنا اس شے کا نقص نہیں بلکہ تلاش کرنے والے ہی کا جہل ہے، جو صرف نمک میں قورمہ کا مزہ تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا۔ بتلاؤ کہ یہ نمک کا قصور ہے یا اس ڈھونڈنے والے کا؟

پس اصل یہ ہے کہ عالم کا ہر ذرہ صفات الٰہیہ کے مختلف اصناف و مدارج کا مظہر ہے، اس لیے ایک کے آثار وخواص کا دوسرے میں پایا جانا یقیناً ناممکن ہے۔

جدید تحقیقات میں یہ نظریہ جو قایم کیا گیا ہے کہ عالم کی مشابہ سی مشابہ چیزیں واقع میں مشابہ نہیں ہیں، حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ گلاب کی دو پنکھڑیاں بھی باہم ایک دوسری کی حقیقی مثنیٰ نہیں ہیں، یہ صوفیۂ کرام کے اس دعوے کی توثیق ہے کہ تجلیات میں تکرار نہیں ہے، ورنہ حق تعالیٰ کی طرف عبث کاری کا الزام عاید ہوگا، یعنی ایک ہی صفت کے ایک ہی درجے کو دو دفعہ ظاہر کرنا بے فایدہ ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تعلیم ہے کہ عالم کی جس چیز پر انسان کی نظر پڑے تو اس وقت اس کا علم صرف ''بحمدہ'' کا نہیں بلکہ ''سبحان اللہ وبحمدہ'' کا ہو، جس کا مطلب یہی ہے کہ اس شئے میں جو نقص ہے وہ کمالات سے خالی ہونے کا نتیجہ ہے اور خدا کی ذات اس نقص سے پاک ہے، اور جو کمال ہے وہ اس کا نہیں ہے بلکہ خدا کا ہے۔ اسی

بنیاد پر صوفیوں کی ایک جماعت نے ''وحدتِ وجود'' کے ساتھ ''وحدتِ شہود'' کا نظریہ قایم کیا ہے، جس کی شرح وہ یہ کرتے ہیں کہ عالم کی اصل حقیقت عدم ہے، اس کے تمام نقایص وعیوب کی ذمہ دار اس کی یہی حقیقت ہے اور اس میں جو وجودی کمالات نظر آتے ہیں ان کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات ہے، پس اشیائے عالم میں نقص خدائی صفات کے ظہور کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس ظہور سے خالی ہونے کا یہ نتیجہ ہے۔

اور یہ باتیں تو ان کے لیے ہیں جن کے سامنے آفاق وانفس کا سارا اجتماعی مرقع نہیں ہے، یا جو اجتماعی طور پر عالم کے ماضی وحال ومستقبل اور شہادت وغیب کو نہیں دیکھ سکتے، ورنہ جن کی نگاہیں وسیع ہیں ان کا بیان ہے کہ ع

ہمہ عالم گواہ عصمت اوست

یعنی جو چیز یہاں ناقص نظر آتی ہے سارے عالم کے لیے وہی کمال ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جو زلف وگیسو اور چشم وابرو کو الگ الگ کر کے دیکھے گا کیا وہ ان چیزوں میں وہی لذت وسرور پا سکتا ہے جو کسی عارض زیبا پر آراستہ ہونے کے بعد حاصل ہو سکتا ہے؟ یقیناً کجی بھی کمال ہے لیکن کمان کے لیے اور راستی بھی کمال ہے لیکن تیر کے لیے اور کمالی نتایج دونوں کے ملنے ہی سے ظاہر ہوتے ہیں۔

❁❁❁

باب ہفتم:

مسئلہ اقتضا و تقدیر

گزشتہ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا کہ کائنات کے غیر محدود کمالات دراصل حق تعالیٰ کے غیر محدود اسماو صفات کے مختلف مدارج و مراتب کے مظاہر و تجلی گاہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ہر شے اپنے آثار و خواص کے لحاظ سے دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ ایک ہی نوع کے دو فرد بھی ہر لحاظ سے باہم مساوی نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً دو آدمی اپنی اندرونی اور بیرونی ساخت کے لحاظ سے جس قدر بھی متحد نظر آتے ہوں تاہم تجربے کے بعد ظاہر ہو گا کہ کسی نہ کسی نقطے پر پہنچ کر دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ بہر حال مختلف اسماو صفات کے ظہور کے مختلف مدارج ہیں اور انہی کے مختلف خواص و آثار کو تصوف کی اصطلاح میں ''اقتضا'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پھر چوں کہ حق تعالیٰ نے اپنے تمام اسماو صفات کے ان مختلف نتائج کو خوب ناپ تول کر، جانچ پرکھ کر پیدا کیا ہے، کیوں کہ اپنے اسماو صفات کی مختلف ترکیبوں کے مختلف نتائج سے وہ واقف نہ ہو گا تو کون ہو گا۔ اسی لحاظ سے اس اقتضا کا نام مذہب میں ''تقدیر'' ہے یعنی ہر چیز کے تمام نتائج کا اندازہ خالق نے پہلے ہی کر لیا ہے اور یہ ایسا اٹل انداز ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ قرآن پاک میں اسی کی طرف

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا. (سورۂ طارق: ۲۸)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ بنالیا ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ. (سورۂ قمر: ۴۹)

یعنی ہر چیز کو ہم نے ایک خاص انداز سے پیدا کیا ہے وغیرہ آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ اسی کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کرتے:

كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعِجْزَ وَالْكَيْسَ.

''ہر چیز تقدیر ہی سے ہے، حتیٰ کہ کسی کا دانش مند ہونا، کسی کا عاجز و کودن ہونا یہ بھی تقدیر سے ہے۔'' (جمع الفوائد بحوالہ مؤطا امام مالک و مسلم)

مطلب یہ ہے کہ نہ صرف بیرونی اوصاف کا اختلاف بلکہ اندرونی لحاظ سے بھی افراد انسانی جو باہم مختلف ہیں، یہ ان اسما ہی کا نتیجہ ہے جن کے ہم مظہر واقع ہوئے ہیں۔ کسی کا طاقت ور ہونا اور کسی کا کمزور ہونا، کسی کا حسین ہونا، کسی کا بدصورت ہونا، کسی کے دماغ کا شعر سے مناسب ہونا اور کسی کا ریاضی سے، کسی کا دولت کمانے میں ہوشیار ہونا اور کسی کا اس سے عاجز ہونا، حتیٰ کہ ان مظاہر اسما کا اپنی مدت ظہور میں متفاوت ہونا مثلاً کسی کے ظہور کا ہزار سال تک دراز ہونا جیسے آفتاب و ماہ تاب اور دیگر سیارے ہیں، کسی کا چند منٹ کے بعد ختم ہو جانا مثلاً ان جراثیم کا جو پانی اور ہوا میں پیدا ہو ہو کر ہر وقت مٹتے رہتے ہیں اور اسی طرح ہم انسانوں کا مدت ظہور میں مختلف ہونا، یعنی کسی کا سو سال زندہ رہنا، کسی کا پیدا ہونے کے ساتھ ہی مر جانا، یہ سب بھی اسما وصفات ہی کا اقتضا ہے اور تقدیر الٰہی سے ہے، اسی لیے اٹل ہے۔ بہر حال یہ تو اس سوال کا جواب تھا کہ اشیائے عالم میں باہم صفاتی اور آثاری تفاوت کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ مذہب نے جو اس کی تشریح کی ہے اس سے حق تعالیٰ پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا، انسان کا کیا بگڑتا ہے اگر مٹی میں پانی کے، املی میں آم کے اور شیر میں لومڑی کے، سانپ میں بچھو کے اور شکر میں سنکھیا کے خواص و آثار نہیں پائے جاتے ہیں یا اگر مکھی کی عمر گدھ کی عمر کے مساوی نہیں ہوتی؟ بلکہ بہ قول ذوق

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہان کو ہے زیب اختلاف سے

یعنی اگر صفات کا ظہور اس شان سے نہ ہوتا بلکہ حق تعالیٰ اپنے تمام صفات کے تمام مدارج کا ظہور ایک ہی شے میں فرما دیتے تو قطع نظر اس سے کہ کائنات کے

موجودہ قوانین کا نظام درہم برہم ہو جاتا، کیا اس کا لازمی نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ یہ ان گنت چیزوں والی بے تھاہ دنیا صرف ''ایک شئے'' والی دنیا بن کر رہ جاتی؟ الحاصل! آفاقی ہوں یا انفسی، جو آثار بھی یہاں نظر آرہے ہیں سب خدا ہی کے اسما وصفات کے مظاہر ہیں اور ہر آن، ہر لمحہ، رب قیوم اپنے ارادہ ''کُن فیکون'' سے اپنے اپنے وقت پر ان چیزوں کو ظاہر فرمارہا ہے۔

پس ہستی کے دایرہ میں ذرہ سے آفتاب تک، شہادت سے غیب تک جو کچھ ہوا، ہورہا ہے، ہوتا رہے گا، وہ صرف اذن حق، فعل حق، تقدیر حق سے ہورہا ہے اور ہوگا۔ مذہبی مستندات اور نوشتے اسی واقعے کی تعلیم سے معمور ہیں، اور میں نے بہ تفصیل بتایا کہ عقل وفطرت بجز اس کے اور کچھ مان بھی نہیں سکتی۔ صوفیہ کرام کی خاص اصطلاح میں مذہب کے اسی مسئلے کے مختلف مقامات اور منزلوں کی یافت کو توحید افعالی، توحید صفاتی، توحید آثاری، انا الحق، حقیقت محمدیہ یا کبھی فارسی زبان میں ہمہ اوست، ہمہ با اوست، ہمہ از اوست وغیرہ الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے [1] اور یوں ان لوگوں کو جو طلب حق کے ارادے سے کھڑے ہوتے ہیں، مظاہر کے علم سے ظاہر کی ذات تک، یا آثار کے علم سے موثر کے وجود کے یقین اور حضور کی ان کو مشق کرائی جاتی ہے، علمی حد تک مذہب کے تمام اصول وعقاید اس مسئلے کے سمجھ لینے کے بعد روشن ہو جاتے ہیں۔

غم اور اسباب غم یا وجود شر کی توجیہ:

اب تک جو کچھ بتایا گیا یہ کاینات کے صفاتی تفاوت کا راز تھا لیکن ابھی سوال کا دوسرا رخ باقی ہے اور اسی سے مذہب کا علمی پہلو پیدا ہوتا ہے، یعنی شر کا وجود کیوں ہے؟ قرآن پاک نے متعدد مقامات پر اس کا صاف اور واضح جواب دیا ہے، ان میں سے مشہور آیت یہ ہے:

---

[1] ان کی ان ہی مقامات اور منزلوں کی توجیہ سے لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ صوفی کبھی سارے عالم کو خدا کہتا ہے، کبھی انسان (انا الحق کے مظہر) کو خدا قرار دیتا ہے، کبھی حقیقت محمدیہ کے ناسوتی ظہور (سرور کاینات صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا سمجھتا ہے۔ حالاں کہ اس میں جو واقعہ ہے وہ آپ جان چکے۔

مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ O (سورۂ نساء:۷۹)

جس کا حاصل یہ ہے جن چیزوں سے انسان کو راحت وسکون ملتا ہے یا اچھی معلوم ہوتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں، لیکن جن چیزوں سے تکلیف واذیت ہوتی ہے یا بری معلوم ہوتی ہیں گو اس کا بھی خالق خدا ہی ہے لیکن اس کی پیدائش کی وجہ خود انسان ہی ہے اور وہی اس کا ذمے دار ہے۔ کیسی عجیب بات ہے، غم اور اسبابِ غم کو پیدا تو خدا کرتا ہے لیکن ان کا ذمے دار انسان ہے؟ مسئلۂ تقدیر کا یہی تضاد ہے جس نے مذہب کے اس عجیب وغریب دعوے کو عوام کی نگاہوں میں سخت پیچیدہ بنا دیا ہے۔

حق تعالیٰ کی ذات تو برتر ہے، کسی ادنیٰ آدمی کی طرف بھی اس امر کے انتساب کی جرأت مشکل ہے، صرف یہی نہیں کہ عقل وفطرت سے یہ مسئلہ اُچٹ جاتا ہے بلکہ سچ پوچھو تو تقدیر کے جو معنی عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، اگر واقعہ بھی وہی ہے تو ساری مذہبی تحریک بے معنی ہو جاتی ہے، بلکہ اگر منصب نبوت صداقت کے تحت نہیں بلکہ کسی مصلحت کے زیر اثر ہوتا تو جس مسئلے کو سب سے زیادہ چھپانا انبیا کا فرض تھا وہ یہی مسئلہ ہوتا لیکن از آدم تا خاتم (صلوٰۃ اللہ وسلامہم) پیغمبروں نے اس مسئلے کی تبلیغ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ صرف واقعات کے شارح ہیں، جو واقعہ تھا اس کا اظہار مسلسل وہ کرتے چلے آئے ہیں۔ البتہ مسئلہ چوں کہ پیچیدہ تھا اس لیے عوام الناس کو تاکید کر دی گئی کہ اس پر زیادہ غور وفکر نہ کریں، اور سچی بات بھی یہی ہے کہ باوجود نہ سمجھنے کے پھر بھی اگر اکثریت پر نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو وہ بہ خوبی سمجھے ہوئے ہیں۔ نہ صرف مسلمان بلکہ تمام مذہبی دنیا والے تقدیر کو بھی مانتے ہیں اور اسی کے ساتھ اپنے اعمال وافعال کا اپنے آپ کو ذمے دار بھی سمجھتے ہیں۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تفصیلی طور پر نہ سہی لیکن اجمالی طور پر انسانی فطرت ان دونوں عقیدوں میں کوئی تضاد محسوس نہیں کرتی۔ چاہیے تو یہی تھا کہ ہم بھی اس مسئلے میں خاموشی اختیار کرتے، لیکن تکمیل درس کے لیے کچھ کہا جاتا ہے۔

فطرت انسانی کا اقتضا اور اس کی تقدیر:

اصل یہ ہے کہ ایک طرف جہاں مذہب نے یہ بتایا ہے کہ آفاق وانفس میں جو کچھ ہے سب خدا کی مخلوق ہیں اور اسی لیے یقین کیا جاتا ہے کہ یہاں کے ہر ذرّے کی حرکت وسکون، خیر وشر براہ راست خالق کی توجہ والتفات کے دست نگر ہیں، لیکن اسی کے ساتھ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ سلسلۂ تخلیق وایجاد یا ظہور اسماوصفات میں انسان کا کیا مرتبہ ہے اور پھر اس لحاظ سے تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں اس کی فطرت کے اقتضا اور تقدیر کی کیا نوعیت ہونی چاہیے؟ کہا گیا تھا اور قرآن کے رو سے کہا گیا تھا کہ اس سلسلے میں انسان کا مقام..... مقام خلافت ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ سرچشمۂ کائنات کے تمام اسماوصفات کا مختلف مدارج کے لحاظ سے اجمالی طور پر جس حقیقت میں ظہور ہوا ہے اسی کا نام انسان ہے اور وہی تکوین وتخلیق کی آخری ارتقائی شکل ہے۔ اب سوچنا چاہیے کہ اس سلسلے میں جہاں حیات وعلم اور ارادہ وغیرہ صفات الٰہیہ کا ظہور انسان میں ہوا تھا اسی کے ساتھ کیا اس میں خدا کا وہ کمال نہ اترتا جس کا نام قدرت واختیار ہے؟ خدا میں جو کچھ ہے جب بالا جمال ہی سہی، سب کا عکس انسان میں آگیا ہے (اور خلافت کے یہی تو معنی ہیں) تو انسان اس خدائی کمال کے پرتو سے کیوں محروم رہ سکتا تھا؟ پس انسان بھی اگرچہ خدا کا ایک کُن فیکونی مخلوق ہے، جس طرح ساری آفاقی کائنات اس کی مخلوق ہے، لیکن منصب خلافت نے اس کی حقیقت کے اقتضا اور تقدیر کو اسی صفت اقتدار واختیار کی بنا پر سب سے الگ کردیا ہے۔ سب کی تقدیر جبر تھی اور وہی ان میں نمایاں کہ آفاق اور ان کے آثار وخواص وافعال ووظایف کے درمیان میں کہیں انتخاب یا قوت فیصلے کی جھلک تک نظر نہیں آتی، لیکن انسان کی تقدیر یا اس کی حقیقت یعنی خلافت کا اقتضاء اختیار تھا جو تقریباً اس کی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے۔ فطرت انسانی کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے اس کو ان تمام اعمال وافعال کا ذمہ دار بنادیا ہے، جن میں اس کی قوت انتخاب کو کسی نہ کسی حیثیت سے دخل ہو۔ ایسے لوگ جو انسانی حقیقت سے اختیار کے عنصر کا انکار کرنا

چاہتے ہیں حقیقت میں خدا کی تقدیر اور اپنی فطرت کے اقتضا کو جھٹلاتے ہیں۔ رعشہ کی جنبش اور ارادی حرکت میں فرق نہ کرنے والا دیوانہ ہے۔ انسان مجبور ہے یا مختار؟ ان دو پہلوؤں میں سے کسی پہلو کی ترجیح یا انتخاب خود اپنی قوت فیصلے سے اختیار کا کیا اقرار نہیں ہے؟ عارف رومیؒ نے سچ فرمایا ہے ؎

جہد حق است و دوا حق ست و درد
منکر اندر نفی جہدش جہد کرد!

واقعہ تو یہ ہے کہ عدالتی قوانین، اخلاقی آئین، بلکہ حکومتوں اور سلطنتوں سب ہی کی بنیاد انسان کے اسی نمایاں امتیاز اور عنصر خاص پر قایم ہے، ورنہ درختوں، پہاڑوں، جانوروں اور حیوانوں پر فرد جرم لگانے کے لیے عدالت کی کرسی کس نے بچھائی؟

بہر حال اپنے اعمال وافعال کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کا انتخاب یا ترجیح اسی کو اختیار کہتے ہیں اور فطرت انسانی میں اس کا ہونا عقلاً، مشاہدۃً اور شرعاً ثابت ہے، یہی اس کا اقتضا ہے اور یہی اس کی تقدیر تھی، اسی حقیقت کی تعبیریوں کی جاتی ہے کہ ''سب کی تقدیر جبر تھی اور ہماری تقدیر اختیار ہے۔''

تعلیم بالتکلیف کا اقتضا:

لیکن ابھی اس کی تقدیر اور اقتضا کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، خلافت نے اس میں اختیار پیدا کیا، یہی وہ مقام تھا جس نے انسانی پوزیشن کو نازک ترین منزل پر پہنچا دیا۔ خلافت یعنی خدا کی نمایندگی کا اقتضا یہ ہے کہ انسان اپنے اختیار کا مالک بن کر کسی دوسرے کی مرضی کے مطابق نہیں، بلکہ اپنی مرضی کے مطابق انھیں استعمال کرے اور اختیار کا اقتضا ہے کہ اس کے استعمال صحیح کے لیے علم صحیح سے اس اختیار کا دامن جوڑ دیا جائے اور یوں ہر ایک انسان اپنے اختیار کی تصحیح کے لیے اپنے ناقص علوم کا نہیں بلکہ خدا کے کامل محیط علم کا محتاج ہو گیا۔ ملائکہ کو بھی آفرینش آدم کے موقع پر یہی جواب دیا گیا تھا کہ آدم میں حق تعالیٰ کی شاگردی اور علم حاصل کرنے کی فطری صلاحیت ہے،

یعنی خدا سے علم پا کر وہ اپنے اختیار کے استعمال کی تصحیح کر سکتا ہے ❶، انسانی فطرت کے اسی تعلیمی اقتضا نے اس قانون کو پیدا کیا جسے ہم تکلیف وتشریع کہتے ہیں، جس کا ظہور انسان کی مختلف آبادیوں میں نبوت کی شکل میں ہوتا رہا ہے، یعنی ہم میں بلند ترین فطرت رکھنے والے نفوس (الرسل والانبیاء علیہم السلام) تو براہ راست حق تعالی کے شاگرد بننے اور علم پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے واسطے سے ان کی امت خدائی تعلیم کو حاصل کر کے اپنے اختیارات کے حدود کو پہچانتی اور اس پر عمل کرتی ہے۔

جذبۂ امانت:

پھر اس تعلیم الہٰی کی صلاحیت پیدا کرنے ہی کا یہ اقتضا ہوا کہ انسان میں امانت کا جذبہ رکھا جائے، جس سے اس میں اس کا احساس پیدا ہو کہ وہ اپنی مرضی کا نہیں بلکہ اپنے اعمال وافعال میں اس کی مرضی کا پابند ہے جس کا یہ امین ہے ❷۔ اگر انسان میں

---

❶ مطلب یہ ہے کہ انسان کے خلیفہ ہونے کی خبر جب فرشتوں کو سنائی گئی تو ملائکہ نے یہ پیش گوئی کی کہ ''یہ زمین میں فساد وخون ریزی برپا کرے گا۔ بہ ظاہر اس پیش گوئی کی وجہ یہی تھی کہ الانسان جیسے جہول ظلوم کو جب اختیار دیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ اختیار کو وہ غلط طریقے سے استعمال کر کے فساد وفتنہ ہی برپا کرے گا۔ جواب میں دکھایا گیا ہے کہ آدم حق تعالی کی تعلیم کو قبول کر لیتا ہے، گویا یہ اشارہ تھا کہ خدا سے علم لینے کی چوں کہ اس میں صلاحیت ہے اس لیے اپنے اختیار کی تصحیح یہ حق تعالی کے عطا کیے ہوئے علم یعنی مذہب سے کر لے گا۔

❷ امانت کا یہی جذبہ ہے جس کی تعبیر کبھی کانشنس (ضمیر) حاسۂ اخلاقی، احساس فرض وغیرہ مختلف الفاظ سے کی جاتی ہے۔ ہمیں اپنی خواہش کی نہیں بلکہ اپنے فرض منصبی کی تعمیل کرنی چاہیے۔ انسانی فطرت کا یہ ایسا بدیہی احساس ہے کہ جو خدا کے قایل نہیں ہیں وہ بھی اپنے اندر اس مطالبے کا پتا دیتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے فرض کا احساس سب کو ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اس فرض کا عاید کرنے والا کون ہے؟ جب اپنی خواہش کی پابندی نہیں بلکہ فرض منصبی کی پابندی ہی انسان کا فریضہ ہے تو قدرتاً اپنے سوا اس کو ڈھونڈنا چاہیے، جس کے فرض کی بجا آوری کا مطالبہ ہمارا ضمیر کرتا ہے۔ یہی میرا مطلب ہے کہ جذبۂ امانت ہی نے آدمی میں مرضئ حق کی تلاش کی یہ تڑپ پیدا کی اور یہی چیز آدمی کو ان بزرگوں کے قدموں پر جھکاتی رہی ہے جو خدا کا پیغام لے کر بنی آدم میں آتے رہے ہیں۔

امانت کا جذبہ نہ ہوتا تو تعلیم الٰہی کی تلاش کا جذبہ بھی اس میں پیدا نہ ہوتا، اور یہ مطلب ہے اس حدیث کا جس میں وارد ہوا ہے:

لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَآ اَمَانَةَ لَهٗ.

''جس میں امانت نہیں اس میں ایمان بھی نہیں ہے۔''

قرآن میں جہاں امانت کے اس جذبے کا ذکر ہے وہاں بیان کیا گیا ہے کہ ''امانت کا جذبہ انسان میں نہ ہوتا تو وہ ظلوم وجہول بن کر رہ جاتا۔'' اس کا یہی مطلب ہے کہ اگر انسان کے اختیارات پر امانت کی میخ نہ ٹھونک دی جاتی تو علمی و عملی قوتوں میں اپنے اختیار کے غلط استعمال سے آدمی جاہل ہی نہیں جہول (بڑا سخت جاہل) اور ظالم نہیں ظلوم (بڑا سخت ظالم) بن جاتا۔ اور دیکھا گیا ہے کہ جذبۂ امانت سے جو تھوڑا بہت کبھی ہٹے ہیں انھوں نے اپنی ظلومیت اور جہولیت کا ہمیشہ ثبوت دیا ہے۔ آخر فلسفہ ❶ اور متھالوجی میں انسان کی جہولیت اور چنگیزیت و تیموریت، فرعونیت و رومانیت میں ظلومیت کی تصویریں جو جھلک رہی ہیں کیا ان کے تماشے کے بعد قرآن کے اس دعوے میں کوئی شک کرسکتا ہے؟ الحاصل! جذبۂ امانت بھی فطرت انسانی ہی کا اقتضا تھا۔ امانت کے یہی معنی ہیں کہ وہ اپنی مرضی کا نہیں بلکہ جس کا امین ہے اس کی مرضی کا پابند ہے۔

---

❶ واقعہ یہ ہے کہ صداقت و دیانت کی ضرورت جیسے عمل میں ہے ویسے ہی علم و تحقیق میں بھی آدمی ان امور کا ذمے دار ہے۔ فلسفے میں کیا ہوتا ہے؟ بے جانے ہوئے ان امور کے متعلق ادعائی آرا قایم کیے جاتے ہیں جن کے جاننے کا کوئی صحیح ذریعہ ان لوگوں کے پاس نہیں ہے جو عقل وحواس کے سوا اپنے پاس علم کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں رکھتے۔ متھالوجی یعنی اقوام قدیمہ کے خرافات جنھیں دیومالا بھی کہتے ہیں اس میں کیا کیا جاتا ہے؟ یقیناً بغیر کسی ذمے داری کے جو کچھ چاہا جاتا ہے مان لیا جاتا ہے اور یہی میرا مطلب ہے کہ جذبۂ امانت کے اقتضا سے آدمی ہٹ کر جب سوچنے، بولنے، لکھنے لگتا ہے، تو پھر وہ صرف جاہل ہی نہیں جہول بن جاتا ہے، یوں ہی اعمال و افعال میں جب امانت کی ذمے داریوں کو کوئی ٹھکرا دیتا ہے تو وہ ظالم ہی نہیں بلکہ ظلوم بن جاتا ہے۔ چنگیز، ہلاکو وغیرہ عملی خائنوں ہی کی زندہ مثالیں ہیں۔

باب ہشتم:

قانون مجازات ومکافات

اب انسانی فطرت کی اسی اقتضا نے اس کے اختیاری اعمال و افعال اور اعتقادات وافکار کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک وہ جو خدا کی تعلیم اور اس کی مرضی کے مطابق ہیں، جن کو ''دِین'' یا ''بِرّ'' کہتے ہیں اور اسی پر قایم رہنے کا نام عبدیت ہے۔ دوسرے وہ جو خدا کی تعلیم و مرضی کے مخالف ہیں، اسے ''اثم'' یا ''پاپ'' کہتے ہیں اور اسی کے مختلف مدارج کا نام عصیان وکفر اور تمرد ہے۔ اس کے بعد انسانی زندگی کے ان دونوں شعبوں کا اقتضا قدرت کا وہ قانون ہوا جسے قانون مجازات ومکافات، یا سزا وجزا کا قانون کہتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ جو اپنے اختیارات کو خدا کی تعلیم ومرضی کے موافق استعمال کرے گا وہ خدا اور اس کے سارے قوانین کو اپنی مرضی اور اپنے سارے احساسات کے مطابق پائے گا، خدا کی مرضی اور انسانی مرضی کے اس توافق کا ہی آخری عروجی مقام وہ ہے جسے مذہب کی زبان میں ''الجنۃ'' کہتے ہیں۔

الجنۃ:

جہاں انسان کو وہی دکھایا جائے گا جو وہ دیکھنا چاہتا ہے اور وہی سنایا جائے گا جو وہ سننا چاہتا ہے۔ قرآن نے اسی مقصد کو

لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيَ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ.

(سورۂ حٰم السجدۃ: ۳۱)

کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ پھر مختلف جزئیات کے ذریعے سے ''الجنۃ'' کے متعلق اسی اجمال کی تفصیل کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں صرف خیر ہی خیر ہے شر کا نام نہیں ❶۔

❶ جنتی زندگی کے متعلق ایک وسوسہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی فطرت ایک ہی چیز کی کثرت وتکرار سے اکتا◄

الجنتہ کے متعلق مسیحی عقیدہ:

عیسائیوں نے ''الجنتہ'' کا یہ عجیب ترجمہ کیا ہے کہ وہاں انسان اپنے تمام احساسات انسانی سے محروم کر دیا جائے گا۔ اسی کی تعبیر یہ ہے کہ آدمی اخروی زندگی میں فرشتہ بن جائے گا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ عیسائیوں کی یہ جنت اعمال انسانی کی جزا ہے یا سزا؟ ضعف بصر کے شاکی کی اگر طبیب آنکھ نکال لے تو یہ مریض کے ساتھ مہر ہوئی یا قہر؟ آج کل مسیحی اسی جنت کو ''روحانی جنت'' کہتے ہیں، جو سراسر ایک عیسائی عقیدہ ہے۔ زمانہ حال کے بعض مسلمانوں نے اس مسیحی جنت کو سائنٹفک تحقیقات کا نتیجہ سمجھ کر قرآن کی جنت کو شاعری قرار دیا ❶، عجیب بات ہے! گویا خدا نے قصداً غریب

◄ جاتی ہے۔ قرآن میں اسی وسوسے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا (جنتی جنت سے الگ ہونا نہ چاہیں گے) ایسا کیوں ہوگا؟ غالباً اسی کے جواب کی طرف آگے اشارہ کیا گیا ہے۔ اگلی آیت میں جس کا حاصل یہ ہے کہ ''کلمات رب غیر محدود ہیں، اگر سمندر کو روشنائی بنا کر لکھا جائے تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے۔'' میرے خیال میں یہی جنت سے عدم تحویل کی وجہ ہوگی یعنی ہر لحظہ نئی نئی کیفیتوں کے ساتھ حق تعالیٰ تجلی فرماتے رہیں گے، جس کا سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ الغرض اسی وسوسے کا جواب دیا گیا ہے۔ میرے نزدیک اس آیت قرآنی ''قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا'' میں بھی اور كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا میں بھی جس کا مطلب یہ ہے کہ (جب اہل جنت کو کوئی پھل دیا جائے گا تو وہ خیال کریں گے کہ یہ تو وہی ہے جو پہلے ملا تھا، حالاں کہ یہ واقعہ نہ ہوگا۔ معنی کے اعتبار سے ہر پھل دوسرے پھل سے بالکلیہ متغائر ہوگا۔ اگرچہ صورتاً متشابہ ملتے جلتے ہوں گے۔ جیسے صورتاً دنیا کے پھلوں اور جنت کے پھلوں میں ممکن ہے صوری مشابہت ہو، لیکن حقیقت میں بھلا کیا اشتراک؟ اسی حقیقت کے اعتبار سے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اہل جنت کی آنکھوں کی ٹھنڈک جو جنت میں مہیا کی گئی ہے اسے دنیا کا کوئی شخص نہیں جانتا۔ اسی کی شرح حدیث میں ہے کہ جنت میں نیک بندوں کے لیے ایسی چیزیں مہیا کی گئی ہیں جنھیں نہ آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا، نہ دل میں ان کا خیال گزرا۔

❶ یہی وجہ ہے کہ قرآنی جنت کے حور و قصور اور انہار و اشجار کے ذکر سے عصر حاضر کے سادہ لوحوں کے دلوں میں گرانی پیدا ہو گئی ہے۔ گویا چاہا جاتا ہے کہ جنتی آدمی کے لیے ضروری ہے کہ نہ کھانے کی لذت ◄

مسلمانوں کو اپنے طرزِ بیان سے مغالطے میں مبتلا کر دیا ہے۔ امام غزالیؒ نے سچ فرمایا

◄اس میں باقی رہے نہ پینے کی۔ الغرض سارے لذائذ حیات سے محروم ہو کر روحانی جنت میں داخل ہو۔ حالاں کہ جنت تو جنت، اس دنیا میں بھی تو آدمی اس بیماری کی مصیبت کو برداشت نہیں کر سکتا اور علاج و معالجہ پر مجبور ہوتا ہے۔ باقی یہ بات کہ عیسائیوں میں یہ عقیدہ کہاں سے پیدا ہوا؟ انجیل کی ایک آیت سے ان کو مغالطہ ہوا، جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس یہودی کو جس نے متعدد شوہروں کی بیوی کے متعلق دریافت کیا تھا کہ ایسی عورت آخرت میں کس شوہر کو ملے گی؟ مسیح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

''اس جہاں کے فرزندوں میں تو بیاہ شادی ہوتی ہے، لیکن جو لوگ اس لائق ٹھیریں گے کہ اس جہاں کو حاصل کریں اور مردوں میں سے جی اٹھیں، ان میں بیاہ شادی نہ ہوگی۔'' (لوقا: ۲۱-۳۵)

مختلف انجیلوں میں یہی جواب مختلف الفاظ میں پایا جاتا ہے، جس کا ظاہر مطلب تو یہی تھا کہ زن و شوہر میں جو ازدواجی تعلق یہاں قایم ہوتا ہے وہ مرنے کے بعد باقی نہیں رہتا، اس لیے بیوہ عورت دوسرے مرد سے شادی کر سکتی ہے۔ اس لیے یہودیوں کا وہ سوال ہی غلط تھا، مگر عیسائیوں کو اس فقرے سے مغالطہ لگا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس کے بعد انجیلوں کے یہ الفاظ کہ وہ فرشتوں کے برابر ہوں گے شرحِ انجیل کا اضافہ ہے، یا یہ مطلب ہے کہ فرشتے باہم ایک دوسرے سے جدا جدا ہوتے ہیں، مرنے کے بعد اٹھنے والے بھی فرادیٰ (الگ الگ) اٹھیں گے، کسی عورت کا کوئی شوہر بن کر نہ اٹھے گا۔ بہر حال کچھ بھی ہو مرنے کے بعد جینے والے انسان، انسان باقی نہیں رہتے بلکہ نیک ہوئے تو بجائے انسان ہونے کے فرشتے اور بد ہوئے تو شیطان، جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے یا جیسا کہ تناسخ والے کہتے ہیں کہ دوسری زندگی میں آدمی، آدمی نہیں گھوڑا، ہاتھی بن جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں ظاہر ہے کہ سائنس یا فلسفے سے ان کو دور کا بھی تعلق نہیں، بلکہ عیسائیوں اور ہندوؤں وغیرہ کے مذہبی عقاید ہیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ انسان ہر حال میں خواہ نیک ہو یا بد، دوسری زندگی میں بھی انسان ہی باقی رہتا ہے، نہ وہ گھوڑا بن جاتا ہے نہ ہاتھی، نہ شیطان نہ فرشتہ اور نہ خدا، جیسا کہ ویدانت والے فنافی الاصل کے نظریے کی بنیاد پر قایل ہیں۔ اس لیے جنت میں ہو یا دوزخ میں انسان اپنے سارے انسانی احساسات کے ساتھ داخل ہوگا، لیکن عجیب بات ہے کہ اس زمانے کے مغرب زدہ مسلمانوں کا ایک گروہ اسی عیسائی عقیدے کو ایک عقلی نظریہ قرار دے کر قرآن کی جنت کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ عیسائی بیچارے تو مجبور ہیں، علاوہ انجیل کے مذکورہ بالا فقرے کے عورتوں کے متعلق سیکڑوں سال تک ان کو باور کرایا گیا کہ انسانی گناہ کی وہی ذمہ دار ہے۔ اسی لیے عورت صرف پاپ ہے، نجاست ہے، غلاظت ہے۔ بھلا اس مجسم گندگی کو حوروں کی شکل میں عیسائی ذہنیت کیسے برداشت کر سکتی ہے کہ وہ جنت میں ہوں، لیکن مسلمانوں کی جنت کا پتا جب ماں یعنی عورت کے قدم کے نیچے دیا گیا ہے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ پھر وہ قرآنی جنت میں حور کے تذکرے سے کیوں گھبراتے ہیں!

ہے: مجاز و استعارہ کی اتنی زیادتی کہ سننے والے مغالطے میں مبتلا ہو جائیں، مجاز و استعارہ نہیں بلکہ قصداً غلط بیانی کی شکل ہے۔ بھلا کس کی ہمت ہے کہ قرآن والے خدا کی طرف العیاذ باللہ! غلط بیانی کے منسوب کرنے کی جرأت کرے؟

النّار:

اور جس طرح جنت، عبد و حق کی موافقت کلی کا نام ہے اسی طرح جو اپنے اختیارات کو خدا کی مرضی سے ٹکراتا ہے وہ امانت میں خیانت کرتے ہوئے انھیں استعمال کرتا ہے تو خدا کی مرضی بھی اس سے ٹکرانے لگتی ہے۔ انسان اور خدا کے ارادوں کا یہی تصادم ہے جو بالآخر بڑھتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے، جہاں آدمی خدا اور اس کی ساری قوتوں اور قوانین کی اپنی مرضی اور اپنے سارے احساسات کے مخالف پائے گا۔ مذہب کی زبان میں اسی کا نام النار اور جہنم ہے، جہاں کا ہر قانون انسان کی ہر خواہش اور اس کے ہر احساس کا مخالف ہوگا۔ اسی کو قرآن نے:

كُلَّمَا اَرَادُوْا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا اُعِيْدُوْا فِيْهَا. (سورۂ سجدہ: ۲۰)

''جب بھی وہ جہنم سے نکلنا چاہیں گے اسی میں پلٹا دیے جائیں گے۔''

کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ اس کی جزئی تفصیلات سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں شر مطلق ہے، وہاں خیر کا نام و نشان نہیں۔

یہ مسئلہ کہ جہنم کا عذاب ابدی ہے یا بالآخر ختم ہو جائے گا؟ قرآن میں اس کا ذکر کرتے ہوئے "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ" (سورۂ بروج: ۱۶) رب کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی وہ جو چاہے کرے۔ شیخ اکبرؒ وغیرہ کا خیال ہے کہ جہنمی اگرچہ رہیں گے تو ہمیشہ جہنم ہی میں، لیکن ایک مدت کے بعد جہنم کے آبادکاروں میں بن جائیں گے، یعنی اس سے ان کے مزاج کو موافقت ہو جائے گی۔ اس صورت میں الم اور دکھ ان کا شاید باقی نہ رہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کچھ بھی ہو جہنم کی یہ صفت کہ وہ عذاب مہین بھی ہے یعنی جو اس میں داخل ہوں گے، ذلت کی زندگی گزاریں گے، یہ ذلت و خواری کا طوق تو ان کی گردن سے اتر نہیں سکتا۔

الحاصل خلافت کا اقتضا اختیار کا اقتضا تعلیم و تکلیف، امانت و ذمہ داری تھی، اور ان سب کا اقتضا مجازات کا اقتضا اگر ایک طرف موافقت کلی یعنی جنت ہے تو دوسری طرف مخالفت کلی یعنی جہنم ہے اور یہی انسانی فطرت کا اقتضا اور اس کی تقدیر بھی۔ اور اب قرآن کے اس بیان کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ”شر کا وجود تم سے باہر نہیں بلکہ تمہارے اندر ہے“ اور غالباً یہی مطلب ہے آیت:

اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌۢ بِالْكَافِرِيْنَ. (سورۂ توبہ:۴۹) کا۔

”قطعاً جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔“

باب نہم:

مسئلۂ جبر واختیار

رہی یہ بات کہ حقیقت انسانی کے اس اختیار کی نوعیت کیا ہے؟ جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ کُن فیکونی مخلوقات صرف اپنی پیدائش ہی میں نہیں بلکہ اپنی بقا میں بھی ہر لمحہ ہر لحظہ اپنے خالق قیوم کے مسلسل عمل تخلیقی کی محتاج ہیں اور صرف وجود ہی نہیں بلکہ ذاتاً اور فعلاً وآثاراً بھی ہر لحاظ سے کائنات کا ہر ذرہ حق تعالیٰ سے یہی نسبت رکھتا ہے اور یہی نسبت خود انسان کو بھی ذات حق کے ساتھ ہے۔ یعنی آدمی بھی اپنی ذات میں اپنے صفات وکمالات اور افعال واعمال میں ہر وقت بغیر کسی انقطاع کے رب قیوم کے عمل تخلیق کا محتاج ہے، تو ایسی صورت میں جہاں دوسرے صفات وکمالات کی تخلیق آدمی میں اسی نوعیت کے ساتھ ہو رہی ہے تو ظاہر ہے کہ اختیار واقتدار کی صفت کا بھی یہی حال ہونا چاہیے۔ اور یہی مذہب کا دعویٰ بھی ہے کہ جس طرح بینائی، شنوائی وغیرہ کے صفات حق تعالیٰ کے مسلسل عمل تخلیق سے آدمی میں پیدا ہو رہے ہیں، یہی حال انسان کی اس صفت کا بھی ہے جس کا نام اختیار واقتدار ہے۔

پس یقیناً انسان میں اختیار پیدا ہو رہا ہے لیکن اس اختیار کے وجود اور بقا کا سلسلہ ہر لحظہ خدا کے اختیار اور ارادے کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس وقت جس طرح چاہے اپنے فیض تخلیق کو وہ روک سکتا ہے اور روک لیتا ہے۔ قطع نظر اس مشاہدے کے کہ انسانی اختیارات ایک خاص حد پر ختم ہو جاتے ہیں، مثلاً انسان کھا سکتا ہے لیکن ہر چیز نہیں کھا سکتا۔ چل سکتا ہے لیکن ہر چیز پر نہیں چل سکتا۔ دیکھ سکتا ہے لیکن ہر جگہ سے ہر چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔ وقس علی ہذا۔

پھر جن حدود میں یہ اپنے آپ کو مختار بھی پاتا ہے کیا ٹھیک انہی حدود میں بسا اوقات مجبور نہیں ہو جاتا؟ پس اصل واقعہ وہی ہے کہ گو انسان میں اختیار ہے، لیکن اس اختیار پر

اسے اختیار نہیں ہے، بلکہ اس کا اختیار اپنے وجود و بقا میں، تاثیر و نتیجے میں ہر لحظہ اختیار الٰہی کے ساتھ وابستہ اور اس کی توجہ والتفات کا دست نگر ہے، جس وقت جس حد تک خدا اس اختیار سے چاہے انسان کو محروم کرسکتا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ پس آدمی نہ آفاقی کائنات کی طرح مجبور مطلق ہے، جہاں فاعل و فعل کے درمیان قوت انتخابیہ کا پتا بھی نہیں اور نہ خدا کی طرح مختار مطلق ہے کہ اس کا اختیار نہ کسی کے اختیار سے وابستہ ہے اور نہ کوئی اس سے اختیار سلب کرسکتا ہے، بلکہ جیسا کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ انسان کا مقام جبر و اختیار کے درمیان ہے یعنی وہ مختار بھی ہے اور مجبور بھی ہے، جب تک خدا چاہے اس اختیار کو اس میں پیدا کرتا رہے، جب چاہے چھین لے، یہی مطلب ہے:

وَمَاتَشَآؤُنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ. (سورۂ تکویر:۲۹)

''نہیں چاہتے ہو تم مگر یہ کہ چاہے اللہ۔''

اور،

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَهَدَاكُمْ اَجْمَعِيْنَ. (سورۂ نحل:۹)

''اگر اللہ چاہے تو تم سب کو سیدھی راہ پر لگادے۔''

وغیرہ قرآنی آیتوں کا، جن میں انسانی مشیت و ارادے کو ارادۂ حق و مشیت حق کے ساتھ وابستہ ظاہر کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر پیغمبروں کے ایمانی مطالبے پر کافر کہا کرتے تھے۔

لَوْشَاءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا. (سورۂ انعام:۱۴۸)

''اگر خدا چاہتا تو ہم اور ہمارے آباواجداد شرک نہ کرتے۔''

یہ سچ ہے کہ انسانی اختیار کا یہی حل ہے یعنی اختیار کو چھین کر اگر حق تعالیٰ چاہیں تو لوگوں کو بجائے شرک کے توحید پر مجبور کرسکتے ہیں، لیکن اس مطالبے کے پھر یہ معنی ہوں گے کہ مختار انسان کو مجبور کردیا جائے۔ بہ الفاظ دیگر انسان سے انسانیت یعنی خلیفہ سے خلافت چھین لی جائے، جو نہ خدا کی صفات کا اقتضا ہے اور نہ فطرت انسانی کا۔ آخر ہم میں کون ہے جو سور یا بندر بننے کے لیے تیار ہے؟ مٹی بننے سے لوگ کیوں

گھبراتے ہیں؟ یعنی مر کر قبر میں جانا نہیں چاہتے، یہی بات ہے کہ مختار انسان ان صورتوں میں مجبور بن جاتا ہے اور اس کا مقام عالی اس سے چھن جاتا ہے جسے اس کی فطرت برداشت نہیں کر سکتی۔

بہر حال ان آیتوں سے یہ سمجھنا کہ خدا ہی نے انسان کو کفر وفسق پر مجبور کر دیا، فلسفۂ تخلیق اور فطرت انسانی سے جہالت کا نتیجہ ہے ❶۔ اور بات بھی یہی ہے کہ وہ (انسان) اور اس کے تمام کمالات وصفات، حتیٰ کہ اس کا اقتدار واختیار الغرض فعل و فاعل، اس کا اوّل وآخر اور وسط کے تمام اسباب وقوانین، سب کے سب رب قیوم کے مسلسل، غیر منقطع عمل تخلیق سے ہی پیدا ہو رہے ہیں اور اپنی بقاو وجود میں بھی رب قیوم ہی کی نظر التفات کے دست نگر ہیں، تاہم اسباب وعلل کے سلسلے میں کسی نہ کسی جگہ وہ چیز بھی ضرور چھپی ہوئی ہے، جس کا نام اختیار اور قوت فیصلہ وانتخاب ہے اور جو ہمیں تمام آفاقی کائنات سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی نے انسان کی ذمے داری کے دامن کو تھاما اور مجازات کے قانون کو پیدا کر کے ''شر'' کی آگ بھڑکائی، اعمال وافعال انسانی کے اسی انتساب کا نام کسب رکھا گیا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ انسانی اعمال وافعال اور اس کے سارے اسباب ونتائج کا خالق تو خدا ہے، لیکن ان کا سب کا انسان ہے اور یہی مطلب ہے قرآنی آیت:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۂ صافات:۹۶)

''اللہ نے پیدا کیا تم کو اور اس کو جو تم کرتے ہو۔''

مقصد تخلیق یا ابتلائے بالعبدیت:

فطرت انسانی کا یہی جبر نما اختیار ہے جو بالآخر آدمی کو اس مقصد تک خود پہنچا دیتا

---

❶ چوں کہ خدا نے آدمی کو مثلاً توحید پر مجبور نہیں کیا۔ اس کا یہ مطلب کیسے لیا جا سکتا ہے کہ اس نے شرک و کفر پر مجبور کیا؟ بلکہ واقعہ وہی ہے کہ توحید پر چاہتا تو آدمی کو خدا مجبور کر سکتا تھا، لیکن اس وقت آدمی خلیفہ نہیں بلکہ من جملہ آفاقی کائنات کی ہستیوں کے ایک مجبور ہستی بن جاتا۔ خلافت کے مقام پر اسی وقت تک رہ سکتا ہے جب تک کہ شرک وتوحید میں مثلاً انتخاب کا موقع اس کے لیے باقی رہے۔

ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں اختیار اور اس کی وسعت کے امکانات کا احساس ہم میں آرزوؤں اور تمناؤں کے طوفان برپا کرتا رہتا ہے اور دوسری طرف ہمارے محدود اختیارات، ہماری نارسائیاں اور تمناؤں کی شکست اور ناکامیاں مجبور کرتی ہیں کہ غریب انسان اپنی ذلت کی پیشانی کسی کے آگے جھکا دے اور سوال یا بھیک کا ہاتھ کسی کی طرف اٹھائے۔ اسی کو عبادت اور دعا کہتے ہیں، اسی کی مختلف شکلوں اور بھیسوں کا نام نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ ہے۔ کس کے آگے جھکے؟ کس سے مانگے؟ بلاشبہ اس میں بنی آدم کے مختلف طبقات مختلف رہے ہیں، لیکن نفس جھکنے اور مانگنے سے تو عموماً کسی نے انکار نہیں کیا۔ اور یوں یہ اہم سوال کہ ''عالم کو خدا نے کس لیے پیدا کیا؟'' اس سوال کا زندہ جواب بن کر وہی ہستی سامنے آجاتی ہے جو خلافت کے قالب میں خدائی کمالات لے کر پیدا ہوئی تھی اور اب بندہ بن کر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ خلافت اور عبدیت کی یہی کش مکش ہے جس نے انسان کی اس ارضی زندگی کو آزمایش اور ابتلا کی زندگی بنادی ہے۔ الغرض اب جا کر فطرت انسانی کے پیچ در پیچ قوانین نے

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ O (سورۂ ذاریات:۵۶)

''نہیں پیدا کیا میں نے الجن اور الانس کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کیے چلے جائیں۔''

کی تفسیر کردی، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس کُن فیکونی کائنات کا ہر ذرہ رب قیوم کے جب مسلسل عمل تخلیق اور التفات وتوجہ کا محتاج اور دست نگر ہے تو اس میں یہ مختار نما مجبور انسان اگر کچھ کرسکتا ہے تو صرف یہی کہ اپنے اختیار کو بجائے ناقص علوم و ناقص تجربوں کے علم محیط کلی کے ماتحت کردے یعنی خدا کے بتائے ہوئے قانون کو اپنے اوپر عاید کرلے اور خود اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (تجھی کو ہم پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) کہتے ہوئے اس کے آگے جھک جائے، جس کے سامنے جھکنے کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔ اسی سے ہر معاملے میں صراط مستقیم کا طلب گار ہو جس

کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ وہ اسی لیے پیدا ہوا ہے اور وہ سوچے تو اس کے سوا وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا، بلکہ جیسا کہ بتایا گیا تھا [1] کہ انسان اپنے وجود کا مقصد اس (عبدیت) کے سوا کچھ نہیں بتا سکتا۔ عبدیت کے مقام سے ہٹ جانے کے بعد معلوم ہو چکا ہے کہ انسان پھر کسی مقام پر ٹھیر کر اپنی ہستی کو کارآمد اور نظام کائنات کا مفید جز ثابت نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد وہ قطعاً سدیٰ (یعنی معطل) اور عبث بن کر رہ جاتا ہے، جس کی طرف قرآنی آیات

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا. (سورۂ مؤمنون: ۱۱۵)

''کیا آدمی یہ سوچتا ہے کہ اسے لاحاصل بنا کر ہم نے پیدا کیا ہے؟''

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى. (سورۂ قیامہ: ۳۶)

''کیا آدمی خیال کرتا ہے کہ وہ بے نتیجہ بنا کر چھوڑ دیا جائے گا؟''

میں اشارہ کیا گیا ہے۔

تدبیر کے حدود:

لیکن یہ طرزِ عمل ان ہی افعال و اعمال کے ساتھ ممکن ہے جن کے متعلق علم محیط یعنی مذہب نے نفی یا اثبات میں احکام بھی نافذ کیے ہوں۔ مثلاً فرایض و واجبات اور

---

[1] اشارہ سیرت کے مقدماتی اسباق کی طرف ہے جن میں بتایا جاتا تھا کہ کائناتی موجودات مثلاً ہوا، پانی، آگ، خاک، نباتات، جمادات جس سے بھی پوچھا جائے اپنے وجود کا کوئی نہ کوئی مفاد بتائیں گے۔ یعنی کسی نہ کسی طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان کے کام آتی ہیں۔ آخر دنیا سے اگر ہوا نکال لی جائے، پانی خشک ہو جائے تو کیا آدمی زمین کے اس کرے پر زندہ رہ سکتا ہے؟ لیکن عجیب بات ہے کہ جب اسی سوال کو انسان کی طرف عاید کیا جاتا ہے یعنی پوچھا جاتا ہے کہ اس کا وجود دنیا کی کس چیز کے کام آتا ہے؟ تو اس کا کوئی جواب نہیں ہے، سوچنا چاہیے کہ بنی آدم کے ایک ایک فرد کو چن چن کر اگر معدوم کر دیا جائے، ان چھوٹوں بڑوں میں سے کوئی یہاں باقی نہ رہے تو ہوا کا، پانی کا، آفتاب کا، ماہتاب کا کیا بگڑے گا؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کسی معمولی تنکے اور کسی ریزے کا بھی کوئی نقصان نہیں، اگر یہاں آدمی نہ ہو، پھر کیا سلسلہ کائنات میں بے مقصد اور تحصیل لاحاصل وجود انسان ہی کا ہے؟ ''الدین القیم'' کے حصۂ دوم میں اس مسئلے کی پوری تفصیل ان شاء اللہ آئے گی۔

حرام ومکروہ وغیرہ میں بجائے اپنی مرضی کے ان کو مرضی حق کے تابع کرسکتا ہے، لیکن اعمال وافعال کا وہ حصہ جس میں انسان کو آزادی دی گئی ہے، جسے مناجات کہتے ہیں، اس میں وہ کیا کرے؟ ظاہر ہے کہ جس میں اسے آزاد چھوڑا گیا ہے اس میں اسے آزادی ہی ہوگی، لیکن اس کے اختیار کی قدرتی مجبوریاں چاہتی ہیں کہ یہاں بھی وہ اپنے ناقص اختیار اور ناقص علم کے ساتھ ساتھ کامل علم اور کامل اختیار کا طالب ہو اور یہی وہ فطری ضرورت ہے جس کی تکمیل مذہب نے تسمیہ ❶ استعانت، استخارہ، توکّل، تفویض، دعا وغیرہ ذرائع سے کی ہے اور وہ جو چیزوں سے بے اعتنائی برت کر ان کا مذاق اڑاتا ہوا، صرف اپنے ناقص علم اور ناقص تجربات اور محدود اختیارات پر اعتماد کر کے کائنات کے اس پُر پیچ قوانین والے سمندر میں پھاندتا ہے، جس کی ہر ہر موج میں حلقہ صد کام نہنگ ❷ پوشیدہ ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے اُس پر تاریکی کے اُن خندقوں میں کیا گزرے گی اور اس کے مقاصد کے قطروں کو موتی بننا کب نصیب ہوگا؟ انسان کے ناقص علم واختیار کا سرمایہ تو بس اسی قدر ہے، آگے قادر قیوم کو اختیار ہے، چاہے اس شخص پر فطرت کے ان پیچیدہ قوانین کا علم ظاہر کرتے ہوئے اس کے اختیار میں وسعت پیدا فرمادے اور نتیجے تک پہنچادے۔ عموماً قدرت کا یہ برتاؤ ان ہی سرکشوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کی بصیرت کی آنکھیں پھوڑنا چاہتا ہے اور غفلت کی

---

❶ تسمیہ یعنی بسم اللہ کر کے کام شروع کرنا، استعانت یعنی حق تعالیٰ سے ہر کام میں اعانت چاہنا، استخارہ یعنی ایسے معاملات جن کے پہلوؤں میں عقل ترجیح نہ دے سکتی ہو، یا دل مطمئن نہ ہوتا ہو، حق تعالیٰ سے چاہنا کہ جو ان پہلوؤں میں بہتر ہو، اسی کو آسان فرمایا جائے۔ ایک خاص نماز بھی استخارہ کے لیے اسلام میں مقرر ہے۔ توکل وتفویض ودعا کو سب ہی جانتے ہیں۔

❷ غالب کا شعر ہے ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

میں کائنات کے انہی پر پیچ قوانین کو ایک بلیغ تشبیہ کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ اس فقرے میں اسی کی طرف تلمیح ہے۔

ٹوپی پہنا کر انھیں سزا کی پھانسی دینا چاہتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام ''تمہیل'' و ''املاء'' ہے۔ اور جہاں یہ ممکن ہے وہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ علم واختیار کے جس نقطے پر چاہے انسان کو اللہ تعالیٰ روک دے اور روک دیتا ہے، بہ خلاف ان لوگوں کے جو توکل، استخارہ اور دعا وغیرہ کی روشنی میں چلتے ہیں، وہ ناقص علم کو کامل علم اور محدود اختیارات کو غیر محدود اختیارات کے ساتھ جوڑ کر چلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا اپنے مقصد تک پہنچنا یقینی اور قطعی ہے اور یہی مطلب ہے قرآن کی آیت:

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ. (سورۂ طلاق:۳)

''جس نے خدا پر بھروسا کیا پس اللہ اس کے لیے بس ہو جاتا ہے۔''

بہر حال انسان کے ناقص علوم وتجربات کے مشوروں کا نام تدبیر ہے، جو اس ناقص کا رشتہ کامل سے جوڑ کر چلتا ہے، اس کی کامیابی قطعی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا اس کی کامیابی کا کوئی ذمے دار نہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کامیابی کے لیے تدبیر کرنے یا نہ کرنے میں تو انسان آزاد ہے، جس حد تک تدبیری مشوروں کو چاہے مانے، چاہے نہ مانے، لیکن دعا و توکل اور اعتماد علی اللہ سے کسی حال میں اسے چارہ نہیں۔ اسی لیے بعض خواص کبھی کبھی تدبیروں سے الگ ہوکر زندگی کے جہاز کو توکل ہی پر چھوڑ کر اپنی کامیابیاں دکھا کر یہ بتلا دیتے ہیں کہ کامیابی کی اصل شرط کیا ہے۔

پس توکل کرنے والے اسباب کو چھوڑتا نہیں بلکہ ناقص اور پُھس پُھسے اسباب کو چھوڑ کر کامل سبب یعنی علم محیط اور اختیار مطلق کو اختیار کرتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے بڑی دانش مندی اور کیا ہوسکتی ہے۔

دنیاوی مصایب اور اس کے اسباب:

میں بتا چکا ہوں کہ اصولاً حزن وغم یا شر قانون مجازات کا اقتضا ہیں اور قانون مجازات کا اصلی مظہر انسانی تنزل کا وہ مقام ہے جہاں مرکزی قوت کی مخالفت جہنم کے بھیس میں انسان کے سامنے نمودار ہوگی، لیکن افراد و اقوام کے اختیار کی مطلق العنانیاں کبھی مرضیٔ حق سے اس قدر زیادہ اور اتنی شدت کے ساتھ متصادم ہونے لگتی

ہیں کہ اس تصادم کا جو شرارہ کل جہنم میں بھڑکنے والا تھا وہ آج ہی بڑھتے ہوئے اسی زندگی کے دامن کو تھام لیتا ہے اور وہی مصایب کی صورت میں لپٹ جاتے ہیں۔ خصوصاً قومی تباہیاں جب کبھی اس عالم میں آئی ہیں ہمیشہ اس قانون کے تحت ان کی پیدائش ہوئی ہے۔ طوفان نوح، ریح عاد، صیحۂ ثمود، گذشتہ امتوں میں یاجوجیت ماجوجیت یا دجّالیت وغیرہ فتن کا ظہور خاتم الامم میں اسی کے نتائج ہیں۔

اسی طرح افراد کے مصایب بھی گو زیادہ تر مجازات ہی کے نتائج ہیں، خصوصاً باطنی آفتیں، مثلاً جذبۂ امانت کی موت اور انسانی احساسات سے محرومی، جسے قرآن کی اصطلاح میں ختم قلوب، غشاوۃ، تسلیط شیطان، اضلال، اغوا وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، لیکن کبھی کبھی اس کے اسباب اور بھی ہوتے ہیں، مثلاً بعض بلند ہمت نفوس اپنے ابنائے جنس کے مصیبت زدہ افراد کی تسلی کے لیے قصداً ایسے حال میں رہتے ہیں جسے ہم مصیبت کہتے ہیں۔ حالاں کہ ان لوگوں کی یہ مصیبتیں اضطراری نہیں بلکہ اختیاری ہوتی ہیں [1]۔ کبھی کسی کی لذت ایمان، یقین وصبر اور عشق ومحبت کے اعلیٰ جذبات کا مظاہرہ ان مصایب کی روشنی میں کیا جاتا ہے، تو ایسے مصایب سے صاحب مصیبت کی توہین وتذلیل نہیں بلکہ ان کی عظمت وجلال کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ نیز جیسا کہ عرض کیا گیا تقریباً ان مصایب کا اکثر حصہ اختیاری ہی ہوتا ہے اور کبھی ان ہی صفات کو بچوں میں مستحکم کرنے اور منافقوں کو ان کی جماعت سے جدا کرنے کے لیے بھی ایسا کیا جاتا ہے۔

---

[1] موطا امام مالکؒ کی صحیح حدیث ہے:

اِنَّ مَصَائِبِیْ تَعزی الْمُسْلِمِیْنَ فِیْ مَصَائِبِھِمْ.

''میری مصیبتیں مسلمانوں کی تسلی وتعزیت ان کی مصیبتوں میں کرتی رہیں گی۔''

یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے اور فقر وفاقہ کی اس زندگی کی یہ بھی ایک توجیہ ہے جسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ اختیار خود پسند فرمایا تھا۔ ورنہ آپ کو کہا گیا تھا کہ ''نبی ملک'' (بادشاہ) ہو کر رہنا چاہتے ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ علیٰ ہذا احد پہاڑ کے سونے بننے یا ارض بطحا کو سونا بنا دینے کی خواہش بھی آپ سے کی گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے انکار فرمایا تو اس کا ایک راز یہ بھی ہو سکتا ہے۔

قانون تحویل وتخفیف:

کبھی مجازات کے وہ خوف ناک نتائج جن کا ظہور آیندہ زندگی میں ہونے والا تھا، توبہ واستغفار کے قوانین کے تحت (جن کا ذکر آگے آئے گا) انہی کو نرم اور ہلکا کر کے دنیوی مصایب کے اندر بدل دیا جاتا ہے، گویا جو قانوناً مستحق قتل وقصاص مثلاً تھے انھیں چند تازیانے مار کر خلاصی بخشی جاتی ہے۔ سلسلۂ مصایب میں اسی قانون کا نام ''قانون تخفیف وتحویل'' ہے اور انہی مصایب کو گناہ کا کفارہ خیال کیا جاتا ہے۔

قناعت وزہد:

ان سب کے علاوہ دنیاوی مصایب کا ایک بہت بڑا حصہ وہ بھی ہے جسے حماقت یا غفلت کی سزا میں مبتلا ہونے والے عموماً مصیبت خیال کرتے ہیں، لیکن خود جس پر وہ ''مصیبت'' ہوتی ہے وہ اسی میں اپنی راحت محسوس کرتا ہے۔ مثلاً حاجتوں کا اختصار اور دوراز کار باتوں سے احتراز، ترک مالایعنی (غیر ضروری امور سے اعراض) قدر ضرورت پر کفایت، ان باتوں کو غافلوں کی سزا یافتہ جماعت جہنم سمجھتی ہے، لیکن جو اس حال میں ہیں وہ انہی کو جہنم میں خیال کرتے ہیں۔ واقعہ فیصلہ کرے گا کہ سچ کس کے ساتھ ہے۔ الحاصل یہ ''مصائب'' تو ہوتے ہیں لیکن وہ سیئہ نہیں ہوتے۔

دنیا کی متعدی سزا:

اسی سلسلے میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ بعض شدید جرایم جن کی سزا کا زور اسی زندگی (الحیوۃ الدنیا) کے گریبان کو چاک کر کے ظاہر ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ ایسے سخت ہوتے ہیں کہ ان کی سزا بھی سزا پانے والے کے لیے جرم بن جاتی ہے۔ مثلاً خونی قتل کر کے قتل پر اور جری ہو جاتا ہے تو اس کے قلب کی یہ کیفیت خون کرنے کی باطنی سزا ہے، لیکن خود یہ سزا مستقل جرم اور آیندہ جرایم کا مقدمہ ہے، قریب قریب تمام باطنی سزاؤں کا یہی حال ہے۔

اسی قسم کے جرایم وہ بھی ہیں جن کی سزا سے دنیا میں کبھی کبھی وہ بھی متاثر

ہو جاتے ہیں جو مجرم نہ تھے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ کسی شہر کے باشندوں پر زنا کا بھوت سوار ہوا، رفتہ رفتہ اس کی کثرت اس سزا کو پیدا کرتی ہے جس کا نام وبا ہے۔ اس وبا سے غیر زانیوں کی اگروہ جماعت بھی متاثر ہوئی جو اس فعل شنیع سے نہ صرف علاحدہ تھی بلکہ روکنے کی کوشش بھی کرتی تھی تو اس کے ذمے دار زانی ہی ہوں گے۔ ان کو مجازات کے اصل مقام (جہنم) میں نہ صرف زنا ہی کی سزا ملے گی بلکہ دوسرے غیر زانیوں کو وبا میں مبتلا کرنے کی سزا بھی بھگتنی ہوگی اور یہی حال ان آباو اجداد کا ہوگا جن کی بداعمالیوں اور سیاہ کاریوں کے نتائج ان سے منتقل ہو کر ان کی نسلوں اور بچوں میں پھیل جاتے ہیں۔ گویا اپنی آیندہ نسلوں پر ظلم توڑنے والا اور ان کو اذیت پہنچانے والا بھی مجرم ہوتا ہے [1] حتیٰ کہ جانوروں تک میں یہ قانون عام ہے [2]۔

---

[1] تناسخ جو بالکلیہ ایک غیر عقلی دعویٰ ہے اس کے ثبوت میں بہ مشکل اگر کسی چیز کو بہ طور مغالطے کے پیش کیا جاتا ہے وہ یہی بچوں کی بیماریاں وغیرہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مکلّف تو تھے نہیں، پھر ان کے مصایب کی توجیہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ پچھلی زندگیوں کے اعمال کی سزا ان مصایب کو قرار دیا جائے۔ لیکن جب بچوں وغیرہ کے ان مصایب کی علت ان کے باپ دادوں کے جرایم بھی ہو سکتے ہیں، تو تناسخ والوں کی یہ دلیل بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔ آخر یوں بھی ایک شخص دوسرے پر جیسے ظلم کرتا ہے کیوں نہیں سمجھا جائے کہ پہلی نسلوں کے افراد اپنی بداعمالیوں سے خود اپنی پچھلی نسلوں پر ظلم کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تو اس معاملے میں ایک شخص کسی کی آنکھ پھوڑ دے، اس میں اور اس معاملے میں کہ زنا کاری وغیرہ کے جرایم میں مبتلا ہو کر کسی کا دادا مثلاً آتشک میں مبتلا ہوتا ہے اور اس آتشک کی وجہ سے اس کا بیٹا یا اس کا پوتا بھی اسی بیماری کو لے کر پیدا ہوتا ہے، تو میرے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سمجھا جائے گا کہ اس پوتے یا بیٹے کو اس کے دادا یا باپ نے اس مرض میں مبتلا کر کے اس پر ظلم کیا ہے، جس کی سزا باپ دادا کو بھگتنی پڑے گی۔ الحاصل بچوں کے امراض وغیرہ کو تناسخ کی دلیل قرار دینا بھی ایک دعوے سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور لے دے کر تناسخ کے ثبوت کی یہی آخری دلیل بھی خصوصاً طبی تحقیقات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچوں وغیرہ کے یہ امراض عموماً توارث کے نتائج ہوتے ہیں۔

[2] مطلب یہ ہے کہ تجربہ و مشاہدہ بتاتا ہے کہ حیوانات میں عموماً امراض وغیرہ میں وہی مبتلا ہوتے ہیں جو انسی کہلاتے ہیں۔ مثلاً گھوڑے، بیل، مرغیوں کو عموماً دیکھا جاتا ہے کہ بیماریوں کا شکار ہوتی ہیں۔ اور نہ وحشی جانور اور پرندوں کو بیمار ہوتے ہوئے کسی نے دیکھا ہے؟ ارباب کشف کا بیان ہے کہ انسی جانوروں میں یہ چیزیں انسانی اعمال ہی کی بہ دولت پیدا ہوتی ہیں۔

غم اور مصیبت سے نجات کی راہ:

غم یا شر کے پیدا کرنے والی جب وہ قوت ہے جس سے اوپر کوئی قوت نہیں ہے تو کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کے لیے ایسی صورت میں سب سے پہلا کام مصیبت زدہ ہونے کے بعد تسلیم و رضا ہی کا ہوسکتا ہے، یا پھر خدا سے خدا ہی کی طرف پناہ ڈھونڈھنے کے لیے بھاگے، خصوصاً جب دنیاوی غم بھی عموماً قانون مجازات ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی مرضیٔ حق سے انسانی مرضی کے ٹکرانے یا مقام عبدیت سے ہٹنے ہی کا جب یہ خمیازہ ہے تو اس کا حقیقی علاج بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ انسان پلٹ کر پھر اسی نقطے تک آجائے جہاں سے وہ بھاگ کر غم میں مبتلا ہوا تھا۔ اسی حرکت بازگشت یا باطنی گردش کا نام توبہ ہے۔ یعنی جس سے ٹکرایا ہے اسی سے رحم ومغفرت کی درخواست کرے، اسی کو استغفار کہتے ہیں۔ بدی کے بدلے نیکی کرے، صدقہ دے، روزے رکھے، نمازیں پڑھے کہ یہ سب چیزیں کفارہ بن جاتی ہیں۔

باب دہم:

مسئلۂ شفاعت

اسی معالجہ کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ غم زدہ انسان اپنے اندر اس صلاحیت اور کیفیت کو پیدا کرے کہ دوسرے خاصان حق بھی اس کے لیے دعا کریں، یعنی جن باتوں سے وہ بزرگ خوش ہوں حتیٰ الوسع ان پر کاربند ہو، اسی کو شفاعت کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ سے گناہ گاروں پر رحم کی دعا کرنا، آخر شفاعت کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں؟ بہر حال غم کے علاج و معالجے کی صورتیں عقل بھی یہی سوچ سکتی تھی اور مذہب نے بھی انہی کا اعلان کیا ہے۔

مسئلۂ شفاعت کے متعلق غلط فہمی کا ازالہ:

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح وہ خود دوسروں کی خوشامدوں اور منتوں سے خوش ہوتے ہیں بزرگوں کا بھی یہی حال ہے۔ حالاں کہ جن کی سب سے بڑی خوشی یہ ہو کہ دوسرے بھی خدا کے اسی طرح بندے بن جائیں جیسے ہم ہیں، کیا وہ ایسے شخص سے خوش ہو سکتے ہیں جو بجائے خدا کی بندگی کے خود ان کی پرستش کرنے لگے؟ یہی وجہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ تو فرمایا جس نے دل سے لا الہ الا اللہ کہا، یعنی کم از کم عقیدۂ توحید سے وہ آپ کو خوش رکھے تو آیندہ عملی کم زوریوں کے متعلق دعا اور شفاعت سے کچھ کام چل سکتا ہے، لیکن کیا کیجیے کہ احمقوں کا گروہ بزرگوں اور اللہ کے نیک بندوں کو اپنے اوپر قیاس کر کے قریب قریب ان سے وہ تعلق رکھنا چاہتا ہے جو بندے اور خدا میں ہونا چاہیے۔ سمجھتا ہے کہ اس کے اس طریقۂ کار سے بزرگوں کی خوش نودی حاصل ہوگی۔ حالاں کہ اگر بصیرت کی آنکھ ان کے اندر ہوتی تو وہ دیکھ سکتے

تھے کہ اپنے جن اعمال و افعال سے وہ بزرگوں کی دعاؤں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں دراصل وہ ان کے لیے وبال بن رہے ہیں، بجاے رحمت کے اپنے ان ہی اعمال کی بہ دولت وہ اللہ کے ان نیک بندوں کی لعنتوں کا اپنے کو سزاوار بنا رہے ہیں۔

بہرحال یہاں تک تو انسانی اقتضا آت ہیں، اب تک قدرت کی طرف سے جو کچھ ہوا وہ اس کے ان ہی اقتضا آت کا جواب تھا۔ اقتضا آت کے اسی سلسلے کا نام ''سعی'' ہے اور یہی شرح ہے آیت:

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى. (سورۂ نجم:۳۹)

کی، یعنی فطرت انسانی جس چیز کی اپنے اقتضا سے مستحق ہوسکتی تھی وہ تو یہی ہے۔

رحمت کاملۂ الٰہیہ کے اقتضا آت:

لیکن ابھی اس ذات کا اقتضا باقی ہے جس پر انتقام سے زیادہ عفو، غضب سے زیادہ رحم اور جلال سے زیادہ جمال غالب ہے۔ جو پہلے رحمٰن پھر رحیم ہے، تب تیسری دفعہ ''بدلے کے دن کے مالک'' ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ جس کے کھلانے کے دن بھوکے مارنے کے دنوں سے، جس کے خطا کار بندوں کی راحت کے دن مصیبت کے دنوں سے، جس کے امیر ہی نہیں بلکہ غریب بندوں کی خوشی کے اوقات بھی غم کی گھڑیوں سے زیادہ ہیں۔ جس کی رحمت ہر چیز میں سمائی ہوئی ہے اور جس کا رحم، غضب پر سابق ہو چکا ہے تو اُس ذات کا اقتضا باقی ہے۔ سرچشمۂ کائنات کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے بدی کی سزا صرف ایک بدی رکھی ہے اور نیکیوں کے معاوضے کو دس گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ کر دیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ خالق کائنات کی اسی خصوصیت کے وہ نتائج بھی ہیں جن کی مذہب نے تفصیل کی ہے۔ جس کے سمجھنے کے لیے مجھے ذرا اجمال کے طریقے کو ترک کرنا پڑے گا۔

عبدیت کا کلی دستور اور اس کے نتائج:

مطلب یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں خالق تعالیٰ جل مجدہ کے مرضیات

اور اس کی ہدایتوں کی رہنمائی و اطاعت کو جو اپنے وجود کا آخری اور واحد نصب العین یقین کرتے ہوئے خدائی احکام و مرضیات کے مقابلے میں ہر قسم کے غیر خدائی آرا اور مشوروں سے آزادی اور کنارہ کشی کو ایک مختتم اور نہ بدلنے والے فیصلے کی صورت میں قبول کر چکا ہے، یعنی انبیا علیہم السلام کے کلمۂ دعوت ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' پر ایمان لا کر ہر چھوٹی بڑی مخلوق کے الٰہ ہونے کا قطعی طور پر انکار کرتے ہوئے صرف اللہ ہی کو اپنا اللہ بنا چکا ہے۔ اپنی تمام حاجتوں، اپنے نسک، اپنی صلاۃ کا مرجع سارے جہان کے پالنے والے ''اللہ رب العالمین'' ہی کو یقین کرتا ہے اور اسی پر جینا اسی پر مرنا چاہتا ہے۔ اسی کی اجمالی تعبیر یہ ہے کہ عبدیت کے کلی دستور کے آگے سر تسلیم وہ خم کر چکا ہے، تو میں اس قسم کے آدمی کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کے ایمان کے بعد اگر جزئیات اور تفصیلات میں عملاً کبھی کبھی اس کی مرضی حق کی مرضی سے متصادم ہو جاتی ہے تو گو قانون مجازات کی رو سے وہ مستحق سزا ضرور ہے، لیکن جس کا رحم اس کے غضب سے آگے بڑھ جاتا ہے اگر وہی مجازات کے ان نتائج سے اس کو بچالے تو پیغمبروں نے ماں کی مامتا اور باپ کی محبت سے بھی زیادہ، بہت زیادہ چاہنے والے جس ارحم الراحمین کو باور کرایا ہے، رحم سے بھری ہوئی اسی ذات کے ساتھ اگر یہ حسن ظن قایم کیا جائے تو مذہب نے اس حسن ظن کی حوصلہ افزائی کی ہے، بلکہ قرآن کی مشہور آیت:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ. (سورۂ نساء: ۴۸)

''قطعاً خدا نہ بخشے گا اس امر کو کہ اس کے ساتھ شریک ٹھیرایا جائے اور بخش دے گا اس کے سوا (یعنی شرک کے ماسوا) جس کے لیے چاہے گا۔''

کا جو مفاد ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو خدا کی مرضیات کی اطاعت اور اس کی بندگی کو صرف اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھتا بلکہ دوسروں کو بھی اس میں شریک قرار دیتا ہے، یعنی وہی بات کہ عبدیت کے کلی دستور کو اپنے وجود کا نصب العین نہیں ٹھیراتا اور حق کے سوا دوسرے کو بھی الٰہ بناتا ہے، قرآن کی رو سے قانون مجازات

کی زد سے ایسا آدمی کسی طرح بچ نہیں سکتا کہ وہ بغاوت کلی کا مرتکب ہے۔ حق تعالیٰ کی حکومت میں رہنے والے بندوں پر خدا کے سوا غیر خدا کے قانون کو نافذ کرتا ہے اور غیر خدا کی اطاعت وعبادت کا ارتکاب کر رہا ہے اور یہی مطلب ہے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ. (سورۂ نساء:۱۱۶)

''خدا نہیں بخشتا اس کو جو اس کے ساتھ شریک ٹھیراتا ہے۔''

لیکن عبدیت کے کلی دستور پر جس کا ایمان ہے اور اللہ ہی کو جو اپنا الٰہ دل سے بغیر تذبذب اور شک کے مان چکا ہے لیکن باوجود اس کے اس دستور کی جزئی دفعات سے اس کی زندگی کا کوئی عملی رخ کبھی متصادم ہو جاتا ہے تو چوں کہ کلی بغاوت کے نہ مٹنے والے داغ سے اس کا دامن پاک ہے، اس لیے مذکورہ بالا آیت میں اعلان کیا گیا ہے کہ خدا چاہے تو قانون مجازات سے اس مجرم کے جرم کو مستثنیٰ فرمادے۔ بہر حال وہ باغی نہیں مجرم ہی ہے، بغاوت کا نہیں صرف خطا وقصور کا مرتکب ہے:

یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ. (سورۂ نساء:۱۱۶)

''بخش دے اس کے یعنی (شرک) کے ماسوا جسے چاہے۔''

بہر حال جب شرک کی یہ نہ ٹلنے والی سزا ہے، یعنی جب خدا کے ملک اور حکومت میں اس کے بندوں پر کسی دوسرے کی حکومت واطاعت و بندگی وعبادت کو جایز ٹھیرانے والوں کے باغی ہونے کی وجہ سے یہ ان کی قدرتی سزا ہے تو جو اپنے کو سرے سے خدا کے لیے نہیں سمجھتا اس کی مرضی کی پابندی کو اپنا فرض خیال نہیں کرتا، یعنی سرے سے حق تعالیٰ کو اپنا الٰہ ہی نہیں تسلیم کرتا، یا العیاذ باللہ خدا کے وجود ہی کا وہ منکر ہے، ظاہر ہے کہ ایسے سخت باغیوں کے سامنے خدا کا مجازاتی قانون جتنی بھی ہول ناک اور مہیب شکلوں میں نمایاں ہو، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ نجات کی راہیں جب شرک ہی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسدود ہو جاتی ہیں تو بغاوت کی ان شدید تر قسموں کی جو سزا بھی ہو کم ہے۔

مرضیٔ حق کی یافت کی قدرتی راہ:

حق تعالیٰ کے مرضیات کی خالص اطاعت اور اس کی اور صرف اسی کی خالص بندگی وعبادت کو بلاشرکت غیرے اپنے وجود کا حقیقی نصب العین ٹھیرانا، جب نجات کی یہ ایسی ناگزیر شرط ہے جس میں کسی قسم کے استثنا کی گنجایش نہیں تو لازماً انسان کے سامنے سب سے بڑا اہم سوال یہی آجاتا ہے کہ خدا کے مرضیات سے واقف ہونے کی صحیح راہ کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ کسی کی مرضی سے واقف ہونے کی عقلاً اور فطرتاً دو ہی طبعی راہیں ہوسکتی ہیں، یا تو جس کی مرضی ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں براہ راست خود ہی اپنی مرضی سے مطلع کرے یا جسے اپنی مرضی سے اس نے آگاہ کیا ہو وہ ہم کو بتائے۔

حق تعالیٰ کی مرضیٔ مبارک سے واقفیت کی مذہب نے بھی یہی دو راہیں بتائی ہیں۔ یعنی پیغمبروں اور رسولوں کو تو حق تعالیٰ براہ راست اپنے منشا اور مرضی سے آگاہ فرماتے ہیں اور دوسرے لوگ اللہ کے انھیں پیغمبروں کے ذریعے سے اس علم کو پاتے ہیں۔

اب سوچنا چاہیے کہ ایسا آدمی جسے خدا سے بھی خدا کی مرضیات کا علم براہ راست نہ ملا ہو اور نہ پیغمبروں کے عطا کیے ہوئے علم کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے کا اس نے فیصلہ کیا ہو، اصطلاحی الفاظ میں اس کو یوں کہیے کہ پیغمبروں پر بھی وہ ایمان نہ لایا ہو، یعنی مرضیٔ حق کی آگاہی کے ان دونوں قدرتی ذرایع سے بے نیاز ہوکر صرف اپنے من مانی بافیدہ خیالات اور مغز سے اتارے ہوئے اپنے خودتراشیدہ وسوسوں کو خدا کی مرضی قرار دے کر اگر وہ اعلان کررہا ہو کہ خدا ہی کی مرضی کی اطاعت اور اس کی عبدیت وبندگی کو اپنے وجود کا نصب العین میں بھی یقین کرتا ہوں اور اسی کے مطابق زندگی بسر کررہا ہوں بہ آسانی معلوم ہوسکتا ہے کہ اس شخص پر صرف بغاوت ہی کی دفعہ کا جرم عاید نہیں ہوگا، یعنی بجائے مرضیٔ حق کے چوں کہ اپنی مرضی کی پابندی کو دراصل یہ اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہے اور اپنے ہی خودتراشیدہ، من گھڑت خیالات کو چوں کہ وہ خدا کی مرضی ٹھیرا رہا ہے تو علاوہ بغاوت کے خدا پر بہتان بندی اور افترا پر

دازی کی بھی ناپاک جسارت وہ کر رہا ہے۔ اس لیے بجائے ایک الزام کے بغاوت اور افترا دو ہول ناک الزاموں کی آتشیں زنجیروں میں یہ جکڑا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس قسم کے باغیوں اور افترا پردازوں کے علم یا عمل کا کوئی حصہ اگر اتفاقاً حق تعالیٰ کی اس مرضی کے مطابق بھی ہو جائے جس کا اظہار اپنے رسولوں اور پیغمبروں کے ذریعے سے اس نے فرمایا ہے، لیکن چوں کہ عملاً درحقیقت وہ اپنی ہی مرضی اور اپنے ہی خیالات کی پابندی کر رہا ہے اور افترا پردازی کی جسارت کے ساتھ کر رہا ہے کہ اپنی مرضی کو (العیاذ باللہ) خدا کی مرضی قرار دے رہا ہے، اس لیے وہ بھی بغاوت اور افترا علی اللہ ہی کا مجرم ہے۔

اسی سلسلے کا ایک شدید عصری مغالطہ:

آخری بات اس سلسلے میں قابل توجہ یہ بھی ہے جو بہتوں کے لیے اس زمانے میں شدید مغالطوں کی وجہ بنی ہوئی ہے، یعنی مختلف زمانوں میں خدا کے نام سے خدا کی مرضیات کا اظہار دنیا کی مختلف قوموں میں جن بزرگوں نے کیا تھا قطعی طور پر اس حقیقت کے واشگاف ہو جانے کے بعد بھی کہ ان بزرگوں کی پیش کی ہوئی چیزوں کا بہت سا حصہ ضایع بھی ہو چکا ہے اور جو باقی ہے اس میں بہ کثرت غیر اللہ کی خواہشوں اور راویوں کی آمیزش اس برے طریقے سے ہو چکی ہے کہ حق تعالیٰ کی مرضیات کو ان اجنبی غیر خدائی مشوروں اور انسانی ملاوٹوں سے جدا کرنا آدمی کے بس سے باہر ہے۔ کھلی ہوئی ناقابل انکار اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے اس حادثے کے قطعی یقین کے بعد بھی مختلف موثرات وعوامل مثلاً قومی عصبیتوں اور ملی حمیتوں کے زیر اثر انھیں چیزوں کو جوان کی نگاہوں میں بھی خدا کی خالص مرضی کی نمایندگی سے محروم ہو چکی ہیں، لیکن باوجود اس علم ویقین کے انہی کو خدا کی خالص مرضی قرار دیے چلا جانا اور اس پر اصرار کرنا، انہی کی پابندیوں کو خدا کی مرضی کی پابندی ٹھیرانا، بہ ادنا تامل معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ بھی افترا پردازی کی ایک خاص قسم ہونے کے ساتھ ساتھ شرک کی بھی ایک دردناک شکل ہے۔ دردناک اس لیے کہ اس کے شرک ہونے کا ان

لوگوں کو بہ آسانی احساس بھی نہیں ہوسکتا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ دراصل ان تمام صورتوں میں آدمی خود اپنے نفس ہی کی خواہشوں کی اطاعت کرتا ہے اور اسی کی اطاعت کو وہ اپنی زندگی کا نصب العین بنا کر زندگی گزارتا رہتا ہے مگر صرف عنوان اور لفظ کی حد تک وہ خدا کی مرضی کی پابندی کا غلط نام لیتا ہے۔

توحید کے مطالبے کی تکمیل کا ناگزیر عنصر:

خصوصاً جن گذشتہ دینی پیشواؤں کو خدا کا سچا نمایندہ جن کمالات وصفات اور جن اسباب وحالات کی بنا پر قوموں نے مانا تھا اور آج تک مان رہی ہیں، بجنسہٖ ان ہی معیاری کمالات وصفات اور ان ہی اسباب وحالات کے ساتھ، بلکہ ان سے بھی زیادہ وثوق آفریں اطمینان بخش خصوصیات سے آراستہ ہو کر خدا کی نمایندگی اور نبوت کا آخری پیغام لے کر تاریخ کے روشن دنوں میں دنیا کے اسے مرکزی مقام سے جو پیغمبر اٹھایا گیا، جس کی آواز ایک نسبت کے ساتھ مشرق ومغرب دونوں کو متاثر کرسکتی تھی اور اس نے متاثر کردیا، جو خدا کی طرف سے اس دعوے کو لے کر آیا کہ سارے جہاں کے باشندوں کو ہر قسم کی آمیزشوں سے صاف وپاک کر کے خدا کی خالص حقیقی مرضی سے وہ مطلع کرے گا اور اطلاع دینے کی جتنی ممکنہ صورتیں تھیں ان سب سے کام لے کر اس نے مطلع کیا، پھر جس راہ سے بھی کسی صادق کی صداقت جانچی جاسکتی ہے ہر راہ سے جانچنے اور تجربہ کرنے کا اس نے موقع دیا اور وہی جانچا اور پرکھا ہوا تجربہ تواتر کی قطعی شکلوں میں آج ساری دنیا کے سامنے جگمگا رہا ہے، زمین کے کرّے پر جس کا جہاں بھی جی چاہے اسے دیکھ سکتا ہے، ڈھونڈھے تو پاسکتا ہے اور اپنی اصلی حالت میں پاسکتا ہے۔

لیکن ان ہی دنی اغراض، نجس اور گندی جاہلانہ حمیتوں، قومی عصبیتوں کے ہاتھوں جو لوگ اپنی راے، اپنی خواہش کے پھندوں میں الجھ کر اسے دیکھنا نہیں چاہتے یا دیکھنے کے باوجود قصداً ماننے سے گریز کررہے ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب

خدا کی خالص مرضی ایسی بیّن، کھلی ہوئی راہ یعنی (رسول مبین) کے ذریعے سے ظاہر ہو چکی ہے اور جس کا جی چاہے بہ آسانی اسے پا سکتا ہے، مگر یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اب بھی جو خدا کی اس حقیقی خالص مرضی کے پانے اور اس سے اپنے اغلاط کی تصحیح سے جھجک رہے ہیں بلکہ ان میں اکثر برسر بغاوت ہیں، تو کیا ان باغیوں کے اس انجام میں کوئی شک کر سکتا ہے، جو ہر اس شخص کا انجام ہو سکتا ہے جو اللہ ہی کو الٰہ بنا کر جینے اور مرنے کو اپنی پیدائش کی حقیقی غایت اور اپنے وجود کا نصب العین نہیں سمجھتا۔

خدا کی مطلوبہ توحید کا مطلب:

یاد رکھنا چاہیے کہ ''اللہ ہی کو اپنا الٰہ بنانا'' یعنی اس کی مرضیات کی اطاعت اور اس کی عبدیت و بندگی کو اپنے وجود کا نصب العین قرار دینا، جیسا کہ عرض کیا گیا کہ قدرتاً اس پر موقوف ہے کہ صحیح راہ سے واقعی خدا کی مرضی کا صحیح علم حاصل کیا جائے۔ ورنہ صرف زبان سے اس کا اقرار کہ ''میں اللہ ہی کو الٰہ مانتا ہوں'' یہ فقط زبان کا ایک لفظی اور ہوائی اقرار ہے، جسے عقلاً واقعے سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آخر جو خدا کی مرضی ہی سے واقف نہیں ہے وہ خدا کی مرضیات کی اطاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین کیسے بنا سکتا ہے؟

اور لطف تو یہ ہے کہ لوگوں نے صرف زبان کے اس اقرار ہی کو نہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بات کہ جو خدا کو ایک سمجھتا ہے اس کے موحد ہونے کا فیصلہ کیے بیٹھے ہیں اگر یہ کوئی لغوی اصطلاح ہے تو اس سے مجھے بحث نہیں، لیکن حق تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جس توحید کا مطالبہ فرمایا ہے اور انسانی وجود کی آفرینش کی جسے غایت قرار دیا ہے کیا وہ صرف یہ ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے؟ کیسی عجیب بات ہے اس لحاظ سے یعنی وجوداً اور شخصاً ایک ہونے میں خدا کی کیا خصوصیت ہے؟ اس اعتبار سے تو ہر انفرادی شخصیت خواہ آدمی ہو یا درخت ہو، کوئی ہو، ایک ہی ہے، کیا ہم یا آپ، زید، یا عمرو، دو دو ہوتے ہیں؟ اور اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ عالم کے پیدا کرنے والے اور اس کے نظم کو ترتیب کے ساتھ قائم رکھنے والے کو ایک مانا جاتا ہے اور یہی بات خدا کی

مطلوبہ توحید ٹھیرائی جاتی ہے تو پھر قرآن کی ان آیتوں کا کیا مطلب ہے جن میں بار بار مسلسل مختلف طریقوں سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس توحید کے ماننے والے بہ کثرت ان لوگوں میں بھی پائے جاتے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو بھی اپنا الٰہ بنائے ہوئے ہیں۔ یعنی مشرک ہیں اور ان کی یہ توحید شرک کے خمیازوں سے نجات دینے کے لیے ناکافی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بجز چند استثنائی شکلوں کے توحید کے اس قسم کے اقرار سے شاید ہی کسی آدمی کا سینہ خالی ہوگا۔ تحقیق نے تو ثابت کیا ہے کہ ویران جزیروں کے بش مینوں (جنگلی اور صحرائی آدمیوں) میں بھی یہ عقیدہ پایا جاتا ہے۔

پس اصل واقعہ وہی ہے جس کا ذکر کرتا چلا آرہا ہوں کہ اپنے بندوں سے جس توحید کا مطالبہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کی تسلیم و عدم تسلیم پر انسانیت کی کامیابی و ناکامی کا مدار ہے، وہ وہی بات ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا الٰہ نہ بنایا جائے یعنی از آدم تا خاتم (صلوٰۃ اللہ وسلامہما) سارے جہاں کے پیغمبروں کا جو سب سے پہلا دعوتی کلمہ اور سب سے پہلا مطالبہ ہے، اس مطالبے کی تعمیل کی جائے اور کہہ چکا ہوں کہ اللہ کو الٰہ بنانے کا مطلب یہی ہے کہ حق تعالیٰ ہی کی مرضی کی اطاعت اور اسی کی بندگی و عبادت کو اپنے وجود کا آخری مطلب اور اپنی پیدائش کا حقیقی مقصد یقین کیا جائے۔

اب ظاہر ہے کہ مطلوبہ توحید جس پر نسل انسانی کی نجات اور آخری کامیابی مبنی ہے، جب اس کا یہی مطلب ہے اور قطعاً یہی ہے تو پھر وہی بات ہوئی کہ جب تک خدا کی مرضی کا صحیح علم، کمال وثوق اور کسی قطعی غیر مشکوک ذریعے سے حاصل نہ ہو، آدمی خدا کی مطلوبہ توحید کی تعمیل سے یعنی اس کو حقیقی معنوں میں الٰہ بنانے سے قطعاً قاصر رہے گا، اس کا لا الٰہ الا اللہ صرف زبانی، چند ہوائی ارتعاشات کا ایک مجموعہ ہوگا جو اپنے معنی سے قطعاً بے تعلق ہے، درحقیقت بجائے اللہ کو الٰہ بنانے کے ایسا آدمی خود اپنے آپ کو یا اپنے ہی جیسے انسان کو جسے خدا نے اپنی مرضی پر مطلع نہیں کیا ہے الٰہ بنائے بیٹھا رہے گا اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی موحد نہیں، مشرک ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا بعض صورتوں میں معاذ اللہ! وہ خدا پر جھوٹ باندھنے والا اور اقرار کرنے

والا بھی ہے اور اسی لیے اب یہ ایک واضح، نا قابل انکار، نہ صرف دینی و اعتقادی بلکہ قدرتی اور عقلی حقیقت بھی ہے کہ لا الٰہ الا اللّٰہ کے کلمے میں جس توحید کا واقعی مطالبہ کیا گیا ہے اس کی تعمیل اس دور میں محمد رسول اللّٰہ پر ایمان لائے بغیر ناممکن ہے۔ اللہ کا رسول، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مان کر جو لا الٰہ الا اللّٰہ کی توحید کا آج مدعی ہے وہ مشرک ہے، مفتری علی اللہ ہے، اپنے دماغی وسوسوں یا ایسی چیزوں کو جن میں قطعاً خدا کی مرضی انسانی خواہشات کے ساتھ خلط ملط ہو چکی ہے وہ انہی کو خدا کی مرضی قرار دے رہا ہے، اور محض اپنی ذاتی خواہشوں کی بنا پر بجائے خدا کے انہی کی پیروی کر رہا ہے۔ میں نے اسی لیے کہا کہ وہ خدا کی مرضی کی نہیں بلکہ اپنی مرضی، اپنی خواہش، اپنے ذاتی فیصلوں کی اطاعت و پیروی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے ہوئے ہے، اس کا جینا بھی خود اپنے لیے ہے اور مرنا بھی اپنے ہی لیے ہے، پھر جو خدا کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے لیے جیتا رہا اسے بجائے خدا کے خود اپنی ذات سے اجر کا امیدوار رہنا چاہیے، لیکن اس کی باغیانہ زندگی جو مسلسل حق اور حق کے مرضیات کے ساتھ جنگ اور تصادم میں گزری ہے تو اگر بہ روز مجازات (قیامت کے دن) حق کے ارادوں کو بھی یہ اپنے ساتھ مسلسل اور دوامی تصادم کی شکل میں پائے اور تصادم کا ظہور اس روز ''عذاب الیم'' کے قالب میں ہو، تو بتایا جائے کہ قدرتاً اس کے سوا اور کس نتیجے کی توقع ہو سکتی ہے؟ اور یہی مطلب ہے قرآن کی اس آیت کا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَّاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ۝ (سورۂ نساء: ۱۵۲-۱۵۱)

''جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور رسولوں میں جدائی پیدا کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ درمیان میں ایک راہ نکالیں، یہ لوگ پکے واقعی

کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے دکھ بھرا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انتخابی تصرفات کا اپنے آپ کو حق دار سمجھتے ہوئے جو رسول کے پیش کردہ پیغام کی جس چیز اور جس دفعہ کو چاہتا ہے ردّ کرتا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق جن باتوں کو پاتا ہے انھیں باقی رکھتا ہے۔ تو ردّ و قبول کے اس صریح باغیانہ طرز عمل کے ساتھ کہ خدا نے جس راہ پر چلنے کا اپنے رسول کے ذریعے سے بندوں کو ذمے دار ٹھیرایا ہے خدا کی عاید کردہ اس ذمے داری سے من مانے طور پر اپنے کو مستثنیٰ کر کے اپنے لیے اور اپنے ماننے والوں کے لیے اپنی تجویز، اپنے منشا، اپنے رجحانات کے مطابق جوئی راہ بنا رہا ہے یعنی قرآنی الفاظ میں:

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيدُونَ اَنْ يَّتَّخِذُوا بَيْنَ ذَالِكَ سَبِيلًا اُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا.

(سورۂ نساء: ۱۵۰)

جس کی زندگی کا کھلا ہوا خود اعترافی دستور ہے، اس پر وہی لوگ پکے اور قطعی کافر ہیں۔ کسی تنگ خیال، تنگ دل، سبک مغز، کافر گر ملا کی طرف سے کفر کا فتویٰ نہیں ہے بلکہ قرآن یہ اپنا ناطق فیصلہ صادر کر رہا ہے، تو قرآن کے اس ناطق اور قطعی فیصلے کے باوجود محض اس لیے کہ قرآنی نیکیوں اور دینی سعادتوں کے بعض صالح عناصر کا اس کی سیرت سے چوں کہ مظاہرہ ہو رہا ہے۔ مجھے اوروں سے بحث نہیں بلکہ ان سے پوچھنا ہے جو قرآنی فیصلے کو خدائی فیصلہ یقین کرتے ہیں، انہی سے سوال ہے کہ صرف اس مظاہرے سے متاثر ہو کر اس کے کفر میں تذبذب کے اظہار سے بھی آگے بڑھ کر جو لوگ ایسوں کو ایمان و نجات کی سند دینے کے لیے بے چین نظر آ رہے ہیں اور ان کے قدموں پر جنت کی کنجیاں نثار کرنے کے لیے مضطر ہیں، ضمیر کے ٹوک کو قرآنی آیات کی غلط تاویلوں ❶ سے روکنا چاہتے ہیں تو ان سے پوچھنا ہے کہ غلط رواداری کے ان

---

❶ میرا اشارہ ان آیتوں کی طرف ہے جن میں سب سے زیادہ شہرت اس زمانے میں سورۂ بقرہ کی اس آیت کو حاصل ہے۔

بیماروں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ کفر کی یہ تقدیس کہیں قرآن کے صریح نصوص کی تکذیب تو نہیں بن رہی ہے؟ بہر حال میرا خطاب اس خاص مسئلے میں اس وقت انہی لوگوں کی طرف ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی خدا کا رسول اور قرآن کو واقعی خدا کا کلام یقین کرتے ہیں، ورنہ اپنے خدتراشیدہ خیالات کو خدا کی مرضی قرار دینے کی کن میں جرأت ہے؟ جو اپنے دماغ ہی کو خدا کے رسول کا قایم مقام بنا کر اس کی سوچی ہوئی باتوں کو اپنے لیے خدا کا پیغام سمجھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے تصورات ومفروضات کا میدان بہت وسیع ہے، جس کے متعلق چاہیں جنتی ہونے کا

➤ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ○ (سورۂ بقرہ:۶۳)

''ایمان والے لوگ اور یہود ونصاریٰ وصابئین میں جو اللہ اور یوم آخر (قیامت) پر ایمان لائیں اور عمل صالح کریں گے تو ان کی مزدوری ان کے مالک کے پاس ہے، اور ایسوں کے لیے نہ اندیشہ ہے، نہ یہ لوگ آیندہ غمگین ہوں گے یعنی وہ نجات یاب ہوں گے۔'' (سورۃ البقرۃ:۶۲)

بعض ذمے دار اہل قلم نے اس آیت کو پیش کر کے دعویٰ کیا ہے کہ نجات کے لیے قرآن نے اپنی اس آیت میں صرف تین باتوں یعنی اللہ پر، یوم آخرت پر ایمان، اور عمل صالح کو ضروری قرار دیا ہے۔ چوں کہ رسول پر ایمان کا اس میں ذکر نہیں ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ ایمان بالرسالت کی نجات کے لیے ضرورت نہیں ہے۔ اپنے اس اجتہاد کی بنیاد پر ان حضرات نے بعض ایسے لوگوں کو جو علانیہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کی تکذیب کرتے ہیں، یعنی آپ کو سارے جہاں کا پیغمبر نہیں مانتے یا پیغمبر ہی نہیں مانتے، ان کو نجات کی سند عطا فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت ہو یا دوزخ اس پر نہ ہمارا اختیار ہے نہ ان حضرات کا، لیکن میں تو صرف واقعے کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں، یعنی واقع میں قرآن کا کیا فی الحقیقت یہی دعویٰ ہے؟ کیسی عجیب بات ہے۔ اسی سورۂ بقرہ میں مذکورہ بالا آیت کے بعد جو یہ الفاظ ہیں:

وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ.

''یہ لوگ نجات یافتہ ہوں گے۔''

ان ہی الفاظ کا ذکر مختلف آیتوں میں کیا گیا ہے۔ جن میں ایک آیت ہے:

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ. (سورۂ بقرہ:۱۱۲) ➤

فتویٰ صادر کر دیں اور جسے چاہیں ابد تک کے لیے جہنم کا کندہ بنا دیں۔

نبوت محمدیہ کے ساتھ وابستگی کی جو وجہ اب تک بیان کی گئی وہ تو صرف ایک تاریخی واقعہ اور نفس الامری حقیقت کا نتیجہ ہے یعنی اللہ ہی کو الٰہ بنانے کے لیے اللہ کی صحیح و خالص مرضی کی یافت نبوت محمدیہ کے سوا اب کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں، اس لیے نجات کی طلب اور انسانیت کی ارتقائی یافت کے حصول کی واقعے کے لحاظ سے اب صرف یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔

اس کے سوا یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جن خصوصیات، شکل و صورت، اندرونی و

◄ یعنی اللہ کے سامنے گردن جھکانے اور محسن ہونے کا نتیجہ وہی وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ قرار دیا گیا ہے۔ تو کیا نجات کے لیے صرف اللہ کا مان لینا کافی ہے۔ اس سے بھی آگے چل کر اسی سورۃ میں اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (سورۂ بقرہ:۲۷۴) کی آیت ہے جس میں اسی عدم خوف و عدم حزن کو محض اس انفاق و خیر و خیرات کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے جو رات اور دن میں کوئی کرے۔ پھر کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا کا، قیامت کا، عمل صالح سب کا انکار کر کے جو چیرٹی اور خیر و خیرات کے ابواب میں حصہ لیتا رہے گا یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کی اس آیت میں خدا، قیامت اور عمل صالح کے اس منکر کی نجات کی بشارت سنائی گئی ہے؟

اگر ایسا نہیں ہے تو پھر پہلی آیت کے ظاہر مفہوم پر کیوں اصرار کیا جا رہا ہے؟ اگر ان پچھلی آیتوں کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے اور بلا شبہ واقعہ بھی یہی ہے کہ واقعی نجات جن امور پر موقوف ہے، ان آیتوں میں سب کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کے مختلف عناصر اور اجزا کا ذکر اپنے اپنے مقام پر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نجات کے لیے ان امور کی ضرورت ہے، یہ مقصد نہیں ہے کہ صرف انہی کی ضرورت ہے۔ مثلاً انفاق اور خیر خیرات یہ بھی من جملہ اسباب نجات کے ایک سبب ہے لیکن یہی انفاق جب خدا کے انکار، قیامت کے انکار یا شرک وغیرہ کے ساتھ جمع ہو جائے تو اس وقت بھی اس میں یہ خاصیت باقی رہتی ہے یا نہیں؟ اس آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ہمیں اسلام کے کلی اصول کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ پس جو حال ان پچھلی آیتوں کے وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کا ہے یہی حال اس کا بھی ہے جس سے یہ غلط نتیجہ نکالا جا رہا ہے کہ نجات کے لیے رسول پر یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی حاجت نہیں۔

حالاں کہ جس موقعے پر یہ آیت قرآن میں پائی جاتی ہے اگر اس کے ماسبق کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو خود بہ خود مطلب کھل جاتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ بنی اسرائیل کو مصر (شہر) میں اترنے کا حکم دیا گیا، جو خود ان کی خواہش کا نتیجہ تھا، شاید اسی لیے اس کی تعبیر اِهْبِطُوْا (اتر جاؤ) سے کی گئی ہے۔ گویا ایک ◄

بیرونی صفات وحالات کی بنا پر مثلاً ہم اپنے کو یا اپنے ملنے والوں کو آدمی سمجھتے ہیں، پھر ان ہی خصوصیات کے ساتھ جب کوئی اجنبی آدمی ہمارے سامنے آئے تو کیا صرف اس لیے کہ اب تک ہم نے اس کو نہیں دیکھا تھا یا ہم نے ہمارے باپ دادوں نے اس اجنبی کو چوں کہ آدمی نہیں مانا تھا، اس لیے اس کے آدمی ہونے میں شک کر سکتے ہیں؟ جو اس میں بھی شک اندازی کرے گا ظاہر ہے کہ قصداً شرارت یا کسی اور غرض سے ایسا کر سکتا ہے۔ یعنی آدمی یقین کرتے ہوئے محض کسی وقتی مصلحت یا طبعی شرارت کی وجہ سے زبان سے اس کے آدمی ہونے کا انکار کرے گا۔

◄ ہبوط اور تنزل تو انسانیت کا وہ تھا کہ آدم اور حوا جنت سے اسی اہبطوا کے حکم سے نکلے، اور دوسرا تنزل انسانیت کا اس کے بعد یہ ہوا کہ میدانوں کی صاف ستھری زندگی کو چھوڑ کر وہ شہر کی گنجان، غلیظ، کثیف، ردی آب وہوا والی زندگی میں گرفتار ہوئی، قرآن میں ہے کہ شہر میں اُترنے کا تو ان کو حکم دے دیا گیا اور یہ بھی کہہ دیا گیا اب وہاں تمھاری ان خواہشوں کی تکمیل ہوگی جو تم چاہتے ہو (یعنی طرح طرح کے کھانے، اب بھی شہروں ہی میں چائے قہوہ اور مشروبات وماکولات کے ہوٹل وغیرہ مل سکتے ہیں، ورنہ دیہاتی ان لذتوں سے اب بھی محروم ہیں) مگر ان سطحی ووقتی لذتوں کے ساتھ قرآن میں اس پر بھی متنبہ کر دیا گیا کہ شہری زندگی میں تم پر ذلت اور مسکنت کی مار پڑے گی، کیوں کہ شہری زندگی ہی میں مال وجاہ، ثروت ودولت کے اعتبار سے افراد انسانی میں اتنا تفاوت پیدا ہو جاتا ہے کہ اکثریت کو اپنی دولت، مسکنت اور اپنی ہر عزت، ذلت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے سوا یہ بھی کہا گیا کہ شہری زندگی انسان کو اپنے حدود پر قائم نہیں رہنے دیتی، جس کا لازمی نتیجہ عصیان ہے، اور عصیان خدا کے غضب کو بھڑکاتا ہے۔ عموماً ہر تمدن کا آخری خاتمہ شہری آبادیوں کی سرکشیوں پر ہوا ہے۔

مگر بہر حال آدمی جنت سے اتر کر زمین پر آیا اور زمین کے میدانوں سے اتر کر وہ شہری زندگی کا شکار ہو ہی گیا۔ اس کے بعد یہ زیر بحث آیت ہے یعنی "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا......" جس سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اب تو آدمی جس حال میں بھی ہے رہے گا۔ چاہیے کہ اسی زندگی میں اپنے کو درست کر لے۔ درستی کے چند اہم عناصر ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور عمل صالح کا ذکر کر دیا گیا ہے، باقی شہری زندگی کی کش مکش میں عموماً جماعت بندی کا جو عارضہ پھیل جاتا ہے، اپنے گندے، دنی اغراض میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے چالاک افراد غریب عوام کے سامنے کوئی ایسا نقطۂ اجتماع پیش کرتے ہیں جس کے مغالطے میں مبتلا ہو کر عوام ان لوگوں پر جمع ہو جاتے ہیں، کام ان چند چالاک نفوس کا نکلتا ہے اور قربانی عوام کی ہوتی ہے۔ زبان، نسل، وطن یہ سارے اشتراکی نقاط اسی پارٹی بندی کے ہتھکنڈے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ مذہب اور دین جو صرف طہارت واخلاص، صداقت اور راست بازی کے حصول کا ◄

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا. (سورۂ نمل:۱۴)

''انھوں نے اس کا انکار کیا، حالاں کہ ان کا جی مان چکا تھا۔ انکار صرف ظلم اور سرکشی کی وجہ سے کر رہے ہیں۔''

اس آیت کریمہ قرآنیہ میں انسانی نفس کی اسی باغیانہ کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ قوموں نے جن خصوصیات وعلامات کی بنا پر اپنے جن پیشواؤں کو خدا کی مرضی کا نمایندہ مان رکھا ہے، ظاہر ہے کہ جب انہی بلکہ ان

➤ واحد ذریعہ ہے، بسا اوقات اس کا استعمال بھی اس پارٹی بندی اور جماعتی جذبات کے ابھارنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر قرآن کو اسی پر تنبیہ کرنی ہے کہ شہری زندگی میں مبتلا ہو جانے کے بعد بھی اگر آدمی چاہے تو مذہب کے صحیح استعمال سے نجات حاصل کر سکتا ہے، لیکن اگر مذہب سے بھی وہی کام لیا جائے جو وطنیت اور نسلیت وغیرہ سے لیا جاتا ہے یعنی انسانوں کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹ کر ان کے کسی ٹکڑے کی اجتماعی قوت سے ارباب اغراض نفع اٹھائیں تو پھر ایسا نام نہاد مذہب باعث نجات نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ نجات جن امور پر موقوف ہے ان کا استیعاب اس آیت میں نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کے بعض موثر عناصر جن پر اعتماد کرنے کے بعد انسانیت مذہب کے صحیح استعمال پر قادر ہو سکتی ہے صرف ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ نجات جن امور پر موقوف ہے، ان کے بعض ایجابی اجزا کا یہاں ذکر ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کے سوا نجات کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، یہ قرآن میں اپنی طرف سے اضافہ ہے۔ جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے ان کی نجات ہوگی۔ اس آیت سے بس اسی قدر معلوم ہوتا ہے۔ مگر رسول کی تکذیب بھی جو اسی کے ساتھ اگر کریں گے۔ ان کے انجام سے یہ آیت ساکت ہے اور اس کا پتا قرآن کی دوسری آیتوں سے چلتا ہے، جن میں صاف بتا یا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق کرنے والے ''اُلْکَافِرُوْنَ حَقًّا'' ہیں بلکہ اسی سورۂ بقرہ میں ''لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ'' کے الفاظ کا ذکر پہلی دفعہ جہاں ہوا ہے وہاں فرمایا گیا کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (سورۂ بقرہ:۳۸) جس کا حاصل یہی ہے کہ اس ہبوطی زندگی میں نسل انسانی کی نجات کی صرف ایک ہی راہ رہ گئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہداۃ اور رسل جو آتے رہیں گے ان کی پیروی کی جائے، کہ ان ہی کے ذریعے سے حق تعالیٰ اپنی مرضیات کو بندوں پر ظاہر فرمائیں گے۔ پس نجات کی پہلی شرط تو اس آیت کی رو سے ایمان بالرسالت ہی ہے۔ آگے جن جن آیتوں میں ''لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ'' کا اس سورۃ میں ذکر ہے، ان میں پیغمبروں کی لائی ہوئی تعلیم کے مختلف اجزا ہیں۔

سے بہتر کمالات وخصوصیات کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے انہی نمایندوں میں سے ایک نمایندہ اوران ہی رسولوں میں سے ایک رسول قرار دیا، تو جنھیں آپ کی رسالت میں اب تک شک ہے کیا ان کا حال اس شخص کا سانہیں ہے جو ایک شخص میں تمام انسانی خصوصیات کو دیکھ رہا ہے؟ لیکن باوجود اس کے اس کے آدمی ہونے میں شک کر رہا ہے۔ صرف اسی لیے شک کر رہا ہے کہ شک ہی کا قطعی ارادہ پہلے سے وہ طے کیے ہوئے ہے۔

اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ اگر دنیا کے تمام مذہبی اور دینی وثیقوں پر وہ حادثہ نہ بھی پیش آتا، جس کی وجہ سے کسی پیغمبر کا پیغام یا کسی قوم کا آسمانی دستور اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہا ہے، جس کا دوسروں ہی کو نہیں خود ان پیغمبروں کے ماننے والوں اور ان مذاہب کی پیروی کرنے والے کو بھی اعتراف ہے۔ بہر حال اگر یہ صورت نہ بھی پیش آتی جب بھی قوموں نے جن بنیادوں پر اپنے رسولوں اور پیغمبروں کو خدا کا نمایندہ اور خدا کی مرضی کا ظاہر کرنے والے مانا ہے، جب وہ ساری باتیں بالوجہ الاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات میں پائی جا رہی ہیں تو پھر آپ کی اور آپ کے دعوے کی تکذیب کی عقلاً وفطرۃً کسی کے پاس کیا توجیہ ہوسکتی ہے؟ قرآن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیلوں میں اس دلیل کا ذکر بھی:

مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ. (سورۂ احقاف:۹)

”نہیں ہوں میں رسولوں میں کوئی انوکھا۔“

وغیرہ جیسی آیتوں میں کیا گیا ہے۔

کچھ نہیں تو کم از کم آج مسلمانوں کو جو یہ مجبوری پیش آرہی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد کسی قسم کی نبوت کے دعوے کو تسلیم کرنے میں علاوہ اس واقعی وجہ کے کہ کیوں ایک فالتو نبی کی بغیر کسی ضرورت کے خواہ مخواہ ضرورت محسوس کی جائے، بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس نبوت کی تصدیق ایک دوسری نبوت صادقہ مبینہ مسلمہ یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تکذیب بن جاتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے

کہ من جملہ اور خصوصیتوں کے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کی ایک بڑی خصوصیت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ آخری نبوت ہے اور آپ کے بعد پھر کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ آپ کے بعد نبوت کا جو دعویٰ بھی کیا جائے گا اس کی تصدیق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ ختم نبوت کی تکذیب ہوگی۔

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ماننے میں دنیا کی قوموں کے لیے اس قسم کی بھی تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ان تمام ادیان و مذاہب کے پیش کرنے والوں نے جن کی طرف آج دنیا کے مذاہب منسوب ہیں، ان میں سے کسی نے بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ میری نبوت آخری نبوت ہے، بلکہ اس باب میں تو معاملہ بالعکس ہے، یعنی جن بچی کچھی صورتوں میں آج دنیا کی مذہبی یادداشتیں پائی جاتی ہیں تقریباً سب ہی میں کسی نہ کسی طرح اس کا سراغ ملتا ہے کہ ''آنے والے نبی'' کی اپنی اپنی امتوں کو انھوں نے بشارت سنائی تھی اور خود قرآن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف تورات و انجیل والے بلکہ ان کے سوا بھی خدا نے اپنے تمام پیغمبروں سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق میثاق اور معاہدہ لیا ہے۔ بائیبل کے بعض نبیوں نے اسی لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہی ''میثاق کا نبی'' بتایا ہے۔ خیر یہ ایک مستقل جداگانہ بحث ہے، جس کے لیے مستقل کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا یہاں تو صرف ضمناً ذکر آ گیا۔ مجھے تو یہاں کہنا یہ تھا کہ مذہب کے اس حادثے کی وجہ سے کہ ان کے اساسی وثائق کے مشتبہ اور مشکوک ہونے کی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان جہاں دنیا کی موجودہ نسلوں کے لیے ایک واقعاتی ناگزیر ضرورت ہوگئی ہے کہ پیغام محمدی کے سوا قطعی اور یقینی شکل میں مرضیٔ حق کی یافت کی کوئی شکل کسی کے پاس اب باقی نہیں رہی ہے، یوں بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا دعویٰ بجائے خود ایک ایسا واقعہ ہے جو اپنا ثبوت خود اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ اس خاص پہلو کی ایک حد تک تشریح میں نے اپنے مختصر رسالہ ''النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم'' میں کی ہے۔

باب یازدہم:

مسئلہ تبلیغ ومواخذہ

ایک دشواری اور اس کا حل

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، ایسا سوال جسے چاہیے تو یہی تھا کہ جس طرح اب تک اس سے چشم پوشی برتی جارہی ہے نہ برتی جاتی، میرا مطلب یہ ہے کہ نبوت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لحاظ سے ایک گروہ تو ان کا ہے جنھوں نے اس کو تسلیم کرکے حق تعالیٰ سے اپنا غیر مشکوک ربط قایم کرلیا ہے، جنھیں ہم مسلمان کہتے ہیں۔ ان کے بالمقابل دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ارادۃً وقصداً خود اپنے سامنے اور اپنے ماننے والوں کے سامنے تنکوں کو شہتیر بنا کر ❶ اس لیے پیش کررہے ہیں کہ جس طرح ممکن ہو

❶ مثلاً یورپ میں ایک مدت تک پادریوں نے خودتراشیدہ افسانوں میں پناہ ڈھونڈی۔ مشہور ہے کہ گری گوری پادری نے قصہ تراشا تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کبوتر پال لیا تھا، جسے آپ کان میں دانہ رکھ کر کھلایا کرتے تھے اور عوام کو باور کرایا جاتا تھا کہ یہی جبرائیل (علیہ السلام) ہیں جو کان میں چونچ ڈال کر خدا کی باتیں آپ کو سناتے ہیں۔ اسی قسم کے بیسیوں قصے عیسائیوں میں ان پادریوں نے مشہور کردیے تھے، لیکن جب پوپیت اور پادریت کے نظام پر مذہبی طبقہ یورپ میں تمام طبقوں کے مقابلے میں ذلیل ٹھرایا گیا جس کا تھوڑا بہت اثر مشرق میں بھی پہنچا ہے، یورپ ہی کی تقلید میں عموماً مشرق کے مغربیت زدہ نفوس بھی مذہبی لوگوں کی توہین کو اپنا پیشہ بنائے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا پردازیوں ہی کا خمیازہ ہے جو عیسائی مذہب کے پیشوا جھگت رہے ہیں۔ بہر حال جب مذہب اور مذہبی گروہ کی ہوا یورپ میں اکھڑی اور تعلیم یافتہ طبقے نے علم وتحقیق کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو صریح غلط بیانی اور افترا پردازی کی جرأت تو نہ کرسکے، لیکن رائی کو پربت بنا کر اپنی اور اپنے ملک کے باشندوں کی بصیرت کے سامنے کھڑا کرنے میں انھوں نے بھی کوئی کمی نہیں کی۔ بحیرہ راہب یا اس قسم کے چند خواندہ ونویسندہ عیسائیوں کی سرسری ملاقات کو فلسفہ بنایا گیا اور ''محمدی پیغام'' کے سارے چشمے ان کو ان ملاقاتوں میں نظر آگئے۔ گویا دعویٰ کیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہ تھے۔ اس لیے کہ نو سال کی عمر میں ثابت ہے کہ چند لمحات کے لیے آپ کی ملاقات بحیرا راہب سے ہوئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام ➤

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے کی تسلیم سے گریز کیا جائے۔ جیسا کہ منکرین اسلام کا عام حال ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد ہیں، ہر ایک کی طرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث ہونا جب ایک قطعی قرآنی عقیدہ ہے تو کیا ان میں مندرجۂ بالا دو طبقوں (مسلمانوں اور مذکورۂ بالا قسم کے کافروں متکبروں) کے سوا کوئی اور طبقہ نسل انسانی میں نہیں پایا جاتا؟ خواہ سنداً ان حدیثوں کے متعلق کچھ بھی کہا جائے لیکن بعض روایتوں میں جو یہ آیا ہے:

اَرْبَعَةٌ يَحْتَجُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اَصَمٌّ لَا يَسْمَعُ شَيْئًا وَرَجُلٌ اَحْمَقُ وَرَجُلٌ هَرِمٌ وَرَجُلٌ مَاتَ بِالْفُتْرَةِ.

''چار آدمی قیامت کے دن اپنی معذوری کی دلیل پیش کریں گے۔ بہرا آدمی، جو کچھ نہ سنتا ہو، احمق آدمی، بڈھا شیخ فانی، اور جو فترت (یعنی جس زمانے میں نبوت کی تعلیم کے آثار باقی نہ رہے ہوں) میں مرے (ہم

◄جن کی تعلیم و تربیت مصر کی شاہی خانوادے میں ہوئی، مسیح علیہ السلام جو یہودی فقہا و علما ہی کے حلقے میں پیدا ہوئے، ان ہی میں پلے بڑھے جوان ہوئے، لیکن باوجود اس کے ان ہی تعلیم یافتہ اسکالر عیسائیوں کے نزدیک ان بزرگوں کی نبوت میں اس سے خلل نہیں پیدا ہوتا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بحیرا یا جبر و جبیر یا ورقہ جیسے نیم خواندہ عیسائیوں کی سرسری ملاقاتیں تکذیب نبوت کے لیے کافی ہیں۔ تم اس لیے نبی نہیں ہو کہ تمہاری ملاقات چند پڑھے لکھے آدمیوں سے ثابت ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ اس دعویٰ اور دلیل میں کیا وہی نسبت نہیں ہے کہ کسی نے دعویٰ کیا کہ دنیا گول ہے۔ دلیل پوچھی گئی تو فرمانے لگے کہ چاول چوں کہ سپید ہوتا ہے، اس لیے دنیا گول ہونا ضروری ہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔ آج ہر ہندو شری کرشن کی سوانح عمری میں یہ پڑھتا ہے کہ انھوں نے باضابطہ شاندیپن گرو کے آشرم میں بدیا کی تحصیل کی تھی، لیکن باوجود اس کے ان کو اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ ان کی یہ تعلیم اس خدا کی نسبت کے منافی ہے جو ہندوؤں کے نزدیک سری کرشن کو حاصل تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ بحیرا راہب وغیرہ کے واقعات اگر صحیح بھی ہوں، اگرچہ اس میں بھی بہت کچھ شک ہے، لیکن ان کی ملاقاتوں سے یورپ کے ارباب ریسرچ و تحقیق جس نتیجے کو پیدا کر کے اپنے اوپر اور اپنے ملک کے حامیوں پر سچائی کے ماننے کی راہیں بند کر رہے ہیں اس میں اور پرانے پادریوں کے خود تراشیدہ جھوٹے واقعات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سورۂ دخان میں حق تعالیٰ ان لوگوں کا ذکر کر کے جو خداوند قدوس اور اس کی الوہیت میں شک ◄

جسے درس نبوت کے ناغہ ہونے کا زمانہ کہہ سکتے ہیں)۔"

یا قریب قریب اسی قسم کے الفاظ دوسری روایت کے جو یہ ہیں:

يُوتٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِالْمَمْسُوْخِ عَقْلًا وَبِالْهَالِكِ بِالْفُتْرَةِ وَبِالْهَالِكِ صَغِيْرًا.

"قیامت کے دن چند آدمی لائے جائیں گے یعنی وہ لوگ جن کی عقل مسخ تھی اور جو لوگ فترت (ناغہ ہونے) کے زمانے میں مرے اور جو لوگ کم عمری میں مرے۔"

تیسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

"يُوتٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَرْبَعَةٍ الْمَوْلُوْدِ وَالْمَعْتُوْهِ وَمَنْ مَاتَ

◄ کر رہے ہیں اور اللہ کے "رسول مبین" کے متعلق تحقیق و ریسرچ کی داد دیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ "معلم" مجنون ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

قَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ. (سورۂ دخان: ۱۴)

"انھوں نے اس کھلے ہوئے رسول کو کہا کہ دوسروں کا سکھایا ہوا ہے، دماغ میں اس کے فتور ہے۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں یعنی الٰہیات میں ایگناسٹک (شکی اور لاادری ہونا) اور "رسول مبین" کے متعلق "معلم مجنون" کا اتہام لگانا یہ دونوں خصوصیتیں آج یورپ ہی میں پائی جاتی ہیں لامحدود کتابوں کا وہ سارا ذخیرہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یورپ میں لکھی گئی ہیں، ان کا خلاصہ صرف ان ہی دو الفاظ "معلم مجنون" میں قرآن نے نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ پھر معلمیت کے لیے بحیرا وغیرہ کے نام تلاش کیے گے ہیں اور مجنونیت کے لیے وحی کی خاص کیفیت کو دلیل بنایا گیا ہے، یعنی دماغی فتور کی علامت نزول وحی کی کیفیت قرار دی گئی ہے۔ العظمت للہ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے اسی سورت میں ایک عجیب عذاب یعنی "دخان مبین" (کھلے ہوئے دھوئیں) کی جو دھمکی دی گئی ہے۔ اس میں عصر حاضر کی ان میکانیکی جنگوں کی طرف بھی اشارہ ہو، جن میں استعمال ہونے والے آلات حرب میں جو چیز بہ طور قدر مشترک کے نظر آتی ہے وہ یہی "دخان مبین" کھلا ہوا دھواں ہے۔ آخر توپ، بندوق، بم، مشین گن، جنگی بیڑے، بحری ہوں یا ہوائی، کیا ان آتشیں آلات میں کوئی بھی ایسی چیز ہے جس کا تعلق "دخان" دھوئیں سے نہ ہو؟ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ جنگ عظیم کے بعد سے "دخان مبین" کے ◄

بِالْفُتْرَةِ وَالشَّيْخِ الْهَرَمِ الْفَانِيْ.

''قیامت کے دن چار آدمی لائے جائیں گے، کم عمر بچے، مخبوط العقل اور فترت کے زمانے میں مرنے والے اور جو آدمی بڈھا ہو کر عقل و ہوش کھو بیٹھا ہو۔''

ان حدیثوں سے اگر کچھ نہیں تو اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نسل انسانی کے بعض افراد کے متعلق (یعنی وہی جن کا ان حدیثوں میں ذکر ہے ان کے انجام کے متعلق) کچھ آج ہی نہیں بلکہ ابتدائے اسلام ہی سے سوال اٹھایا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ایسے آدمی جو کسی اندرونی رکاوٹ اور موانع وعوایق کے شکار ہیں، مثلاً فطرتاً ان کی دماغی حالت اتنی پست ہے کہ جانوروں میں اور ان کی ذہنی کیفیت میں چنداں تفاوت نہ ہو۔ روایت میں جنھیں معتوہ یا الممسوخ عقلاً قرار دیا گیا ہے، یا دماغی حالت

➤ اسی عذاب میں مبتلا ہے اور کون جانتا ہے کہ اس عذاب کا جو خود اسی کے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا ہے آخری انجام کیا ہوگا؟ میں تو صرف اس کا تماشا کر رہا ہوں کہ ''رسول مبین'' پر جنھوں نے ''معلم مجنون'' کا الزام لگایا تھا اور سمجھتے تھے کہ اس کا بدلہ لینے والا کوئی نہیں ہے۔ آخر وہی انتقام لینے والا جس کے متعلق یہ شک میں تھے ان کے سامنے

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ○ (سورۂ دخان: ۱۶)

''اس دن ہم پکڑیں گے بڑی پکڑ، ہم انتقام لینے والے ہیں۔''

کی شکل میں آ گیا۔ جنگ کی خبروں میں عموماً یہی پڑھا جاتا ہے کہ فضا دھوئیں سے معمور تھی۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد ''جوہری بم'' بھی سامنے آ گیا۔ لکھا ہے کہ جوہری بم کے گرانے کے بعد چالیس میل اس دخان (دھوئیں) کا قطر تھا، جو فضا میں پھیل گیا تھا۔ مناسب ہوگا کہ اس موقع پر سورہ دخان کی ابتدائی رکوع کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ ان پر تعجب ہے کہ جنھوں نے ''دخان مبین'' کے اس عذاب کو قیامت کے واقعات میں شمار کیا ہے۔ اگرچہ اس کی تردید خود حضرت ابن مسعود صحابیؓ سے منقول ہے۔ نیز آگے فرعونی تمدن کی تباہی کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس عذاب کا تعلق بھی کچھ اس قسم کی فرعونیت سے ہے۔ بعضوں نے ابن مسعودؓ ہی کی طرف یہ روایت منسوب کی ہے کہ وہ اس سے قحط کا عذاب مراد لیتے ہیں، لیکن سنداً یہ روایت بہت کچھ قابل نقد و بحث ہے۔ علاوہ اس کے قرینہ صارفہ کے بغیر قرآنی الفاظ کے حقیقی معانی کو ترک کر کے مجازی معنی مراد لینا یوں بھی تفسیر کے کلی اصول کے خلاف ہے۔ بہر حال ان آیات کی تاویل کا یہ ایک پہلو تھا جو ذہن میں آیا ہے۔ اہل علم و نظر اس پر غور فرما لیں۔

کے نشوونما سے پہلے مثلاً مر گئے (روایت میں المولود سے جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے) یا بڑھاپے کی وجہ سے ہوش وحواس کھو کر لِکَیْلَا یَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْئًا (سورۂ حج: ۵) یعنی جاننے کے بعد پھر جاننے کی صلاحیت ان کی مفقود ہوگئی ہو (جنھیں الشیخ الہرم الفانی کے الفاظ سے موسوم کیا گیا ہے) اور جس طرح ان اندرونی رکاوٹوں کی کیفیت ہے، کبھی بیرونی ماحول بعضوں کا ایسا ہوتا ہے جیسے ان لوگوں کا حال ہے جو فترت کے زمانے میں مر گئے، مثلاً نبوت سے پہلے عرب میں ایام جاہلیت کے لوگوں کا جو حال تھا جن کے متعلق قرآن میں مَا اُنْذِرَ اٰبَآئُھُمْ (سورۂ یٰسین: ۶) (ان کے باپ دادا ڈرائے نہ گئے) کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔

تو سوال یہ ہے کہ عناد وجحود اور ظلم وغلو کے ساتھ جو ''نبوت عامہ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے مرتکب کفر ہو رہے ہیں، ان صریح بے ایمانوں میں ان لوگوں میں جو مندرجہ بالا اندرونی یا بیرونی رکاوٹوں کی وجہ سے ''نبوت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم'' پر ایمان لانے کی دولت سے محروم رہے ہیں۔ کیا ان دونوں محرومیوں کو ایک ہی صف میں رکھنا صحیح ہوگا؟ یا مدارج کے لحاظ سے ان میں کچھ فرق ہے؟ اور اگر کچھ فرق ہے تو ان کے انجام پر بھی اس فرق کا کوئی اثر مرتب ہوسکتا ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے، جن روایتوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ان کی سند کا حال کچھ بھی ہو، اتنا تو ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے افراد کے متعلق سوال پہلے بھی پیدا ہوا اور جاننے والے جانتے ہیں کہ کتابوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ مختلف زمانوں میں اس سوال کو اٹھایا گیا، اور مختلف لوگوں نے چاہا ہے کہ اس جواب دیں۔

سوال میں پیچیدگی کی وجہ:

حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں ایک جگہ اس سوال کو اٹھاتے ہوئے ایک عجیب بات لکھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں عام خیال جو یہ پھیلا ہوا ہے کہ انسانی افراد کی دو ہی قسمیں ہیں: جنتی اور دوزخی۔ یعنی کچھ لوگ جنت کے مستحق ہیں اور کچھ دوزخ کے۔ گویا جو آدمی ہے ان دو قسموں کے

سوا کسی تیسری قسم میں وہ داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ مگر آدمی کے سوا دوسرے جانوروں کے متعلق یہ خیال ہے کہ ایک جانور نے کسی دوسرے جانور کو بلا وجہ مثلاً اگر لات ماری ہو، یا ہینگ سے مارا ہو یا کچھ اسی قسم کی یادتی اگر کی ہے تو قیامت کے دن مظلوم جانور کو ظالم سے بدلہ لینے کا موقع دیا جائے گا اور اس کے بعد ظالم و مظلوم دونوں معدوم کر دیے جائیں گے۔ مجدد صاحبؒ نے اس بارے میں لکھا ہے کہ اشاعرہ یعنی مسلمان عموماً جس خیال کے پیرو ہیں ان کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

كَمَا يَلْزَمُ مِنْ مَذْهَبِ الْاَشْعَرِيِّ لِعَدَمِ الْقَوْلِ بِالْوَاسِطَةِ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ.

''انسانی افراد کی انجام دہی کے حساب سے یہ دو ہی قسمیں ہیں۔ جیسا کہ الاشعری کے مذہب کا اقتضا ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ الجنتہ اور النار کے درمیان کسی واسطہ کے قایل نہیں ہیں۔'' (مکتوب ۲۵۹: ج ۱، ص ۲۸۳)

اس عام خیال کو نقل کرتے ہوئے حضرت مجددؒ صرف ان ہی لوگوں کے متعلق نہیں جو بے چارے عقل و فہم سے عاری ہیں، بلکہ جو عقل و فہم والے بھی ہیں ان کے متعلق بھی ارشاد فرماتے ہیں:

حضرت حق سبحانہ تعالیٰ با کمال رأفت و رحمت خود بندہ را بہ مجرد عقل کہ مجال خطا و غلط در وے بسیار ست بے آں کہ ابلاغ مبین بہ توسط انبیا علیہم الصلوات والتسلیمات فرمایند در آتش مخلد سازد و بہ عذاب ابدی گرفتار سازد۔

''اپنی انتہائی رحمت و مہربانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو صرف اس عقل کے حوالے نہیں کیا جس میں غلطی اور صحت دونوں کی گنجایش بہت زیادہ ہے، بلکہ اسی رحمت و رأفت کا اقتضاء ہے کہ انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے پوری پوری تبلیغ کیے بغیر کسی کو آگ کے ابدی عذاب میں گرفتار نہ کرے۔''

حضرت مجددؒ فرماتے ہیں کہ ''باوجود عقل و ہوش کے جن لوگوں تک دین اور

دین کے پیش کرنے والے پیغمبروں کا علم صحیح طور پر نہیں پہنچا، یعنی ''ابلاغ مبین'' ان کو نہ ہوسکا، ان کے متعلق جہاں یہ فیصلہ دشوار ہے کہ وہ جہنم کے ابدی عذاب میں گرفتار ہوں۔ اسی طرح فرماتے ہیں:

''گراں است حکم کردن او را باوجود شرک بخلود جنت۔''

''ان لوگوں کے متعلق (جنھیں پورے طور پر پیغمبروں کے پیغام کی تبلیغ نہیں ہوئی، یہ فیصلہ بھی دشوار ہے کہ باوجود مشرک ہونے کے ان کو جنت کی ابدی زندگی کا حق دار قرار دیا جائے۔''

مجدد علیہ الرحمہ کا کشفی حل:

پھر اس دشواری کو پیش کرتے ہوئے کہ اس قسم کے لوگوں کے متعلق نہ دوزخی ہونے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے اور نہ جنتی ہونے کا، ایک اپنا کشف پیش فرماتے ہیں:

بعد از مدت مدید عنایت خداوندی جل سلطانہ رہنمونی فرمودہ حل ایں معما نمودہ منکشف ساخت کہ جماعتہ نہ در بہشت مخلد خواہند بود نہ در دوزخ بلکہ بعد از بعث و احیائے اخروی ایشاں را در مقام حساب داشتہ بہ اندازہ جریمہ معذب خواہند ساخت و استیفائے حقوق نمودہ دررنگ حیوانات غیر مکلّف ایشاں را نیز ''معدوم مطلق'' و ''لاشی محض'' خواہند فرمودہ۔

''زمانہ دراز کے بعد اللہ سبحانہ وجل سلطانہ کی عنایت نے میری رہنمائی فرمائی اور اس معمے کا حل مجھ پر منکشف کیا گیا کہ انسانوں کا ایک گروہ نہ جنت میں ہمیشہ رہے گا اور نہ دوزخ کے ابدی عذاب میں گرفتار ہوگا، بلکہ ان کو زندہ کرنے اور دوبارہ اٹھانے کے بعد حساب کتاب کے مقام میں انھیں حاضر کیا جائے گا اور ان کے جرم کے پیمانے کے مطابق ان کو عذاب دیا جائے گا اور جو حقوق ان کے ذمہ عاید ہوتے ہیں ان کی وصولیابی کرکے اُن حیوانوں اور جانوروں کے قاعدے کے مطابق جو شریعت کے مکلّف نہیں

ہیں انسانوں کے اس طبقے کو بھی معدوم مطلق اور نیست محض بنا دیا جائے گا۔"

حضرت مجددؒ اپنے اس کشفی خیال کو درج فرمانے کے بعد آگے اس پر اور اضافہ فرماتے ہیں:

این معرفت غریبہ راچوں در محضر انبیا علیہم الصلوٰت والتسلیمات عرضہ نمودہ شد، ہمہ تصدیق آں فرمودند و مقبول داشتند والعلم عند اللہ سبحانہ۔

"اپنی اس نادر معرفت کو پیغمبروں اور انبیا علیہم السلام کی مجلس میں پیش کیا گیا، سبھوں نے میرے اس خیال کی تصدیق فرمائی اور سبھوں نے قبول کیا، اور صحیح علم تو اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔"

جس کا حاصل یہی ہوا کہ بنی نوع انسانی کے متعلق جو یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ ان کی صرف دو ہی قسمیں ہیں، ابدی جنتی اور ابدی دوزخی۔ اس عام خیال کے بالمقابل حضرت مجددؒ ایک تیسری قسم بھی پیش کرتے ہیں، جنھیں ان کے خیال میں یا ان کے کشف کے مطابق حیوانی مجازات کے بعد:

ایشاں را نیز معدوم مطلق ولاشی محض خواہند فرمود۔

"ان کو بھی نیست محض اور لاشی مطلق کر دیا جائے گا۔"

لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک کشفی خیال ہے۔ عقاید کا مسلمہ ہے کہ اس باب میں کشف حجت نہیں ہے۔ اگرچہ حضرت مجددؒ نے حضرات انبیا علیہم الصلوٰت والتسلیمات سے بھی اس کی توثیق حاصل فرمائی ہے، لیکن یہ توثیق بھی توکشفی ہی ہے۔ غالباً اسی لیے مجدد صاحبؒ نے "والعلم عند اللہ سبحانہ" کے الفاظ کا اضافہ اس جگہ فرمایا ہے۔ نیز علمائے ظاہر اپنے اصول پر شاید یہ پوچھ سکتے ہیں کہ خود حیوانی مجازات (یعنی جانوروں میں مظلوم کا ظالم سے بدلہ لینے) کا مسئلہ کس قطعی الثبوت دلیل سے کب ثابت ہے؟ بعض روایتوں میں جن کی سند بھی قابل تنقید ہے، اس کا ذکر بے شک آیا ہے مگر ظاہر ہے کہ علما کے لیے اعتقادی مسایل میں اس قسم کی روایتیں قابل حجت نہیں ہوسکتیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ غیر مکلّف حیوانوں پر اگر اس قسم کے غیر مکلّف انسانوں کو

قیاس کیا جائے تو علاوہ کشف کے ایک قیاسی وجہ بھی پیدا تو ہوتی ہے، لیکن جس پر قیاس کیا جائے گا خود اس کا مرتبہ ایسا نہیں ہے جسے عقیدہ کا مقام عطا کیا جائے۔

قرآن مجید کا عجیب اشارہ:

البتہ اگر سورۂ فاتحہ کی آخری آیتوں پر غور کیا جائے یعنی

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ.

''راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا، نہ ان کی جو غضب میں مبتلا کیے گئے اور نہ گم راہوں کی۔''

تو من جملہ اور پہلوؤں کے ایک کھلا ہوا یہ پہلو پیدا ہوتا ہے کہ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جن پر خدا کا انعام ہوا، یعنی جو جنت کے مستحق ہیں۔ دوسرا گروہ جن پر غضب کیا گیا یعنی جہنم جن کا ٹھکانا ہوگا۔ آگے ''ولا الضالین'' کی صفت ہے یعنی صحیح سیدھی راہ جنھیں نہ مل سکی اور بھٹک گئے۔ قرآن میں ضلالت (گم گشتگیٔ راہ) کا اطلاق بہ ظاہر دو حالات پر کیا گیا ہے، کبھی تو اس کا انتساب ان لوگوں کی طرف کیا گیا ہے جن کی حق تعالیٰ نے سزا کے طور پر راہ ماردی، جیسے سزا کے طور پر قلوب پر ختم کر دیا جاتا ہے، سمع وابصار پر ''غشاوہ'' اور غلاف چڑھا دیا جاتا ہے۔ گویا ایسی مثال ہوئی کہ مثلاً بادشاہ کسی پر خفا ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں نکلوا لیتا ہے تو جیسے بیرونی حاسوں سے محروم کر کے کبھی سزا دی جاتی ہے، یوں ہی قدرت بعضوں کے اندرونی احساسات کو باطل کر کے اپنی سرکشی اور طغیان کی سزا چکھاتی ہے۔ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات میں اہل نفاق کے متعلق ذکر ہے کہ

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ (آیت ۱۰)

''بڑھا دیا اللہ نے ان کو بیماری میں اور ان کے واسطے دردناک سزا ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔''

جھوٹ بولنے کی سزا میں دل کے روگ اور قلب کے مرض میں اللہ تعالیٰ اضافہ فرمادیتے ہیں، جو ظاہر ہے کہ باطنی احساسات کی بربادی ہی کی سزا ہے۔

بہر حال ''ضلالت'' اور گم راہی کی ایک تو سزائی شکل ہے۔ دوسری شکل قرآن ہی سے ''ضلالت'' ہی کی یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہدایت کی راہ کسی کو نہ مل سکی، سب جانتے ہیں کہ وحی سے پہلے خود صاحب نبوت کبریٰ کے اس حال کی تعبیر بھی قرآن میں ''ضلالت'' ہی سے فرمائی گئی ہے۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى. (سورۂ ضحیٰ: ۷)

''اور پایا (اللہ نے) تجھے ضال (گم کردہ راہ) پس اس نے ہدایت کی (یعنی وحی سے سرفراز فرمایا)۔''

اور یہ کوئی جرم نہیں ہے بلکہ ہدایت کے اسباب کے فقدان کا قدرتی نتیجہ ہے جب تک وحی کے ذریعے سے ہدایت کی راہ نہ کھولی جائے، آخر اس حال کی تعبیر اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ راستہ تمہارے سامنے نہ تھا، اگر راستہ رہتا تو پھر وحی سے کون سی راہ کھولی گئی؟ بہر حال یہ ایک کھلی ہوئی صاف بات ہے۔ راستہ جب سامنے نہ تھا تو یہ کیسے کہہ دیا جاتا کہ تمہارے سامنے راہ تھی! پس فضول اور دوراز کار تاویلوں کی قطعاً حاجت نہیں، ایک واقعہ کا اظہار ہے۔ اب ظاہر ہے کہ سورۃ الحمد میں جب انعام والوں کا بھی ذکر ہو چکا اور غضب والوں کا بھی تو تیسرا گروہ وہی ہوسکتا ہے جو ان دونوں سے کچھ اپنی جداگانہ نوعیت رکھتا ہو۔ بخاری میں بھی المغضوب علیہم کا یہود کو اور الضالین کا نصاریٰ کو مصداق قرار دیتے ہوئے اس کی توثیق کی گئی کہ دونوں ایک نہیں ہیں۔ پس وہ ضلالت جو غضب کا نتیجہ ہوسکتی ہے، بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ ضلالت نہیں ہے، بلکہ اس سے یہ کوئی علاحدہ چیز ہے، یعنی یہی بات کہ اسباب ہدایت کے فقدان کی وجہ سے جنھیں راستہ نہ مل سکا۔ خواہ اب راہ نہ ملنے کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ اس راہ تک رسائی کے لیے جس خارجی ساز و سامان کی ضرورت ہے وہ مہیا نہ ہوسکا۔ جیسا کہ مجدد صاحبؒ نے فرمایا کہ

بے آں کہ ابلاغ مبین بہ توسط انبیا علیہم الصلوات والتسلیمات فرمایند۔

"پیغمبروں سے پوری کامل تبلیغ کے بغیر خدا کی رحمت کسی کو ابدی عذاب میں مبتلا نہیں کرتی۔"

وہ بے چارہ جو کسی ایسے ماحول میں گرفتار ہے کہ حق اس تک نہ پہنچ سکا یا وہ حق تک نہ پہنچ سکا، یا راہ اس لیے نہ مل سکی کہ حق تک پہنچنے کے لیے جس عقل وفہم یا حواس کی سلامتی کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس نہ تھی۔ مثلاً وہی لوگ جن کا ذکر روایتوں میں آیا ہے کہ قیامت کے دن وہ عذر خواہ ہو کر آئیں گے کہ میں نپٹ بہرا تھا، یا مجھے اتنی عقل ہی نہیں دی گئی تھی جو دین کو سمجھتا، یا پانے کے بعد بڑھاپے یا مرض کی وجہ سے عقل اس کی غایب ہوگئی۔ مثلاً مجانین یا کھوسٹ خرف بڈھوں کا جو حال ہو جاتا ہے، یا عقلی نشو ونما کا وقت ہی اس کو نہ مل سکا اور بچپن ہی میں مر گیا۔

ظاہر ہے کہ نسل انسانی میں شریک ہونے کے باوجود یہ سارے طبقات بنی آدم کے ایسے ہیں، جنھیں راہ نہ مل سکی یعنی الضالین کے یہ مصداق ہیں۔ پس میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت مجددؒ کے پیش کردہ بیان کے متعلق علمائے ظاہر کا یہ خیال کہ وہ صرف کشفی ہے۔ اگر سورۂ فاتحہ کے الفاظ پر غور کیا جائے تو غالباً کشف سے اس کا درجہ کچھ آگے بڑھ جاتا ہے اور ایک گروہ ایسا قرآن ہی سے نکل آتا ہے اور اس کی پہلی سورت سے نکل آتا ہے جس کے متعلق قرآن نہ انعام کی تصریح کرنا چاہتا ہے اور نہ غضب کی اور یہ ایک تیسری قسم انسانوں کی پیدا ہوتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کسی معدوم کو بغیر کسی استحقاق کے صرف موجود کرنا وجود کی نعمت اور لذت سے سرفراز فرمانا خواہ وہ ایک سیکنڈ ہی کے لیے کیوں نہ ہو، حق تعالیٰ جل مجدہ کا ایسا انعام ہے جسے ان کے سوا آسمان وزمین کی کوئی طاقت کسی کو عطا نہیں کرسکتی۔ سائنس اور کیمیا کے ہوش رُبا ایجادات صرف ان صلاحیتوں کا پتا چلا سکتے ہیں جو قدرت نے اشیا میں ودیعت فرمائی ہیں، لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ ایجاد (وجود بخشنا) یہ انسان کے بس سے باہر ہے۔ پانی اور ہوا کے جراثیم جن کے متعلق کہا جاتا ہے

کہ منٹوں میں پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں، یا مکھیاں جو ایک ہی ہفتے میں دادی پردادی تک کی پشتوں تک پہنچ جاتی ہیں اور یوں ہی ایک نسل آتی رہتی ہے جاتی رہتی ہے [1]۔ ان مکھیوں یا حشراتی حیوانات میں اعضا کا باضابطہ نظام ہوتا ہے۔ ان میں باصرہ، شامہ، سامعہ ہر قسم کے حواس بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ سال، ماہ، ہفتہ، دن، گھنٹہ، سکینڈ، جتنی دیر کے لیے بھی ان نعمتوں سے لذت اندوزی کا ان کو موقع ملتا ہے بلاشبہ دینے والے کا یہ صرف احسان ہی احسان ہے۔ وجود اور ہستی فطرت کا ایک ایسا مطالبہ ہے کہ پانی کی جونکوں اور کیچوؤں تک کی یہ حالت ہے کہ ایک زندہ کھال کے سوا ان کے پاس وجود کا کوئی سرمایہ نہیں ہوتا، لیکن اپنی حد تک حفاظت خود اختیاری میں سارا زور ایسی چیزیں بھی لگا دیتی ہیں۔ ایک بیمار بستر مرگ پر آخری حالت میں ہوتا ہے، لیکن جس قیمت پر بھی چند سانسوں کے لینے کا موقع اسے ملتا ہے اپنی اپنی حد تک

[1] ''مرتی رہتی ہیں اور جیتی رہتی ہیں۔'' بجائے ان الفاظ کے میں نے قصداً آتی جاتی رہتی ہیں کے الفاظ استعمال کیے۔ اس لیے کہ بجز ان حیوانات کے جو ''انسی'' کہلاتے ہیں یعنی آدمی سے ان کا ملکی تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سوال نہایت پیچیدہ ہے کہ حیوانات کی پیدائش کا جو اوسط ہے اس کے حساب سے چاہیے تھا کہ دنیا ان میں سے کسی ایک ہی حیوان سے بھر جائے، لیکن جب سے دنیا قایم ہے پرندوں اور وحشی حیوانات وغیرہ کی ایک خاص تعداد ہے جو زمین پر پائی جاتی ہے۔ حشرات بھی موسمی حالات کے تحت پیدا ہوتے ہیں اور ایک طوفان امنڈ آتا ہے۔ مچھروں، پتنگوں کھٹملوں کی خاص موسم میں کثرت ہو جاتی ہے، پھر یکایک معلوم ہوتا ہے کہ غایب ہو گئے۔ آدمی رات دن زمین پر چلتا پھرتا ہے، جھاڑو دیتا ہے، لیکن ان چیزوں کی لاش طبعی موت والی نہیں ملتی، گویا چڑیا جو بارہ مہینے گھروں میں رہتی ہے ایک اوسط تعداد ان کی پائی جاتی ہے، لیکن جس نسبت سے ان کے توالد، تناسل کا سلسلہ جاری رہتا ہے پھر یا یہ ہوتا کے گھروں میں اس چڑیا کے سوا کچھ نہ ہوتا یا ہر روز جھاڑو دینے میں بیسیوں لاشیں طبعی موت سے مرنے والی چڑیوں کی ملتیں، وہ نہ ملتیں تو ان کے پر ان کے کچھ ایسے اجزا جنھیں نہ بلیاں کھاتی ہیں نہ دوسرے جانور، لیکن گھروں میں ہو یا جنگلوں میں پھلوں کا انبار ملتا ہے۔ آم کے زمانے میں آموں کے ڈھیر ٹپکے ہوئے ملتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے کھانے والے زیادہ ہیں لیکن پرندوں یا جنگلی جانوروں کی طبعی موت کی لاشوں کا پتا آج تک کسی نے نہیں دیا ہے۔ یہ کیا قصہ ہے؟ واللہ اعلم بالصواب ان کے وجود و عدم کا کیا قانون ہے؟

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ.

کوئی اس میں کمی نہیں کرتا۔ پس یہ قول حضرت مجددؒ اگر بعض انسانی افراد بجائے جنت اور دوزخ کے معدوم محض کر دیے جائیں گے تو یقیناً حق تعالیٰ نے دنیا میں ان کو جینے کا اور موجود ہونے کا جتنا بھی موقع دیا صرف انعام ہی انعام، رحمت ہی رحمت ہے۔ ایسی رحمت کہ اگر کسی طبیب کے متعلق کسی کو معلوم ہو جائے کہ وہ مقررہ وقت سے ایک دن یا دو دن آدمی کی موت ٹال دیتا ہے تو خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے قدموں پر دولت کی کتنی مقدار نثار ہو۔ پھر چند دنوں کی زندگی کی اگر یہ قیمت ہے تو جن لوگوں کو بیرونی یا اندرونی موانع کی وجہ سے سیدھی راہ نہ مل سکی اگر دنیا میں وجود اور وجود کے لوازم کی نعمتوں سے متمتع ہو کر دوسری زندگی میں دینے والا ان کو ابدی زندگی نہ عطا کرے تو جہاں لاکھوں اور کروڑوں جراثیم، حشرات، پرند، چرند، درند جان داروں کے ساتھ قدرت کا یہ سلوک سراسر فضل و احسان ہے وہیں ان چند انسانوں کے ساتھ بھی اگر یہی برتاؤ کیا جائے تو اس کے فضل و کرم میں اس کا شمار بھی کیوں نہ ہوگا؟ اور سچ تو یہ ہے کہ جہنم کے عذاب سے بچا لینا یہ خود ارحم الراحمین کی کیا کم رحمت ہے؟ اور وہ سطحی وسوسہ جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو بھی عقل یا زندگی یا حواس وغیرہ کا وہی حصہ کیوں نہ عطا کیا؟ یہ ایسی بات ہے کہ اللہ میاں سے ساری انسانیت اس لیے بگڑ بیٹھے کہ آپ نے ہمیں اپنی جیسی قوت و قدرت کیوں نہ عطا کی؟ خود تو خدا بنے ہوئے ہیں اور ہمیں خدا نہ بنایا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ بلا استحقاق وجود کا جتنا حصہ بھی جس کسی کو ملا ہے صرف فضل ہی فضل ہے۔

البتہ حق تعالیٰ سے اس کی دعا ضرور کرنی چاہیے کہ پروردگار! جب آپ نے بجائے حیوانات کے مجھے انسانی نسل میں پیدا فرمایا اور یہ صرف آپ کا فضل ہے تو اسی کے ساتھ ان لوگوں میں مجھے نہ بنا جنھیں انسانی توانائیوں سے سرفراز ہونے کے بعد بھی ان توانائیوں کے قیمت حاصل کرنے اور نرخ بڑھانے کا موقع نہ مل سکا، کہ پیدا تو ہوئے آدم کے گھرانے میں لیکن حشر ہوا جانوروں کے مانند۔

خلاصہ یہ ہے سورۂ فاتحہ میں دعا مانگی ہی جاتی ہے اس بات کی کہ انسانیت کو وہ

راہ دکھائی جائے جس پر چل کر وہ اپنی مکنہ صلاحیتوں کی قیمت حاصل کر سکے، یعنی وہی جس کی تعبیر قرآن نے انعام سے کی ہے اور جس کا ظہور ''الجنتہ و رضوان اللہ'' کی شکل میں ہوگا۔

اب اس کے بالعکس دو ہی صورتیں ہوسکتی تھیں، یعنی راہ سامنے آجائے، معلوم بھی ہوجائے کہ انسان کا رُخ جس راہ پر چلنے سے مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے وہ یہی ہے، لیکن جان بوجھ کر بغاوت وطغیان کی راہ اختیار کر کے غضب الٰہی کا آدمی (العیاذ باللہ) مورد بن جائے، یہ تو پہلی صورت ہوئی۔ اسی حال کو قرآن نے المغضوب علیہم کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی اندرونی یا بیرونی رکاوٹ کی وجہ سے آدمی کے سامنے راہ ہی نہ آسکی ظاہر ہے کہ صراطِ مستقیم کی درخواست دینے والے کے لیے ناگزیر ہے کہ ان دونوں شکلوں سے پناہ مانگے اور یہی دعا حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سکھائی۔

باقی یہ مسئلہ کہ صراطِ مستقیم سے محروم ہونے والوں کی ان دونوں قسموں کے ساتھ حق تعالیٰ کا برتاؤ کیا ہوگا؟ ان میں سے ایک کا حال تو قرآن نے بیان کردیا کہ غضب الٰہی ان سے متعلق ہوگا۔ اور عہد نبوت میں یہ حال ان یہودیوں کا تھا جنھیں مدینہ منورہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے تجربہ کرنے کا براہ راست کھلا ہوا موقع ملا اور جان بوجھ کر انھوں نے کفر کی راہ اختیار کی۔ نصاریٰ عموماً نہ مکّہ میں تھے نہ مدینہ میں، بلکہ ان کی تعداد زیادہ تر بیرون عرب میں تھی، یا عرب کے دور دست علاقوں میں تھے۔ کچھ بھی ہو، یہود مدینہ کو تجربات کے جو مواقع میسر آئے وہ نصاریٰ کو نہ تھے۔ اسی لیے بخاری میں عہد نبوت کے ان دو فرقوں میں سے ایک کو مغضوب علیہم اور دوسرے کو الضالین کے تحت داخل کیا گیا تو ان الفاظ کی یہ ایک اچھی توضیحی مثال ہوسکتی ہے۔

بہر حال نہ راہ پانے والوں میں ایک طبقے کا مغضوب علیہم ہونا تو بدیہی ہے، اب رہا دوسرا طبقہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ قرآن نے اس کی تصریح نہیں کی۔

باب دوازدہم:

حضرت شیخ الہندؒ کا تحقیقی بیان

غالباً ترمذی کا درس ہو رہا تھا۔ حلقۂ درس میں ایک دیوانہ بھی تھا، اسی نے ایک خاص وجہ سے جس کا تعلق ایک وقتی مسئلہ سے تھا کچھ اسی نوعیت کا سوال کیا۔ جواب میں حضرت الاستاذ (شیخ الہند مولانا محمود حسن) قدس سرہٗ نے جو بات ارشاد فرمائی تھی اس وقت تو اس کی قیمت کا اتنا اندازہ نہ ہوا، لیکن جب جنون کے چند میدان اور طے ہوئے تب وہ بات یاد آئی اور وہی اس معمے کا اس فقیر کے نزدیک آخری حل ہے۔
ارشاد ہوا کہ

> "تبلیغ کے مراتب بھی متفاوت ہیں۔ ایک تبلیغ ابوبکر صدیق، عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو ہوئی، ایک تبلیغ مثلاً عام صحابیوں کو ہوئی، پھر یوں ہی تابعین، تبع تابعین کو ہوتی ہوئی مثلاً ہم جیسوں تک پہنچی۔ بلاشبہ ہمیں بھی تبلیغ ہوئی، لیکن جیسی ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے رفقائے کار کو ہوئی ہماری تبلیغ کی نوعیت وہ نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ایمان والوں کا حال ہوا پھر جنھوں نے انکار کیا ان میں ایک انکار ابوجہل کا ہے اور ایک انکار فرض کرو کہ ہندوستان کے کسی دیہاتی ہندو گنوار کا ہے۔ ظاہر ہے کہ تبلیغ کے لحاظ سے ان دونوں کا درجہ بھی ایک نہیں ہے۔ یہ تو پہلا مقدمہ ہوا۔
> دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مواخذۂ الٰہی کے مراتب بھی متفاوت ہیں، یعنی جس درجے کی تبلیغ جس کسی کو ہوئی ہے اسی درجے کا مواخذ بھی اس سے ہوگا۔
> فرمایا گیا کہ بس کلیہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جسے جس درجے کی تبلیغ ہوگی مواخذۂ الٰہی بھی اسی درجے کا اس کے ساتھ متعلق ہوگا اور اسی لحاظ سے اس کی گرفت بھی ہوگی۔ یہ تو کلیہ ہوا۔ لیکن جزئیات پر اس کلیہ کو کیسے منطبق کیا جائے؟ یعنی شخصی طور پر یہ بتانا کہ کسے کس درجے کی تبلیغ ہوئی اور اس کا مواخذہ کس درجے

کا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ دونوں (یعنی تبلیغ و مواخذۂ الٰہی) کے مراتب لامحدود ہیں۔ اس کا متعین و مشخص علم حق تعالیٰ ہی کو ہوسکتا ہے اور ان ہی کا علم فیصلے کے لیے کافی ہے۔ ہمیں صرف اتنا ماننا چاہیے کہ جیسی تبلیغ ہوگی گرفت و مواخذہ بھی اسی کے مطابق ہوگا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص یورپ میں ہو، اس نے تحقیق و تلاش کے ذریعے سے تبلیغ میں اپنا درجہ اونچا کرلیا ہو اور ایک شخص مسلمانوں ہی کے درمیان رہتا ہو، مثلاً ہندوستان کے سیکڑوں ہندو وغیرہ اقوام کا حال ہے کہ ان پر جہل و غفلت طاری ہے۔ پس خدا ہی فیصلہ کرسکتا ہے کہ کس کو کس درجے کی تبلیغ ہوئی۔ البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ تبلیغ کے جس درجے تک پہنچ کر اس نے انکار کیا ہے اسی لحاظ سے اس کی پکڑ ہوگی۔''

ظاہر ہے کہ تقریباً اٹھائیس انتیس سال کی یہ بات ہے، بجنسہٖ الفاظ تو میں نے حضرتؒ کے ادا نہیں کیے ہیں لیکن ان شاء اللہ مفہوم یہی تھا۔ اس حلقۂ درس کے رفقا اگر دنیا کے کسی حصے میں موجود ہوں گے تو وہ اس کی شہادت ادا کرسکتے ہیں۔

کچھ بھی ہو بات یقیناً پختہ ہے اور آخری بات اس سلسلے جو کہی جاسکتی ہے وہ ان شاء اللہ یہی ہوسکتی ہے۔ حضرت مجددؒ کا کلام مجھے بعد کو ملا اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر سہ گانہ کی طرف بھی ذہن بعد کو منتقل ہوا، افسوس ہوا کہ اس وقت یہ چیزیں سامنے ہوتیں تو حضرت الاستاذ رحمتہ اللہ علیہ سے کچھ اور مزید استفادے کا موقع ملتا، لیکن طالب العلمی کے معلومات ہی کیا ہوسکتے تھے، یہی غنیمت ہے کہ سوال کرسکا اور جواب کسی نہ کسی طرح دماغ میں محفوظ رہا، جو آج بحمد اللہ کام آیا۔

مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ آج کل پیدا ہوگیا ہے جس کے دل میں یہ سوال آتا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ رحمتہ اللہ علیہ کا جواب ان کی تشفی کردے گا۔

ایک اور مسئلہ:

اگرچہ شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کے کلیہ سے التزاماً یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ جسے بالکل تبلیغ نہ ہوسکی مواخذہ کا بھی اس سے تعلق نہ ہوگا، لیکن اتنی بات یاد نہیں رہی کہ

حضرتؒ نے اس کی تصریح بھی فرمائی تھی یا نہیں؟ لیکن مواخذہ نہ ہوگا تو پھر باوجود نسل انسانی میں ہونے کے ان کے ساتھ معاملہ کیا ہوگا؟ مثلاً بچپن ہی میں جن کا انتقال ہوا، یا جو معتوہ و مجنون ہیں، یا مادر زاد بہرے ہیں؟ احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ قرآن نے الضالین کے ساتھ جب انعام اور غضب دونوں کو متعلق نہیں کیا، لیکن اسی کے ساتھ قدرت ان کے ساتھ کیا کرے گی؟ اس سے بھی خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ اس لیے ہم بھی خاموش ہو جائیں، خدا کے بندوں کو خدا کے حوالے کر دیں۔ اوروں کے متعلق تو نہیں مگر اولاد مشرکین کے متعلق امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ وہ توقف یعنی خاموشی کے مسلک کو پسند کرتے تھے۔ ہم اسی پر دوسرے غیر مکلفین کو قیاس کر سکتے ہیں، لیکن مجدد الف ثانیؒ نے صراحت کے ساتھ دوبارہ تصریح کی ہے کہ غیر ذمی کفار کی اولاد ہو یا مشرکان زمان فترۃ:

> فَحُكْمُهُمْ حُكْمَ الْبَهَائِمِ مِنَ الْاَعْدَامِ بَعْدَ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ اسْتِيْفَاءَ لِلْحُقُوْقِ۔
>
> ''ان کا حکم جانوروں کا حکم ہے یعنی حقوق کو تکمیل کے لیے دوبارہ اٹھانے اور زندہ کرنے کے بعد وہ معدوم کر دیے جائیں۔''

البتہ دارالاسلام کے مشرکین و کفار کی اولاد کے متعلق مجدد صاحبؒ کا خیال ہے کہ وہ جنتی ہوں گے، کیوں کہ اہل ایمان کے نابالغ بچوں کے متعلق تو سب کا اتفاق ہے کہ وہ جنتی ہوں گے، اس لیے کہ مکلّف ہونے سے پہلے ان کی حیثیت تو ماں باپ کے جز کی ہے۔ ظاہر ہے کہ مومن خود تو جنت میں جائے اور اس کی ٹانگ اور ہاتھ نہ جائے؟ یہ بے معنی بات ہے۔ ہاں! مکلّف ہو جانے کے بعد اس کی شخصیت مستقل ہو جاتی ہے اور نجات و عدم نجات کا مدار اب اسی کے فعل پر ہوگا۔ رہے ذمی مشرکین ان کی اولاد کے جنتی ہونے کا جو مجدد صاحبؒ نے دعویٰ کیا ہے گو ان کا یہ بھی کشف ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن بخاری کی ایک روایت ہے جس میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے واقعے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارد گرد بچوں کو پایا۔

صحابہؓ نے پوچھا کہ کیا مشرکین کی اولاد بھی؟ آپ نے فرمایا:

'اولاد المشرکین ❶.

ظاہر ہے کہ اس میں ذمی غیر ذمی کا فرق نہیں ہے، لیکن کشف مجددی کے ایک حصے کی اس سے تائید ہوتی ہے۔ یوں خدا کی جنت ہے جسے چاہے داخل کرے اور سچی بات تو یہی ہے کہ خدا کی جنت اور خدا کی دوزخ کی داروغگی کا چارج خود بہ خود اپنے ہاتھ میں لے کر کسی کے جنتی اور کسی کے دوزخی ہونے کا فیصلہ غالباً ایک ایسے آدمی کے لیے جسے اپنے فیصلے کی خود خبر نہ ہو، شاید پسندیدہ فعل نہ ہو۔ کم از کم میرے ذاتی مذاق پر یہ بات سخت گراں تھی، اسی لیے ان مباحث میں الجھنا بھی پسند نہیں کرتا، لیکن کیا کیجیے کہ اس زمانے میں ان ہی جزئیات کو حربہ بنا کر آج اسلام کے متعلق دلوں میں غیر شعوری تکذیب پیدا کرنے کی کوشش مختلف سمتوں سے ہو رہی ہے۔ کبھی دور افتادہ جزایر کے باشندوں کو پیش کیا جاتا ہے، کبھی کول، بھیل جنگلی اقوام کا نام لے کر پوچھا جاتا ہے کہ اسلام نے ان لوگوں کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟ ناواقفوں کو کچھ ایسا باور کرایا گیا ہے کہ اسلامی وثائق اور اسلامی علما کے سامنے گویا یہ سوالات تھے ہی نہیں اور عصری ذہانتوں کی یہ کوئی نئی اپج ہے۔ حالاں کہ بات کچھ نہیں ہے لیکن عمومیت تامہ کا دعویٰ اسلام کی طرف سے جو پیش کیا جاتا ہے اس دعوے کو مجروح کرنے کے لیے ان ہی بلکی

---

❶ اس موقع پر شاید یہ تنبیہ مناسب ہے کہ بخاری کی اس روایت کے باوجود بعض خشک مزاج مولوی روایتوں کی سند کی تنقید کے بغیر محض اس لیے کہ عوام میں مشہور ہے، عموماً ایسا پہلو اختیار کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کسی کی مغفرت کرنا چاہتے بھی ہیں تو انھیں کچھ گرانی سی ہوتی ہے۔ یہی اولاد مشرکین کا قصہ ہے۔ ایک روایت عوام میں ایسی بھی مشہور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کی اولاد کا اپنے ماں باپ کے جیسا حشر ہوگا یعنی وہ بھی دوزخی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کوئی مولوی صاحب اس روایت کو لے کر میری طرف نہ دوڑیں۔ اس لیے ان کو مطلع کرتا ہوں کہ حافظ ابن عبدالبرؒ جیسے ناقد بصیر نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے:

"فِیْ سَنَدِہٖ وَھْنٌ وَضُعْفٌ" مَعَ اَنَّھَا مُخَالِفَۃٌ لِلْاُصُوْلِ الْکُلِّیَۃِ لَاتَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی.

اور سطحی باتوں سے ناجایز نفع اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ٹھیک اس کی مثال ایسی ہے کہ ارض سبعین یا قطب شمالی وجنوبی کے باشندوں کے متعلق پوچھا جاتا ہے اور اس لہجے میں پوچھا جاتا ہے کہ گویا اس زمانے سے پہلے لوگوں کو اس کا علم نہ تھا کہ زمین کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جہاں دن اور رات کی مقدار اقالیم معتدلہ کے حساب سے بہت زیادہ طوالت اختیار کر لیتی ہے حتیٰ کہ چھ چھ مہینوں کی رات اور دن کی صورت بھی پیش آجاتی ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ ان مقامات کے باشندے وقتی عبادتوں کو کس طرح ادا کریں گے؟ ان کی پانچ وقتوں کی نمازوں یا مہینہ بھر کے روزوں، جمعہ، عیدین وغیرہ کا کیا حساب ہوگا؟

اس جہل کا کیا ٹھکانا ہے۔ اسلام میں جو مسئلہ آج سے ہزار سال پہلے طے ہو چکا ہے اور صحیح حدیث کی روشنی میں طے ہو چکا ہے یعنی مقصود ان عبادتوں سے صرف بندوں اور خدا کے تعلق کی تصحیح ہے، ضبط ونظم کو قایم کرنے کے لیے اوقات مقرر کر دیے گئے ہیں کہ اصل مقصد کے حصول میں اس سے زیادہ مدد ملتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حکم ان ہی مقامات تک محدود رہے گا جہاں ضبط ونظم کے ان ذرایع سے نفع اٹھایا جا سکتا ہو، لیکن جہاں اس کا امکان نہ ہو تو ذرایع کے لیے اصل مقصد کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ نماز کے ادا کرنے کی طہارت وصفائی کے ساتھ یہ صورت مقرر کی گئی ہے کہ آدمی اگر جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کرے اور یوں وضو کر کے نماز پڑھا کرے، لیکن سرے سے اگر کہیں پانی نہ ملے تو کیا صرف اسی لیے کہ پانی نہ ملا، انسان کا جو فرض ہے یعنی ذکر اللہ میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ صرف کرنا، کیا اس سے وہ مستثنیٰ کر دیا جائے گا؟

اسلام نے حکم دیا کہ پانی نہ ملے تو غسل کی ضرورت ہو یا وضو کی، ہر حال میں تیمّم کر کے اصل مقصد کو ادا کرنا چاہیے۔

اسی طرح کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکتے ہو تو بیٹھ کر پڑھ لیا کرو، بیٹھ کر بھی ممکن نہ ہو تو اشاروں سے ذکر اللہ کے فرض کو ادا کرو۔ الحاصل ذرایع کی وجہ سے ظاہر ہے کہ اصل مقصد کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ دستر خوان یا برتن، رکابی، کٹورے اگر نہ مہیا ہو سکیں تو

آدمی کھانے کو چھوڑ نہیں سکتا۔ یہی حال اوقات کا بھی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ قرب قیامت میں اوقات کا نظام جب بدل جائے گا اور ایک ایک دن چالیس دنوں کے مساوی ہوگا تو نمازیں کیوں کر پڑھی جائیں؟ تو صحیح حدیث ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اندازہ کرلیا کرنا، یعنی چوبیس گھنٹوں میں پانچ دفعہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اللہ کو یاد کرلیا کیجیو۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے، جس میں تمام وقتی عبادتوں کا حل چھپا ہوا ہے۔ مدت ہوئی کہ فقہائے اسلام اسی حدیث کی روشنی میں اس فتوے سے فارغ ہو چکے۔ بحمداللہ آج تک فن لینڈ جیسے مقامات تک میں مسلمانوں کی مسجدیں موجود ہیں جہاں معتدل اقالیم کے اوقات کا جو نظام ہے باقی نہیں رہتا اور ان مسجدوں میں صدیوں سے اسی فتوے کی بنیاد پر عمل درآمد جاری ہے، لیکن ایک فیصل شدہ مسئلے کو بار بار اٹھایا جاتا ہے اور ان قوموں کی اغوائی کوششوں کے ذریعے سے اٹھایا جاتا ہے جو خود بھی مذہب رکھتی ہیں۔ ان کے مذاہب میں بھی وقتی عبادات ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے مذہبی سوالات کی جواب دہی کی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہی ذمے دار ہے۔ یوم السبت والے یہودی اور اتوار والے عیسائی اور شمسی وقمری تحویلات میں برت منانے والے ہندو، نو روز ومہر جان والے پارسی ان میں سے کسی کی طرف یہ سوالات گویا عاید ہی نہیں ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ سوال ان قوموں کی طرف اسی لیے عاید نہیں ہوتا کہ ان کے پاس اس کا جواب ہی نہیں ہے۔ مگر بحمداللہ اسلام اپنے پاس ان سوالات کے جوابات رکھتا ہے، اسی لیے اس سے پوچھا بھی جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں تبلیغ کی نسبت سے افراد انسانی کی ان استثنائی حالتوں کا بھی سوال تھا۔ ظاہر ہے کہ سوال تو ہر اس قوم کی طرف متوجہ ہوتا ہے، جو بنی آدم کو دین اور خدائی قانون کا مکلّف قرار دیتے ہوئے سزا وجزا کے نتائج کو ان کے اعمال وافعال پر عاید کرتی ہے، لیکن ان کے پاس جب اس سوال کا جواب نہیں ہے تو کس بھروسے پر سوال اٹھانے کی ہمت ہو؟ اس لیے دم سادھ لینے ہی میں اپنی عافیت انھیں نظر آتی ہے۔

لیکن آپ دیکھ چکے کہ صرف مفکرین اسلام کی کتابوں ہی میں اس سوال کا جواب موجود نہیں ہے بلکہ خود قرآن، قرآن کی پہلی سورت، الفاتحہ ہی میں وہ کہہ دیا گیا تھا جو پوچھا جا سکتا تھا۔ فالحمدللہ الذی بعزتہ و جلالہ تتم ثم الصالحات.

محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے خاتم اور عام و کامل ہونے کی ایک معمولی دلیل یہ بھی ہے کہ اس قسم کے استثنائی سوالات اور شاذ و نادر صورتوں کا بھی جواب اس میں موجود ہے۔ ورنہ آخر دوسرے ادیان بھی ادیان ہی تھے، میں نہیں جانتا کہ ان میں ان سوالات یا ان کے جوابات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے؟ زیادہ تر اس بحث کے چھیڑنے کی بڑی وجہ یہی داعیہ تھا، ورنہ بات اتنی اہم نہ تھی۔

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ.

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

مناظر احسن گیلانی

۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۳۶۱ھ

حیدرآباد دکن جوار الجامعۃ العثمانیہ حرسہا اللہ وحمایا

حصہ دوم

مذہب اور اس کی ضرورت، وجود باری تعالیٰ اور صفات و شفاعت، حقیقت محمدیہ اور مسئلہ تبلیغ و مواخذہ پر جامع مضامین کا مجموعہ

تصنیف

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی قدس اللہ سرہ

تدوین و ترتیب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

ناشر

مکتبہ اسعدیہ کراچی

فہرست مضامین

الدین القیم (حصہ دوم)

پیش لفظ

ہستی کا یہ نظام محسوس جس میں ہم (یعنی بنی آدم) بھی شریک ہیں، اس کے متعلق عموماً انسانی فطرت میں اس قسم کے بنیادی سوالات جو اٹھتے رہتے ہیں مثلاً یہی کہ اس کی ابتدا کیا ہے، انتہا کیا ہے؟ اسی سلسلے کا آخری سوال یہ بھی ہے کہ آخر یہ جو کچھ بھی ہے اس کا مدعا کیا ہے؟

اپنی کتاب ''الدین القیم'' کے پہلے حصے میں اس آخری سوال کے سوا تقریباً ان تمام سوالوں کے جوابوں کو بیان کر چکا ہوں جن پر اسلام کے علمی اور فکری نظام کی بنیاد قائم ہے۔ عام طور پر ان ہی کی تعبیر لوگ ''عقاید'' کے لفظ سے کرتے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں کیا جاننا اور کیا ماننا چاہیے؟ گویا اس سوال کا جواب کتاب کے پہلے حصے میں دیا گیا تھا۔ متعدد بار مختلف مقامات میں یہ کتاب چھپ چکی ہے اور متعلقہ حلقوں میں کافی روشناس ہو چکی ہے، لیکن اسلام کے عملی نظام یعنی ایک مسلمان کو دینی حیثیت سے کیا کرنا چاہیے؟ جو اسی آخری سوال ''مدعا کیا ہے؟'' کا گویا جواب ہے، وعدہ کیا تھا کہ اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصے میں کی جائے گی، لیکن ایفائے عہد کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب اپنے خاص کرم فرما مولانا عتیق الرحمٰن مدیر ''برہان'' (ایدہ اللہ بروح منہ) کے اصرار بلیغ سے قلم اٹھالیا گیا ہے، تاکہ اس پرانے وعدے کو پورا کیا جائے۔ نہیں جانتا کہ ''اجل مسمّٰی'' میں اتنی گنجایش باقی بھی رہ گئی ہے یا نہیں کہ جو کچھ ارادہ کیا ہے وہ پورا ہوگا؟ بہر حال حق سبحانہ وتعالیٰ ہی کی طرف سے توفیق رفیق ہو سکتی ہے۔ اس کی مشیت ہوگی تو کام ختم ہوگا ورنہ

گر بہ میریم عذر مابہ پذیر
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

طے یہی کیا گیا ہے کہ جیسے جیسے مسودہ قلم بند ہوتا جائے قسط وار مجلّہ برہان میں وہ شایع ہوتا رہے۔ کام شروع کیا جاتا ہے۔

وَالْاِ تْمَامُ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَهُوَ حَسْبِىْ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ.

باب اول:

کس لیے؟

کس لیے؟ کے اس عنوان کا جسے مضمون کی پیشانی پر درج کیا گیا ہے، مطلب اس کا یہی ہے کہ یہ آسمان وزمین، ہوا، مٹی، پانی، جمادات ونباتات، انسان الغرض وہ سب کچھ جو ہمارے سامنے ہے اس کی پیدائش وآفرینش کا مدعا کیا ہے؟ اسی سوال کا جواب دیا جائے اور بتایا جائے کہ قدرت کے کس نصب العین کی تکمیل ان کے وجود سے ہوتی ہے؟

اس سلسلے کی سب سے پہلی دل چسپ بات تو یہی ہے کہ کائنات کا ان طویل و عریض صفوں کے درمیان سے اگر بنی نوع انسانی کو باہر نکال لیا جائے یعنی بنی آدم کے سوا دنیا کے دوسرے ماورائے انسانی حقایق وموجودات کے متعلق ''کس لیے؟'' کے اسی سوال کو اٹھا کر پوچھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب گویا ان میں سے ہر ایک کے منہ پر رکھا ہوا ہے۔

اشیا کی نفع بخشی:

آدمی کے سوا آپ دنیا کی کسی چیز کو بھی اٹھا لیجیے، ہوا ہی کو لیجیے، پانی ہی سے پوچھیے، آگ ہی سے دریافت کیجیے، آپ کے سامنے ان میں سے ہر ایک اپنے وجود کے منافع کی ایک طویل فہرست لے کر کھڑی ہو جائے گی۔ ان اشیا کی افادیت کا پہلو اتنا واضح، اتنا بین اور روشن ہے کہ اس پر بحث کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ کون نہیں سمجھتا کہ صرف ہوا ہی کا عنصر اگر فضائی احاطے سے باہر نکال لیا جائے، یا پانی ہی کا ذخیرہ کرہ زمین پر ختم ہو جائے تو ساری جان رکھنے والی ہستیاں پھڑ پھڑا کر اسی وقت دم توڑ دیں گی۔ عالم کا سارا نظام ہی درہم و برہم ہو کر رہ جائے گا۔ زندگی کی ان ناگزیر ضرورتوں کے سوا کائنات کے اسی دایرے میں بڑا ذخیرہ ایسی چیزوں کا بھی ہے جن

کے متعلق تجربہ مسلسل یہی ثابت کرتا چلا آ رہا ہے کہ کل تک جو قطعاً نکمّی اور بے کار سمجھی
باقی تھیں پوچھنے والے انہی سے جب پوچھتے رہے کہ تو کس لیے ہے؟ تو دیکھا گیا کہ
فواید و مصالح کے سمندر انہی سے امنڈ پڑے۔ آخر شکم زمین کل وہی سڑا ہوا بدبودار،
متعفن سیال مادہ جسے پڑول یا عوام مٹی کا تیل کہتے ہیں۔ کل اس غریب کا کیا حال تھا؟
سر پیٹ لیتا ہوگا جس بدقسمت کے کنویں میں بجائے پانی کے یہی مٹی کا تیل ابل پڑتا
ہوگا۔ لیکن زمین کے پیٹ کا یہی گندہ، غلیظ ذخیرہ کون نہیں جانتا کہ آج حکومتوں اور
سلطنتوں کے بازوؤں کی سب سے بڑی قوت اور طاقت بنا ہوا ہے۔ تعمیری
کارروائیاں ہوں یا تخریبی، سب کی روح رواں آج یہی سڑا ہوا، متعفن، بدبودار پانی
بنا ہوا ہے یا چند صدی پہلے ان کالے کلوٹے پتھر کے ڈھیلوں کی کیا قدر و قیمت تھی؟
جنہیں ہم پتھر کا کوئلہ کہتے ہیں، مگر آج معدن زغال سے نکلنے والے یہی سیاہ پتھر اور
ان کے ٹکڑے انسانی تمدن و عمران کے جوہری ستون بنے ہوئے ہیں۔ صنعتی
سرگرمیاں، میکانیکی اولوالعزمیاں عموماً انہی کی رہین منت ہیں۔ ریلیں انہی کے بل
بوتے پر دوڑائی جارہی ہیں، فیکٹریوں کا سارا زور و شور انہی کے دم قدم سے قایم ہے
اور زندگی کے جن جن گوشوں میں ان سے کام لیا جارہا ہے، اس سے کون ناواقف ہے!
سچ تو یہ ہے کہ جنگل کی گری پڑی جڑی بوٹیاں آج ہی نہیں، تاریخ کے نامعلوم
زمانے سے مسلسل یہی سبق پڑھاتی چلی جارہی ہیں کہ

خاک ساران جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

مشاہدہ بتارہا ہے کہ کاینات کی حقیر سے حقیر شے صرف اسی وقت تک بے کار
رہتی ہے جب تک کہ کام لینے والوں نے اس سے کام نہیں لیا، لیکن پوچھنے والوں نے
جب کبھی ان کے سامنے کس لیے؟ کے اسی سوال کو پیش کیا، دیکھا گیا کہ امرت کے
دھارے اور آب حیات کے سرچشمے اسی سے پھوٹ پڑے۔ کیمیا گر تو ان ہی کے منہ
سے سونا اگلواتے ہیں، اطباان ہی کے اندر انسانی زندگی کی ضمانت سمجھتے ہیں کہ مستور

ہے، طرفہ تماشا یہی ہے کہ کس لیے کا یہی سوال جس کے جواب سے ماورائے انسانی موجودات گویا زیر نظر آتے ہیں، فقط چھیڑنے کی ضرورت ہے کہ جواب کے لیے معلوم ہوتا ہے ان میں ہر ایک مضطرب اور بے چین تھا۔ نغموں سے جیسے ستار کے تار معمور ہوتے ہیں زخمہ کی چوٹ لگی نہیں کہ وہ گنگنا اٹھتے ہیں، کچھ یہی کیفیت اس سوال کے جواب میں ان کی نظر آتی ہے۔

لیکن جوں ہی کہ اسی "کس لیے؟" کے سوال کا رخ غیر انسانی حقایق اور ماورائے بشری موجودات سے پھیر کر بنی آدم کی طرف موڑ دیا جاتا ہے تو اب اسے کیا کہیے کہ اچانک سکوت کا عالم طاری ہو جاتا ہے، سناٹا چھا جاتا ہے اور ہم میں سے ہر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتا ہے۔

انسان سے کائنات کی بے نیازی:

مطلب یہ ہے کہ اس خاک دان ارضی سے بنی آدم کے ایک فرد کو چن چن کر اگر ختم کر دیا جائے، ان کے اونچوں کو بھی ختم کر دیا جائے اور نیچوں کو بھی صاف کر دیا جائے، نہ وہی باقی رہیں جو ان میں بڑے گنے جاتے ہیں اور ان کا بھی نام ونشان مٹا دیا جائے جو سمجھے جاتے ہیں کہ چھوٹے ہیں۔ نہ کہتروں کو چھوڑا جائے اور نہ مہتروں کو، نہ عالموں کو نہ جاہلوں کو، الغرض بسیط زمین کو فرض کر لیا جائے کہ نسل انسانی سے قطعی طور پر خالی ہو چکی ہے، تو اب خود سوچیے کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی ہوائیں اپنی اٹکھیلیوں سے کیوں رک جائیں گی؟ پانی کا بہاؤ کیوں تھم جائے گا؟ یقیناً اس وقت زمین کا یہی فرش اسی طرح بچھا رہے گا جیسے اس وقت بچھا ہوا ہے، نیلگوں آسمانوں کا شامیانہ اسی طرح تنا رہے گا جیسے اس وقت تنا ہوا ہے، آفتاب اسی طرح طلوع ہوتا رہے گا جیسے اس وقت طلوع ہو رہا ہے، دریا اسی طرح فرائے بھرتے رہیں گے جیسے آج بھر رہے ہیں، ندیاں اپنی وادیوں میں اسی طرح کھیلتی رہیں گی، درخت جھومتے رہیں گے، پھول کھلتے رہیں گے، جیسے آج یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ خلاصہ یہی ہے کہ کائنات کا یہ سارا کارخانہ نسل انسانی کے بغیر بھی اسی طرح چلتا رہے گا

جیسے اس وقت جاری ہے۔ قطعاً کسی چیز میں نہ کسی قسم کا خلل ہی پیدا ہوگا، نہ حرج ہی واقع ہوگا، ہر چیز اپنے حال پر رہے گی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہواؤں میں اڑنے والے تنکوں اور گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے سنگریزوں اور ٹھیکریوں کو بھی اس کی پروانہ ہوگی کہ آدم کی اولاد کہاں جا کر دفن ہوگئی۔

انسانی کی ناکارگی:

سامنے کا یہی وہ واقعہ ہے جسے سوچنے والے سوچتے ہیں اور مبہوت ہوکر رہ جاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ وہی جو یہاں سب سے زیادہ مکرم ومحترم نظر آتا ہے کمالات کی ساری ارتقائی منزلیں جس پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ ختم ہوجاتی ہیں، وہی جو اپنی بے پناہ تسخیری قوتوں سے ہر ایک کو یہاں اپنے نیچے دبائے ہوئے ہے، پہاڑوں کو توڑ رہا ہے، دریاؤں کے رخوں کو موڑ رہا ہے، تناور درختوں کو ڈھا رہا ہے، جس پر جی چاہتا ہے چھاتا چلا جارہا ہے، شیر بھی اپنے کچھاروں میں اس سے کانپتے ہیں، ہاتھی بھی جنگلوں میں اس سے پناہ مانگتے ہیں، سمندر کی مچھلیوں میں بھی تلاطم برپا ہے، پرندوں میں بھی کھلبلی مچی ہوئی ہے، چرندے بھی جس سے سراسیمہ اور پریشان ہیں۔ یہ اور اسی قسم کی ساری بڑائیوں کا یہی قدرتی حق دار انسان جب کس لیے؟ کے اسی سوال کے سامنے لاکھڑا کیا جاتا ہے تو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ جو سب کچھ تھا وہ کچھ بھی باقی نہ رہا۔ ہوائیں بھی اسے ٹھکرارہی ہیں، پانی بھی اسے دردرا رہا ہے، زمین بھی اسے اگل رہی ہے، آسمان بھی اسے واپس کررہا ہے، گویا ساری خلقت ہی کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ آدم کی اولاد کے ساتھ کسی کی کوئی ضرورت وابستہ نہیں ہے۔

اللہ اللہ سب بول رہے ہیں، کس لیے؟ کے ہی سوال کے جواب میں سب کی زبانیں کھلی ہوئی ہیں، گھاس اور پھونس بلکہ بول وبراز جیسی عفونتوں اور غلاظتوں تک جیسی چیزیں بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے خدمات کے ساتھ حاضر ہوجاتی ہیں۔ کس لیے؟ کے سوال کا جواب کسی نہ کسی رنگ میں ہر ایک کی طرف سے مسلسل پیش ہوتا رہا اور ہوتا رہتا ہے، کھاد ہی بن کر سہی یا اپلوں ہی کا قلب اختیار کرکے، لیکن آپ

دیکھ رہے ہیں کہ ناکارگی اور نکماپنی کے الزام کو ان میں کوئی بھی بہ خوشی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ان میں بھی ہر ایک اسی کی شہادت ادا کر رہا ہے کہ پیدا کرنے والے نے ان کو بھی بے کار بنا کر پیدا نہیں کیا ہے۔ جتنا ڈھونڈھا جائے پتا یہی چلتا ہے کہ افادیت اور نفع بخشی کے نت نئے پہلوؤں کی ضمانت ان کے وجود میں بھی پوشیدہ ہے۔

مقصد حیات انسانی:

لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ وہی جو ذرہ ذرہ تنکے تنکے سے کس لیے؟ کہ اسی سوال کا جواب حاصل کر رہا ہے، آہ کہ اسی انسان آدم کی اولاد سے جب پوچھا جاتا ہے کہ آخر تیرے وجود سے بھی قدرت کے کسی نصب العین کی تکمیل ہوتی ہے؟ تو سب سے جواب لینے والا یہی انسان اسی ''کس لیے؟'' کے جواب میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا گونگا اور بہرا بن گیا۔ دریافت کیا جاتا ہے کہ پیدا کرنے والے نے آخر تجھے کس لیے پیدا کیا ہے؟ تیرے وجود کی غرض و غایت کیا ہے؟ تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اپنے آپ کو کس کے لیے بتائے؟ نیچے سے اوپر تک ساری خلقت اور اس کے مختلف طبقات کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیتا ہے، ہر ایک پر اپنے آپ کو پیش کر کر کے دیکھتا ہے اور سر جھکا لیتا ہے کہ ساری کائنات میں اس کا اور اس کی خدمات کو کوئی خریدار نہیں، اس کا گاہک کوئی نہیں، کسی کی کوئی ضرورت کسی حیثیت سے آدمی اور آدمی کے وجود کے ساتھ اٹکی ہوئی نہیں ہے۔

ایک مغالطہ اور اس کا جواب:

اس موقع پر بعض لوگ مغالطوں سے کام لینا چاہتے ہیں۔ ایک صاف اور سلجھی ہوئی بات کو الجھا دینا چاہتے ہیں۔ یعنی بجائے غیروں کے ایک آدمی کی ضرورت دوسرے آدمی سے جو پوری ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے اسی کو انسانی وجود کی کافی قیمت ٹھہرا کر چاہتے ہیں کہ خود بھی مطمئن ہو جائیں اور دوسروں کو بھی مطمئن کر دیں۔ بجائے

خود یہ ایک مستقل اور جداگانہ مسئلہ ہے۔ تفصیلی بحث تو اس کی آیندہ آرہی ہے، لیکن سردست ایک مثال کو تو گوش زد کر ہی دینا چاہیے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بیچنے والا آپ کے سامنے بیچنے کے لیے کسی ایسے پودے کو پیش کرتا ہے جسے آپ نے نہ کبھی خود دیکھا تھا، نہ اس کے صفات وخصوصیات کا ذکر کسی سے سنا تھا، نہ کسی کتاب میں پڑھا تھا، الغرض آپ کے لیے وہ قطعاً مجہول الذات والصفات پودا ہوا۔ اسی وجہ سے آپ بیچنے والے سے پوچھتے ہیں کہ یہ کس لیے ہے؟ اس کے پھلوں سے کیا کام لیا جاتا ہے یا لیا جاسکتا ہے؟ جواب میں پودے کا بیچنے والا اگر یہ کہے کہ جناب والا اس پودے کی جڑ تو اس کے تنے کے لیے ہے اور تنے شاخوں کے لیے، شاخیں پتوں کے لیے اور یہ سب مل کر ان پھلوں کے لیے ہیں جن میں تخم اور بیج پیدا ہوتے ہیں اور آیندہ اسی شکل و صورت کے پیدا ہونے والے پودوں کی پیدایش میں وہ کام آتے ہیں پھر یہ پیدا ہونے والے پودوں کی جڑیں تنوں کے لیے، تنے شاخوں کے لیے، شاخیں برگ وبار پھولوں اور پھلوں کے لیے اور پھلوں کے تخم آیندہ پیدا ہونے والے پودوں کے لیے، یوں ہی ایک دوسرے کے لیے بنتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی اس ہذیانی مضحکہ خیز تقریر کو پودے کا بیچنے والا اگر آپ کے اس سوال کا یعنی یہ پودا کس لیے ہے؟ اور اس کے پھلوں سے کیا کام لیا جاتا ہے؟ اسی کا جواب قرار دے تو سوچیے کہ آپ کا غصہ کیا تھم سکتا ہے؟ کیا اپنی عقلی تضحیک کے سوا اس کی یہ عجیب وغریب تقریر آپ کو کچھ اور بھی محسوس ہوسکتی ہے؟ اور ایک پودا ہی کیا، کسی جانور کا فروخت کرنے والا جو خود جانتا ہو کہ جس جانور کو بیچنے کے لیے وہ نکلا ہے اس کا کیا فایدہ یا اس سے کیا کام لیا جاسکتا ہے؟ باوجود اس کے لوگوں کے سامنے کہتا پھرے کہ گو میں خود یہ نہیں جانتا کہ قدرت نے اس جانور کو کس کام کے لیے پیدا کیا ہے اور اس سے کیا فایدہ اٹھایا جاسکتا ہے، لیکن چوں کہ اس کا معدہ اس کے خون کے لیے ہے جو اس کے جگر میں پیدا ہوتا ہے اور خون اس کے گوشت پوست چربی اور ہڈیوں اور اس تولیدی مادے کے لیے ہے، جس سے پھر اسی قسم کا جانور پیدا ہوجاتا ہے، یہی اس جانور کی کافی قدر و قیمت ہے،

اگر ہذیان اور جنون کے سوا اس کی یہ بکواس اور کچھ نہیں ہے تو بنی نوع انسانی کے افراد کے متعلق اس سوال کے جواب میں یعنی یہی کہ وہ کس لیے ہیں؟ یہ کہنا کہ باہم ایک دوسرے کے وہ کام آتے ہیں اور اگلی نسلیں پچھلی نسلوں کی پیدائش کا ذریعہ بن کر ہر اگلی نسل پچھلی نسل کے لیے بنتی چلتی جاتی ہے اور اسی قصے پر انسانی وجود کی قدر و قیمت کو ختم کرنے کی جرأت !!! خود سوچیے کہ ابلہ فریبی کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

مان بھی لیا جائے اور ایسا ہو بھی جائے کہ ہم میں ہر فرد اپنے خاندان کے لیے، خاندان قوم کے لیے، قوم سارے انسانوں کے لیے اور انسانوں کی ہر اگلی نسل پچھلی نسل کے لیے کام کرتی چلی بھی جائے تو زیادہ مطلب ان سارے طول طویل قصوں کا وہی تو ہوا کہ پودے کی جڑ تنے کے لیے، تنا شاخوں کے لیے، شاخیں پتوں کے پھولوں کے لیے، پھل تخم کے لیے، تخم آیندہ ان ہی جیسے ان جانے مجہول الخواص والصفات پودوں کی پیدائش کے لیے اور نئے پودے پھر ان ہی منزلوں سے گزرتے ہوئے دوسرے نئے پودوں کے لیے وَهَلُمَّ جَرًّا۔ جیسے اس گھن چکر میں گردش دینے کے بعد بھی یہ سوال کہ پودا انسانی افراد کے تعلقات کا یہ تسلسل اس سوال کا یعنی پیدا کرنے والے نے انسان کو کس لیے پیدا کیا ہے؟ اس سوال کا مغالطہ آمیز اور مضحکہ خیز نہیں بلکہ واقعی صحیح منطقی جواب کیسے بن سکتا ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ زید نے عمر کے منہ میں لقمہ ڈالا اور عمر نے زید کو کپڑے پہنائے، اس میں شک نہیں کہ ایک دوسرے کے کام ضرور آئے، لیکن دونوں مل کر پھر کیا کریں؟ سوال تو انسانیت کے متعلق ہے کہ مصاف ہستی میں اس کے وجود سے قدرت کے کس نصب العین کی تکمیل ہوتی ہے کرۂ زمین پر انسانی وجود کا جو ظہور ہوا اس کا مقصد اور اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ فرد پر ہی یہ سوال عاید ہوتا ہے اور بنی آدم کی ساری اگلی پچھلی نسلوں کا مجموعہ اس سوال کے جواب میں ایک دوسرے کے کام آنے کے بعد بھی اسی مقام پر ہے جہاں پہلے تھا۔ یقیناً سر مو بال برابر بھی یہ سوال اپنی جگہ سے نہ ہلا ہے اور نہ ہل سکتا ہے۔

اسی لیے تو میں کہتا ہوں اور یہی کہتا رہوں گا، جس کے کہنے سے مجھے کوئی روک

نہیں سکتا کہ وہی پیٹو نکھٹو آدمی نہیں جس کی جو اپنی ساری کدوکاوش کا آخری محور صرف اپنی ذاتی شکم پروری کو بنائے ہوئے ہے۔ اکبر مرحوم نے جسے سامنے رکھ کر کہا تھا ؎

جو پوچھا دل سے اس جینے کا کچھ حاصل بھی آخر ہے
شکم بولا کہ اس کی فکر کیا بندہ تو حاضر ہے

ان کی اس ظرافت کو پیٹوؤں کے اسی طبقے تک محدود نہ سمجھا جائے بلکہ اپنے ساتھ اپنے بال بچوں، اقربا و اعزہ کو بھی اپنی کمائیوں میں جو شریک سمجھتے ہیں یا ان سے اونچے ہوکر کسی قوم وملّت کی خدمات کو اپنی کوششوں کا جو نصب العین بنائے ہوئے ہیں اور ان سے بھی آگے بڑھ کر ساری انسانیت ہی کے فلاح و بہبود کو جنھوں نے اپنے سامنے رکھ لیا ہے، یا یہ جو سمجھایا جاتا ہے کہ ہر پچھلی نسل کے لیے دنیا کے ماحول کو ممکنہ حد تک خوش گوار اور مسرت بخش بناتے چلے جانے کی غیر منقطع دوامی کوشش یہی انسانیت کا آخری بلند ترین نصب العین ہے۔ ان سارے قصوں اور قضیوں کی بنیاد اس پر قایم ہے کہ خود انسانیت بھی بجائے خود کچھ قدر و قیمت رکھتی ہے۔ بلا شبہ ایسی صورت میں ہر وہ قدم جو انسانیت کے ابھارنے اور سنوارنے کی راہوں میں اٹھایا جائے گا وہ قابل قدر مستحق تحسین و ستایش ہوگا۔ پھر افادیت میں جدوجہد سعی و کوشش کا دایرہ جتنا زیادہ وسیع ہوگا اسی حد تک اس کی قیمت بھی بڑھتی چلی جائے گی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ذاتی شکم پروری والوں کی کوششیں اپنی شخصی ذات ہی کی حد تک کیوں محدود نہ ہوں، لیکن انسانیت ہی کے ایک حصے کو ''یعنی خود پیٹو آدمی کو'' چوں کہ اس سے فایدہ پہنچتا ہے اس لیے اس کی اہمیت بھی چاہیے تو یہی کہ نظر انداز کرنے کی مستحق نہ ہو۔ کچھ نہ سہی، لیکن بہر حال ایک آدمی ہی کو تو بیچارا پیٹو پرورش کرتا ہے، لیکن سرے سے انسانیت ہی اگر نظام عالم کا ایک لایعنی، لاحاصل، عبث، غیر مفید عنصر ہے تو انفرادی شکل میں ہو یا اجتماعی قالب میں، زمین کی پشت کے ایک ناکارہ بوجھ کے سوا وہ کچھ اور بھی باقی رہتی ہے؟ عربی کی مثل مشہور ہے ثبت الجدار ثم النقش یعنی پہلے دیوار تو بنالو، اس کے نقش و نگار آرایش و زیبایش کا مسئلہ تو اس کے بعد پیدا ہوگا۔ بہ قول شخصے:

تار باقی نہیں، کرتا ہے تو دامن پیدا

آخر بتایا جائے کہ فرد خاندان کے لیے، خاندان قوم کے لیے، قوم ساری انسانیت کے لیے اور انسانوں کی ہر اگلی نسل، پچھلی نسلوں کے لیے ہے۔ ان نصب العینوں کو مان لینے کے بعد جیسا کہ بار بار کہتا چلا آرہا ہوں وہی سوال کہ آخر یہ سب کس کے لیے پیدا ہوئے؟ اور کس لیے پیدا ہوتے چلے جارہے ہیں؟ ہم آپ کو کھلائے جائیں، آپ ہمیں پلائے جائیں، آپ کی مدد ہم کریں، ہماری مدد آپ کریں، یوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے قبروں میں گرتے چلے جائیں، دھنستے چلے جائیں، سڑتے چلے جائیں اور کچھ نہ سوچیں کہ دنیا کی حقیر سے حقیر شے کا حال جب یہ ہے کہ آج ہمارے سامنے سے اگر وہ ہٹالی جائے تو ساری انسانیت تلملا اٹھتی ہے، لیکن ایک ہم ہیں کہ نہ زمین ہی کے کام کے ہیں نہ آسمان کے، نہ ہوا ہی کی کوئی ضرورت ہم سے پوری ہوتی ہے اور نہ پانی کی، کسی حقیر ذرہ کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی اگر ساری نسل انسانی زمین کے اس کرے سے پونچھ لی جائے، آخر یہ کیا ہے کہ دنیا کی چیزیں تو بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانی ضرورتوں میں کام آ کر اپنے وجود کے مفاد اور اس کی قدر و قیمت کو مسلسل پوری قوت کے ساتھ ثابت کرتی چلی جاتی ہیں، لیکن ساری خلقت میں ایسا کوئی نہیں جس کے لیے انسانی وجود بھی کوئی قدر و قیمت رکھتا ہو۔

قرآن کی دعوتِ فکر:

غور و فکر کی یہی نازک ترین منزل ہے، جہاں پہنچنے والے جب پہنچتے ہیں اور سنتے ہیں کہ قرآن پکار رہا ہے، ان ہی کو خطاب کر کے پکار رہا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا. (سورۂ مؤمنون: ۱۱۵)

''کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو نکما بنا کر پیدا کیا ہے؟''

تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کے اندرونی احساسات میں تہلکہ مچ جاتا ہے، لرزہ براندام ہو جاتے ہیں، جب قرآن پوچھتا ہے کہ

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی. (سورۂ قیامہ:۳۶)

''کیا آدمی یہ سوچتا ہے کہ وہ نکما بنا کر چھوڑ دیا جائے گا؟''

بلکہ یہ دیکھ کر کہ دنیا کی چیزیں تو انسانی ضرورتوں میں کام آ کر اپنی قیمت حاصل کر رہی ہیں، خدانخواستہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خود انسان اور انسانی وجود کی کوئی قیمت نہیں ہے تو مآلاً اس کا حاصل یہی تو ہوا کہ ہر وہ چیز جس کی قدر و قیمت انسانی وجود کے ساتھ وابستہ تھی وہ بھی بے قیمت بن کر رہ گئی۔ آخر جس کے لیے سب کچھ ہے جب وہی کچھ نہ رہا تو یقیناً سب کچھ بے کار، لا حاصل، عبث و باطل ہو کر رہ گیا۔ جس باغ کے درخت ہی بے ثمر بن کر رہ گئے ہوں یقیناً وہ باغ بھی بے کار رہا اور جو کچھ باغ کی شادابی و سیرابی کے لیے کیا گیا تھا سارا ساز و سامان سب ملیامیٹ ہو کر رہ گیا۔ انسان اور انسانی وجود کو بے مقصد ٹھہرانے کا یہی ناگزیر منطقی نتیجہ ہے۔ قرآن میں

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَهُمَا بَاطِلًا.

(سورۂ ص:۲۷)

''اور ہم نے نہیں بنایا آسمان اور زمین کو اور جو ان کے بیچ میں ہے نکما۔''

اور اسی قسم کی بے شمار آیتوں سے آدمی کے دماغ پر جس کی ٹھوکریں لگائی گئی ہیں اپنی نکما پنی، اپنے وجود کی لا حاصلی سے جن میں چونک پیدا نہیں ہوتی، شاید نظم عالم کے بطلان اور بے حاصلی ان کو فکر معقول کی طرف متوجہ کرے۔ اس مسئلے کے سمجھانے کی یہ دوسری قرآنی تعبیر ہے۔

کائنات کا حیرت انگیز نظام:

اف! کائنات کا یہ حیرت انگیز نظام جس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں حکمت و دانش کا خون دوڑ رہا ہے، مصالح اور دانائیوں کی نازک ترین رعایتیں جس کے ذرّے ذرّے سے ابل رہی ہیں، کیسا عجیب تماشا ہے کہ سبک مغزوں کی ہلکی سی فکری لغزش نے کائنات کے اسی محکم و مرتب، مہیب و مدہش نظام کو لا حاصل مہملات کا ایک ڈھیر اور دفتر بے معنی بنا کر چھوڑ دیا؟ یہ سچ ہے کہ دنیا تو دنیا...... اسی دنیا کی معمولی

انفرادی شخصیت بازار کا بدترین بے فکرا نتھو خیرا بھی ناکارہ اور نکمّے ہونے کے اس دشنام کو برداشت نہیں کرسکتا۔ واقعہ خواہ کچھ ہی ہو لیکن انسانی جبلت اس الزام کو ہضم نہیں کرسکتی۔ شوق ہو تو تجربہ ہی کر کے دیکھ لیجیے۔ اس الزام کا ردعمل گالیوں اور ملاحیوں ہی کی حد تک محدود ہو کر رہ جائے، لاٹھیوں اور جوتیوں سے جواب نہ دیا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ جان بچی لاکھوں پائے۔

عقل کی درماندگی:

بہرحال فطرت و جبلت کا اقتضا خواہ کچھ ہی ہو لیکن غریب عقل کیا کرے؟ دنیا میں جب ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں جسے انسان اور انسانی وجود کی ضرورت محسوس کرا کے دنیا میں آدمی کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کیا جائے۔ آخر کس کی پیٹھ پر لادے اس بوجھ کو؟ جسے لادنے کے لیے یہاں کوئی تیار نہیں۔ اور کس کے سر کا درد بنائے اس نکمی ہستی کو جس سے بات پوچھنے پر کوئی آمادہ نہیں، بلکہ حق تو یہ ہے کہ خلقت ہی کے ہجوم میں جب تک انسانیت بھٹکتی رہے گی پکارنے والے اسی ہجوم میں آدمی کو کھڑا کر کے جب تک پکارتے اور چلاتے رہیں گے کہ

"ہے کوئی آدم کے ان بچوں کا خریدار؟"

تو صرف یہی نہیں کہ زمین کے اس کرے پر آدمی کے قیام و بقا کے جواز کی سند اور کسی منطقی بنیاد کی فراہمی ہی میں عقل اپنے آپ کوشش درو حیران پاتی رہے گی، بلکہ جن زندگی اور زندگی کے احساسات رکھنے والی ہستیوں کا وہ طبقہ جن کے گوشت سے اپنے گوشت میں اور چربی سے اپنی چربی میں آدم کی اولاد اضافے کا کام لیتی ہے اور کام لینے کی عادی ہے، اپنے منہ کو جن جانداروں کا مذبح اور پیٹ کو جن زندہ ہستیوں کا مدفن بنائے ہوئے ہے اور وہی کیا زراعت کو سیراب کرنے کے لیے آب گیروں کے آبی ذخیروں کو اپنے کھیتوں میں جو منتقل کرتے ہیں، جن کے صرف اسی ایک فعل سے خدا ہی جانتا ہے کہ خشکی کی کتنی زندگیاں موت بنتی چلی جاتی ہیں اور جیسا کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ شاید کوئی قدم آدمی کا ایسا اٹھتا ہو جس کے نیچے ہزار جانیں نہ مسلی جاتی

ہوں، ایک ایک گھونٹ میں لاکھوں زندوں کو جو گھونٹ جاتا ہو اور اپنی ہر سانس میں انھیں سُڑک رہا ہو، الغرض دوسروں کی موت سے جو اپنی زندگی پیدا کرتا ہو، دوسروں کو اجاڑ کر اپنے گھر آباد کرتا ہو، تعمیری ضرورتوں کے لیے ایک درخت ہی جب کاٹا جاتا ہے تو کون بتا سکتا ہے کہ اس درخت پر بسیرا لینے والے پرندوں کے کتنے گھونسلے تباہ ہوتے ہیں؟ ان چیونٹیوں، مکڑیوں اور بھانت بھانت کے جانداروں پر کیا گزرتی ہے جن کی واحد پناہ گاہ وہی درخت اور اس کے مختلف گوشے اور حصے تھے؟ جرم کے اس فرد کو جیسا کہ ہم میں ہر ایک جانتا ہے، جتنا چاہے دراز کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ ہی بتائیے کہ انسان کا ناکارہ وجود اس کی بے معنی ولا حاصل ہستی کے جواز کی سند بھی غریب عقل کے پاس کیا باقی رہتی ہے؟ آدمی کی عقل چوں کہ بہر حال آدمی ہی کی عقل ہے، اس لیے بے جا طرف داری یا خواہ مخواہ کی رو رعایت، چشم پوشی اور مروت سے اگر کام نہ لے تو انسانیت کی یہ ساری تسخیری اولوالعزمیاں، اقتداری سربلندیاں، عقل کی آزاد تنقید کے معیار پر پہنچ کر اگر زور اور زبردستی کے ظالمانہ مظاہرے کا قالب اختیار کر لیں تو اس عقلی فیصلے کو مشکل ہی سے غیر منصفانہ فیصلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ انسانی وجود کا کوئی ایسا ہی نصب العین جب تک سامنے نہ لایا جائے جس پر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے اس وقت تک یقین مانیے کہ آدمی کے سارے تسخیری کرامات اور اس کے سارے اقتداری تصرفات جنھیں وہ اپنا پیدائشی حق قرار دے رہا ہے یہ سارا قصہ صرف بھینس اور لاٹھی کا قصہ بن کر رہ جاتا ہے، جس کی بنیاد بجائے عقل وانصاف کے ماننا پڑے گا کہ صرف بربریت ووحشت، جہالت اور سفاہت، ضد اور ہٹ پر قایم ہے۔

اور یہی کیا؟ احترامی حقوق اور تکریمی واجبات کے وہ سارے شریفانہ آداب وضوابط، حکیمانہ نظریے اور قوانین، جو باہم انسانوں میں ایک دوسرے پر عاید کر دیے گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے، عقل وخرد کی پشت پناہیوں میں کیا جا رہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ نیکیوں کے سارے ابواب، غم خواروں کی غم گساری، دل افگاروں کی دل داری، بے یاروں کی یاری، بیماروں کی

تیمارداری یہ اور اسی قسم کے مشورے جنھیں سمجھا جاتا ہے کہ انسانیت و شرافت کے غیر مسئول تقاضے ہیں، جن کے خلاف لب ہلانے کی بھی کوئی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن ان نیک اور معصوم مشوروں کی بنیاد کیا ہے؟ لا حاصل ہے تو ان ہی انسانوں میں جو معذور اور اپاہج ہو چکے ہیں کیوں ان پر توانا اور تن درست آدمیوں کی کمائی ہوئی آمدنیاں برباد کی جائیں؟ امراض کے مقابلے میں جو اپنی سپر ڈال چکے ہیں ان کی بیماری ہی بتا رہی ہے کہ مرض کی مدافعت کی قوت سے وہ محروم تھے، پھر ان ہی پر اس سرمائے کو کیوں ضایع کیا جائے؟ جن سے مدافعت کے اسی میدان میں جیتنے والے صحت مندوں کی صحت و قوت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اسبابی توانائیوں کو بجائے بڑھنے اور ترقی کرنے کے اس لیے کیوں پژمردہ اور افسردہ ہونے کا موقع دیا جائے کہ قبروں کے جھانکنے والے فرتوت از کار رفتہ بڈھے باپوں کی خبر گیری جوان بیٹوں کا انسانی فرض ہے۔ پودوں کی جڑیں تنوں کے لیے، تنے شاخوں کے لیے، شاخیں برگ و بار کے لیے، پھولوں اور پھلوں کے لیے، پھلوں کا وجود آیندہ پیدا ہونے والے پودوں کے تخم اور بیج کے لیے، یہ عمل تو خیر اس لیے جاری ہے اور اسے روکا بھی نہیں جا سکتا کہ اختیار و انتخاب کی قوت سے پودوں کا نباتی وجود محروم ہے، لیکن آدمی کا اختیاری وجود خواہ مخواہ کے ان گھن چکروں میں کیوں پڑے؟ بتایا جائے کہ افراد خاندانوں کے لیے، خاندان قوم کے لیے قربانیوں سے آخر کیوں کام لے؟ راحت و آرام اور لذائذ حیات کے جس ذخیرے اور سرمائے سے جو بھی جس حد تک مستفید ہو سکتا ہے ان سے بجائے خویش کے درویش کو فایدہ اٹھانے کا موقع آخر کیوں دیا جائے؟ آخر ان مسلمات معروفہ کی صحیح منطقی بنیاد بھی تو ہو۔

انسانی جبلت اور فطرت کی رہنمائی:

اگرچہ اسی کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقتداری تصرفات جن سے آدمی یہاں کام لے رہا ہے اور احترامی حقوق و واجبات کا وہ سلسلہ جن کی پابندی کا مطالبہ باہم بنی نوع انسان کے درمیان کیا جاتا ہے، ان دونوں راہوں میں عقل کا حال

جو بھی ہو، لیکن جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جبلت اور فطرت دونوں سلسلوں کی عام کارروائیوں سے اصولاً مطمئن نظر آتی ہے ❶۔ انسانی وجدان کا فیصلہ یہی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے، درست ہو رہا ہے۔ نہ کسی قسم کا کوئی دغدغہ ہی ہم اس فیصلے کے متعلق اپنے اندر پاتے اور نہ کوئی مخمصہ یا خرخشہ۔ سچ پوچھیے تو جبلت کا یہ سکون اور فطرت کی یہ خنکی اشارہ کر رہی ہے کہ عقل کے سامنے سے اس راہ میں کوئی اہم مقدمہ اوجھل ہو گیا ہے، یا ڈالنے والوں نے قصداً اسے اوٹ میں ڈال دیا ہے اور یہ ساری کش مکش جو اپنی عقل اور فطرت و جبلت کے اقتضاؤں میں ہم پاتے ہیں اسی مقدمہ سے ذہول کا نتیجہ ہے۔

---

❶ اصولاً سے میری غرض یہ ہے کہ دوسروں کی موت سے اپنی زندگی اور ذرایع زندگی کی فراہمی ہی کے مسئلے کو مثلاً لیجیے، بنی آدم میں ایسا کون ہے کہ جو اس سے بچ کر زمین کے اس کرے پر جی سکتا ہے یا جینے کا تصور کر سکتا ہے؟ خشکی اور تری کے جانداروں کو زندگی سے محروم کیے بغیر جب آدمی اپنے پیٹ میں ایک دانہ اور پانی کے ایک گھونٹ کو بھی پہنچا نہیں سکتا تو زندگی سے محرومی کی بعض خاص شکلوں مثلاً ذبح وغیرہ کے طریقوں کو دیکھ کر کسی خاص طبقے ہی پر یہ الزام لگانا کہ دوسروں کی موت سے وہ اپنی زندگی پیدا کرتے ہیں، بجز ایک بے بنیاد الزام کے اور بھی کچھ ہے؟ خون سے جن کے دامن تر ہیں وہ دوسروں کی آستین کے چھینٹوں پر کیوں معترض ہیں؟ کسان تالابوں سے اپنے کھیتوں میں جب پانی دیتا ہے تو کہہ چکا ہوں کہ وہ یہ سب جان بوجھ کر کرتا ہے کہ پانی میں زندگی گزارنے والوں کی بھی بڑی تعداد میرے اس فعل سے اپنی زندگی سے محروم ہو رہی ہے اور خشکی میں رہنے والے جانوروں، کیڑوں مکوڑوں پر بھی زیست کی راہیں بند ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ایسی صورت میں ذبیحہ وغیرہ مسئلے کے اختلافات کو اصولی اختلافات قرار دینے کی آپ خود سوچیے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ بلکہ میں تو حیران ہو جاتا ہوں جب بجائے اپنے ذاتی رجحانات کے اس قسم کے اختلافات کو لوگ مذہب کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کر گزرتے ہیں۔ گویا وہ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ زندگی سے محروم کرنے کی یہ خاص شکل مثلاً ذبح کرنے کا طریقہ اس کو خدا ہی نے ناجائز قرار دیا ہے۔ حالاں کہ ساری ڈھکی چھپی باتوں کا خدا جب عالم ہے تو وہ ایسا حکم کیسے دے سکتا ہے، جس سے بچ نکلنے کی کوئی ممکن صورت نہیں ہے؟ اس نے اس عالم کے نظام کو بنایا ہی اس طریقے سے ہے کہ ایک کی زندگی دوسروں کو موت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

انسان کی پیدائش کا مقصد:

آیئے اور پڑھیے! آسمانی کتابوں کے آخری قالب القرآن الحکیم میں نبوت و رسالات کی جو طویل تاریخ کے ناصیہ کا سب سے زیادہ نمایاں، سب سے زیادہ درخشاں ''نوشتہ'':

یَاقَوْمِ اعْبُدُو اللّٰہَ مَالَکُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ۔ (سورۂ اعراف: ۶۵)

''لوگو! پوجے جاؤ اللہ کو، تمہارا کوئی الٰہ (معبود) اس کے سوانہیں ہے۔''

از آدم تا خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبروں کے پیش کیے ہوئے لاہوتی فرامین کی پیشانیوں کا یہی اختصاصی طغرا اور دوامی لازمی چھاپ ہے۔ جس میں انسان کس لیے ہے؟ اسی سوال کے جواب میں جو واقعہ تھا اس سے پردہ ہٹا دیا گیا ہے۔ حاصل جس کا یہی ہے کہ خالق کائنات نے انسان کو صرف اپنے لیے پیدا کیا ہے، کھول دیا گیا ہے کہ یہی حقیقت آفرینش کائنات کے سلسلے میں انسانیت کا یہی تخلیقی مؤقف اور قدرتی مقام ہے اور یہی وہ فراموش شدہ مقدمہ یا گم گشتہ کڑی ہے جس سے ہٹ کر بے چاری عقل حیران اور سراسیمگی کی وادیوں میں بھٹک رہی تھی۔ آدمی کے وجدانی وجبلی رجحانوں اور اس کی عقلی اقتضاؤں میں کش مکش برپا تھی۔ اس درمیانی کڑی سے جوڑ دینے کے بعد تزاحم و تخالف کے یہ سارے قصے اچانک ختم ہو جاتے ہیں۔ اب عقل بھی وہی سوچتی ہے اور اس کے سوا سوچ ہی کیا سکتی ہے؟ جس کے ساتھ ہمارا وجدان اور ہماری جبلت راضی و مطمئن ہے۔ اصولی غلطی یہی تھی کہ پیدا کرنے والے نے جسے مخلوقات کے لیے پیدا ہی نہیں کیا ہے اسی انسانیت کو بغل میں دبائے۔ مخلوقات ہی کے دروازوں پر پکارنے والے پکار رہے تھے کہ ہے کوئی اس غریب آدمی کا بھی خریدار؟ ظاہر ہے کہ قیود استقرا کی یہ قطعاً غیر منطقی کوشش تھی۔ آنکھیں جو دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں ان سے سننے کا کام کیسے لیا جا سکتا ہے؟ کانوں پر رکھ کر گلاب کے پھول کو کوئی لاکھ سونگھنے کی کوشش کرے؟ لیکن اس میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟ پیدا کرنے والے اور بنانے والے نے سونگھنے کے لیے جب ناک ہی کو بنایا ہے تو

قدرت کے اس قانون سے جنگ کر کے کان کو سونگھنے کے کام کا کون بنا سکتا ہے؟

بہر حال انسان خدا کے لیے ہے اور خالق کائنات نے خوداپنے لیے اس کو پیدا کیا ہے؟ اس کا مطلب کیا ہے اور اس کی تشریح میں جن بوالعجبیوں کا انسانی ذہن شکار ہوا، تعبیروں کی کثرت نے جن پریشان خوابوں کا طلسم اس سیدھی سادی حقیقت کو بنا دیا اس پر تو کافی بسط وتفصیل کے ساتھ ان شاءاللہ آئندہ بحث کی جائے گی۔

انسان کا حقیقی مقام:

سردست میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے اس تخلیقی مؤقف اور طبعی مقام پر پہنچ جانے کے بعد آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہی انسانیت جو ساری خلقت، حتی کہ بول و براز جیسی عفونتوں اور غلاظتوں تک کے مقابلے میں بھی بے قیمت ٹھہری چلی جاتی تھی، کم از کم ان گندگیوں سے بھی کھاد کا کام لیا جاتا ہے، زرعی پیداواروں کی نشو ونما میں ان سے کافی مدد ملتی ہے، لیکن آدمی تو اس کام کا بھی نظر نہیں آتا تھا، مگر آپ دیکھ رہے ہیں جس کا سب کچھ ہے کائنات کے اسی خالق کے لیے ہو جانے کے بعد وہ سب کچھ آدمی کے تسخیری اقتدارات کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور جن سے وہ کام لے رہا ہے، قرآن میں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ.

(سورۂ جاثیہ: ۱۳)

''اور اس نے (اللہ نے) تمہارے لیے آسمان اور زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کیا ہے اپنی طرف سے۔''

گویا نسل انسانی کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ جب تم میرے لیے ہو تو وہ سب کچھ جو میرا ہے وہ تمہارے لیے ہے۔ وقفے وقفے سے واقعے کو اول سے آخر تک قرآن دہراتا چلا گیا ہے۔ کائنات کا شاید ہی کوئی اساسی وجود یا جوہری حقیقت رہ گئی ہو جس سے استفادے کا حق بنی آدم کو اس کتاب میں نہیں دیا گیا ہے۔ اسی کے مطابق بے محابا، بے دھڑک لوگ اپنے اس حق کو استعمال کر رہے ہیں اور اپنے اس قدرتی حق

سے مستفید ہو رہے ہیں۔ الغرض یہ سارے تسخیری مظاہرے اور بنی آدم کے اقتداری تصرفات کے تماشے جو ہمارے سامنے ہیں، بتایئے کہ اس کے سوا آخر ہوتا کیا؟

انسان کا مقام عظمت:

جو سب کا خالق، سب کا مالک سب کا رازق، سب سے بڑا ہے، انسان جب اسی سب سے بڑے کے لیے ہے تو مخلوقات میں بڑائی کا دعویٰ اس کے مقابلے میں اب کون کر سکتا ہے؟ آپ دیکھ رہے ہیں اپنے طبعی موقف سے ہٹ جانے کے بعد وہی آدمی جو سب سے چھوٹا بن کر رہ گیا تھا، فکری تصحیح کی ایک جست نے اسی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ ساری کائنات کو چیرتا پھاڑتا وہاں پہنچ گیا جہاں خالق کے سوا کوئی مخلوق نہیں ہے۔ انسان خدا کے لیے ہے؟ اس کا مطلب جو کچھ بھی ہو اور وہ مطلب بیان ہی کیا جائے گا، لیکن سوال یہی ہے کہ خدا کے لیے ہو جانے کے بعد انسانی وجود کی قدر و قیمت کا بھلا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ اس کے بعد انسانیت خواہ کسی قالب میں ہو، طفولیت کے عہد میں ہو یا شباب کے زمانے میں، کہولت کی منزل میں ہو یا پیرانہ سالی کے دور میں ہو، انفرادی شکل میں ہو یا اجتماعی رنگ میں، مردانہ سانچے میں یہی انسانیت جلوہ گر ہوئی ہو یا صنف نازک کے حسین و جمیل پیکر میں ڈھل کر سامنے آئی ہو۔ یقیناً اس کے بعد وہ مستحق ہو جاتی ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔ اس کی قدر و قیمت پہچانی جائے۔ اس کے قدرتی صلاحیتیں ابھاری جائیں۔ ان کے سنوارنے کی ممکنہ کوشش میں سعی و سرگرمی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ اس کی حفاظت و نگرانی کے لیے حکومت کا نظام قایم کیا جائے۔ عدل و انصاف کے قوانین بنائے جائیں۔ عدل و انصاف کے محکموں کا جال بچھایا جائے۔ پولیس رکھی جائے۔ فوجی دستے بنائے جائیں۔ اس کے بال بال کی نگرانی کی جائے۔ شفاخانے کھولے جائیں۔ سینی ٹوریم قایم کیے جائیں۔ اس کے لیے مواصلات کے ذرائع میں سہولتیں پیدا کی جائیں۔ مدارس و مکاتب، کلیات و جوامع سے ان کی آبادیوں کو بھر دیا جائے۔ الغرض جو کچھ کیا جا رہا ہے اور ان راہوں میں جو کچھ کیا جا سکتا ہے آدمی قدرتاً ان سارے تکریمی حقوق کا

پیدائشی حق دار بن جاتا ہے، لیکن یہ سب جو کچھ بھی ہے اس وقت تک ہے جب تک کہ سمجھا جائے کہ سب سے بڑے کے لیے آدمی پیدا کیا گیا، اسی وقت تک وہ سب سے بڑا بھی ہے۔ سب چھوٹے اس کے لیے ان ہی حالات میں تو بن سکتے ہیں کہ سب سے بڑے کے لیے اس کو سمجھا جائے۔ اس کی ساری قدر و قیمت، عظمت وشرافت، احترام وکرامت اس کے وجود کے صرف اسی نصب العین میں پوشیدہ ہے کہ جو سب سے بڑا ہے مانا جائے کہ اسی کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، لیکن خالق کائنات کے قدموں سے ہٹنے کے بعد آپ دیکھ چکے کہ مخلوقات کے دایرے میں پہنچ کر انسانیت کی کوئی قدر و قیمت باقی رہتی ہے؟

باب دوم:

رہبانیت اور روحانیت

لیکن کیا کیجیے! آدمی کس لیے ہے؟ اس کا یہ جواب کہ خالق کائنات نے خود اپنے لیے اس کو پیدا کیا ہے، اپنے اپنے ذاتی رجحانات اور میلانات کے زیر اثر اسی کی تشریح و توضیح میں عجیب و غریب شگوفے کھلتے رہے۔ ایک طرف تو سمجھنے والوں نے یہ سمجھ لیا کہ خالق کے لیے جو پیدا ہوا ہے اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ مخلوقات سے جہاں تک دوری اختیار کر سکتا ہو دور ہوتا چلا جائے۔ رہبانیت اور جوگیت اسی رجحان کی تعبیر ہے جس کی ابتدائی منزل میں سمجھایا جاتا ہے کہ غذا جیسی ناگزیر ضرورت سے تعلق کو کم زور کرنے کے لیے چاہیے کہ بغیر کسی رغبت اور لذت گیری کے اس کو اس طرح کھایا جائے کہ کھانے والا مسلسل کھاتے ہوئے یہ بھی سوچتا چلا جائے کہ اس کی مثال اس شخص کی ہے جو جنگل سے گزر رہا ہو اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے بچے کا گوشت کھا رہا ہو۔ (ترجمہ کتاب ''ہندی فلسفہ'' از ڈاکٹر گپتا: جلد ۱، صفحہ ۱۵۲، دار الترجمہ سرکار عالی)

یہ ہندوستانی رہبانیت کے دایرے کا مشہور اور عام فقرہ ہے۔ بعض خاص مصلحتوں کی بنیاد پر اسی طریقۂ زندگی کو رہبانیت و جوگیت کے ساتھ ساتھ روحانیت کے نام سے بھی موسوم کرتا ہوں۔ موجودہ مغربی اصطلاح میں چاہیے تو اسے اسپر یچولزم بھی کہہ لیجیے۔ اس مسلک کی بنیادی یا روح یہی ہے کہ جو بڑائیاں آدمی کو اپنے اسی غرض و غائیت کی وجہ سے حاصل ہوئی ہیں کہ وہ خالق کائنات کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی ان ہی بڑائیوں نے اور انسانی مخلوقات سے استفادے کے حق کو اس کا پیدایشی اور قدرتی حق بتا دیا ہے، اس مسلک میں گویا سمجھنا چاہیے آدمی کے اسی پیدایشی حق سے دست برداری کا عملاً اعلان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اپنے وجود کے اسی بلند ترین نصب العین یعنی آدمی کا خدا کے لیے ہونا، اسی کی بہ دولت انسانیت کے متعلق

یہ عام احساس جو پایا جاتا ہے کہ تمام پیداوار کے مقابلے میں وہی زمین کی سب سے زیادہ قیمتی اور انمول پیداوار ہے، اسی بنیاد پر انسانی صلاحیتوں کی حفاظت و بقا اور پوشیدہ امکانات کے بہبود وارتقا کی کوششوں کی جو غیر معمولی اہمیت عام طور پر حاصل ہے، اس کی اہمیت کی چنداں پروا رہبانیت یا روحانیت کے دایروں میں نہیں کی جاتی۔ کیوں کہ کچھ بھی ہو انسان بھی بہر حال خالق نہیں بلکہ مخلوق ہی ہے، بال بچوں کے جھگڑوں یا سوسایٹی اور اجتماع کے جھگڑوں سے ممکنہ حد تک آزاد رہنے کا میلان اس طبقے میں اسی نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے کہ خدا یا خالق کاینات کے لیے ہونے کا مطلب ان کے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اپنی اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ خالق ہی کی تلاش وجستجو اور دھیان گیان میں بسر کر دیا جائے۔

عملی مادّیت یا پریکٹیکل مٹیریل ازم:

رہبانیت و روحانیت کے مذکورہ بالا طریقۂ فکر اور طرز زندگی کے بالکل برعکس ہر زمانے میں دوسرا گروہ بھی پایا گیا ہے۔ بالکل عموماً عددی اکثریت اسی گروہ کی پہلے بھی رہی ہے اور آج کل بھی ہے۔ جس کی سمجھ میں یہی نہیں آتا کہ خدا جو ہر قوم کی حاجتوں اور ضرورتوں سے پاک ذات کی تعبیر ہے آدمی بھلا اس کے کام کا کیا ہوسکتا ہے؟ اسی لیے آدمی خدا کے لیے ہی ہے، سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب اگر کچھ ہوسکتا ہے تو یہی ہوسکتا ہے کہ آدمی خدا کے مخلوقات کے کام آئے اور جو چیزیں آدمی کے لیے پیدا کی گئی ہیں ان سے مستفید ہو۔ ان کے افادے کے ممکنہ پہلوؤں کو اجاگر کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کے عملی خانوں میں خدا یا خالق کاینات کے لیے نہ کسی قسم کی کوئی گنجایش ہوتی ہے اور نہ اس گنجایش کو وہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے کاروبار کی ساری سرگرمیاں مخلوقات ہی کو محور بنا کر ان ہی کے ارد گرد گردش کرتی ہیں۔ وہ یہی کرتے بھی ہیں اور اس کے سوا کچھ کرنا بھی نہیں چاہتے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض گنے چنے افراد ان میں ایسے بھی ہوں جو خدا کے یقین ہی سے اپنے قلوب کو محروم پاتے ہوں۔ اسی لیے روحانیت کے مقابلے میں چاہا جائے تو زندگی کے اس خاص رویے کا نام

مادّیت یا میٹریل ازم رکھ دیا جا سکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کافی معقول بڑی تعداد اس طبقے میں ان ہی لوگوں کی ہمیشہ رہی ہے اور آج بھی ہے جو بجائے مادے کے خدا ہی کو کائنات کا خالق و آفریدگار تسلیم کرتے ہیں، لیکن بہ ایں ہمہ اس خدا کی ذات سے ربط پیدا کرنے کا میلان ان میں نہیں پایا جاتا۔ وہ خدا کا انکار نہیں کرتے، لیکن ان کی عملی زندگی بتاتی ہے کہ خالق کی ذات وصفات سے نہ ان کو کوئی دل چسپی ہے اور نہ ان سے تعلق قایم کرنے کی کوئی خواہش یا آرزو اپنے اندر وہ رکھتے ہیں، بلکہ جہاں تک مشاہدے کا تعلق ہے ان کی اکثریت دنیا کے کسی نہ کسی مذہب و دین کی طرف بھی اپنے آپ کو عموماً منسوب کرتی رہی ہے اور آج بھی کسی نہ کسی مذہبی ٹولی میں اپنے آپ کو شمار کرنے والے ہی ان میں اکثر دیکھے جاتے ہیں۔ مگر ان کے مشاغل کی فہرست آپ کو بتائے گی کہ خالق کے لیے اس میں کوئی مد نہیں رکھی گئی ہے۔ اسی لیے ایسے سارے اعمال وافعال جو مذاہب و دیانات میں خالق ہی کے تعلق سے انجام دیے جاتے ہیں، وہ چنداں اہم اور مستحق توجہ نہیں سمجھے جاتے [1]۔

اسی لیے بجائے خالص مادّیت (میٹریل ازم) کے زندگی کے اس طریقے کی تعبیر عملی مادّیت (پریکٹیکل میٹریل ازم) سے کرنا غالباً زیادہ موزوں ہوگا۔ کیوں کہ مادّیت جو فلسفے کے ایک خاص مکتب خیال کی تعبیر ہے، اس میں بجائے خدا کے مادے ہی کو عالم کا مصدر و سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے کہ عملی مادّیت کی اسی ذہنیت کے زیر اثر زندگی گزارنے والے آپ کو عیسائیوں، یہودیوں وغیرہ کے سوا خود مسلمانوں میں بھی ملیں گے۔ بلکہ اکثریت پر یہی رنگ روز بہ روز ہوتا چلا جا رہا ہے

---

[1] آج کل مسلمانوں میں ایک ایسی ٹولی اٹھ کھڑی ہوئی ہے جو اپنے کاغذی اور زبانی اعلانات میں دعویٰ کرتی ہے کہ عصر حاضر میں دین اسلامی کی تنہا علم بردار وہی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بغیر کسی خوف اور جھجک کے اسی ٹولی کے لوگ یہ بھی کہتے پھرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ نماز، روزہ وغیرہ جیسی دینی عناصر دین کے جوہری عناصر میں ہیں اور کاروبار کے ان ہی شعبوں کو دین کا سب کچھ قرار دیتے ہیں جن میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے اس کا تعلق مخلوقات ہی سے ہوتا ہے۔ اپنے اسی میلان کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت باور کرتے ہیں۔

عبادت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

سے خود شعر کہنے والے شاعر کی مراد واقع میں جو کچھ بھی ہو لیکن اسی قسم کی شاعرانہ تعبیروں سے ان فطری جذبات وعواطف کے تقاضوں کی تسکین بخشی میں عموماً سہارا لیا جاتا ہے، جو براہ راست خالق ہی سے ربط پیدا کرنے کے لیے انسانی سرشت میں محفوظ کیے گئے ہیں۔

بلکہ کہتے ہوئے اسی لیے جو ڈرتا ہے کہ شاید پہلی دفعہ کہا جارہا ہے، پڑھنے والوں کو ممکن ہے تعجب ہو مگر کیا کیجیے کہ اپنی سمجھ میں یہی آیا ہے۔

بت پرستی یا اصنامیت:

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بت پرستی یا مشرکانہ ذہنیت جس کا دور تاریخ کے مختلف قرون وادوار میں مختلف ممالک اقوام میں رہا ہے اور اب بھی بنی آدم کی اچھی خاصی آبادیوں میں اس کا رواج مردہ نہیں ہوا ہے۔

میرا خیال یہی ہے کہ یہ بھی عملی مادیت ہی کا ایک قدیم بھدا پارینہ وفرسودہ قالب ہے۔ سمجھ میں یہی آتا ہے کہ خالق سے بے گانگی اور مخلوقات میں استغراق جو اس ذہنیت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، جب اسی ذہنیت کی شکار قومیں ہوئیں جیسا کہ اس وقت تک ہوتی رہتی ہیں تو گویا خالق کے وجود کا انکار نہیں کیا جاتا، لیکن تعلق صرف مخلوقات ہی کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں من جملہ دوسرے کاروبار کے مخلوقات سے استفادے کی راہ میں آج کل تو صرف یہی کیا جاتا ہے کہ عقلی قوت کی مدد سے استفادے کا دایرہ جس حد تک وسیع ہو سکتا ہو لوگ اپنی کوششوں کو اس دایرے تک محدود رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل انسانی ارتقائی مدارج کے لحاظ سے ابتدائی منزلوں ہی میں جب تک رہی اس وقت تک بھی ایسی مخلوقات جن سے لوگ فایدہ اٹھاتے تھے یا منافع کی توقع رکھتے تھے یا ضرر رسانی کے پہلوؤں کو جن چیزوں کے متعلق کم کرنا چاہتے تھے خصوصاً نفع وضرر کے اس باب

میں جن مخلوقات کو گونہ اہمیت حاصل تھی، ان کی افادیت یا ضرر رسانی کا پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ ان ہی چیزوں کو قابو میں لانے کے لیے جہاں عقل و دانش سے کام لیا جاتا تھا وہیں عام طریقہ یہ بھی مروج تھا کہ خالق سے رشتہ قایم کرنے کے لیے جو جذبات وعواطف فطرت انسانی میں دویعت کیے گئے ہیں یعنی دعا، عبادت وغیرہ کے فطری رجحانات کا جو حال ہے ان ہی جذبات کا رخ بجائے خالق کے اسی عملی مادّیت کی ذہنیت والے مخلوقات کی طرف پھیر دیا کرتے تھے۔ مثلاً کسی ملک کے مختلف حصے یا قطعات پانی کے کسی سیلابی راہ کے بن جانے کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہوجاتے تھے یعنی کوئی دریا یا ندی نالہ درمیان میں حایل ہوکر لوگوں کی آمد و رفت کی سہولتوں کو دشواریوں سے اگر بدل دیتا تھا تو آج کل کے دستور کے مطابق ان دریاؤں نالوں سے گزرنے کے لیے میکانیکی ذرایع اختیار کیے جاتے ہیں اور انجینئری کی مہارتوں سے کام لیا جاتا ہے، لیکن عقل انسانی جب تک ترقی کرکے اس درجے تک نہیں پہنچتی تھی جہاں آج پہنچ چکی ہے تو ابتدا میں کچھ شناوری اور پیراکی کے ذریعے سے عبور و مرور کی دشواری کو لوگ حل کرتے تھے، یا اس سے بھی آگے بڑھ کر کشتیوں اور ہوا کے بہاؤ پر چلنے والے بادبانی جہازوں سے بھی کام لینے لگے۔ مشکلات پر قابو پانے کی یہ عقلی تدبیریں تھیں، لیکن ظاہر ہے کہ بسا اوقات کشتیاں ڈوب جاتی تھیں، جہاز پانی کی موجوں سے ٹکرا ٹکرا کر برباد ہوجاتے تھے۔ اسی قسم کے مواقع جہاں دیکھا جاتا تھا کہ عقلی سہارے ختم ہوچکے ہیں، اپنی فطرت کے دعائی اور عبادتی رجحانات کا رخ پانی کے اسی مجموعے کی طرف پھیر دیا کرتے تھے جو نام بھی اس مجموعے کا رکھ دیا جاتا تھا، اسی نام کے ساتھ جیکارے لگاتے گئے۔ تمہارے ملک میں آج تک یہ رواج موجود ہے کہ گنگا یا جمنا کے کنارے پہنچ کر گنگا ماتا کی جے، جمنا جی کی دہائی وغیرہ الفاظ کے ساتھ لوگ چلانے لگتے ہیں اور پانی جیسی غیر قرار پذیر حقیقت جب پوجی گئی جو ہر سال ندیوں اور دریاؤں کی راہ سے گزر کر سمندر میں گم ہوجاتی رہتی ہے اور نیا سال پانی کے نئے ذخیروں کو لاتا رہتا ہے تو سورج، چاند، تارے جو نا معلوم

زمانے سے ایک ہی حال میں نظر آتے ہیں، ان کے معبود بن جانے پر کیوں تعجب کیا جائے؟ الغرض عناصر، جمادات، نباتات، حیوانات، جن میں نفع وضرر کا پہلو نمایاں تھا بہ تدریج معبودوں کی فہرست میں ان کا اضافہ ہوتا رہا، حتی کہ ایسے انسانی افراد جن سے کسی قسم کا نفع لوگوں کو پہنچا تھا جب اپنی مدت حیات ختم کر کے اس دنیا سے چلے گئے تو ان سے استفادے کی راہ پوجا پاٹ کی اسی راہ سے کھلی رکھی گئی اور ان کی مورتیاں بنا بنا کر لوگ پوجتے رہے۔

بہر حال عقلی ذرائع کے ساتھ دعائی اور عبادتی رجحانات کا بھی نفع بخش اور ضرر رساں مخلوقات کے ساتھ تعلق قایم کر کے ان سے استفادے یا ان کے ضرر رساں پہلوؤں سے استحفاظ اور بچاؤ کا سامان کرنا، میرے نزدیک بت پرستی کی یہی صحیح توجیہ واقعات کے مطابق ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ہے تو یہ عقل انسانی کے عہد طفولیت اور نابالغی ہی کی یادگار، لیکن اسی کے ساتھ یورپ کے عام مفکرین و مصنفین کی مشہور و معروف توجیہ..... جہاں تک میرا خیال ہے ایک قسم کے فریب ستم ظریفی کے سوا شاید وہ اور کچھ نہیں ہے۔ انسانی عقل و دانش کے ساتھ ایک تمسخر ہے، لیکن ذکر اس کا ہر علم و فن کی چھوٹی بڑی کتابوں میں کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ گویا واقعے کی اصل حقیقت بھی وہی ہے، یعنی یہ جو کہا جاتا ہے کہ شروع میں اپنی کم عقلی کی وجہ سے لوگ آفتاب و ماہ تاب، برق و رعد الغرض ہر ایسی چیز جس سے آدمی مرعوب یا غیر معمولی طور پر اثر پذیر ہو جاتا تھا وہ خدا مان لی جاتی تھی، لیکن ترقی کی منزلوں کو جوں جوں عقل طے کرتی چلی جاتی تھی خداؤں کی تعداد بھی گھٹتی چلی گئی۔ تا آں کہ آخر میں ایک خدا کو مان لیا گیا۔ جس سے گویا یہ سمجھانا مقصود ہے کہ توحید کا عقیدہ شرک ہی کے عقیدے کا جانشین ہے۔ آدمی پہلے مشرک تھا اور عقلی ارتقا کے بعد لوگ موحد ہوئے اور گو اپنی اس توحید کا بیان کرنے والے عموماً اسی نقطے تک پہنچا کر خاموش ہو جاتے ہیں، لیکن درحقیقت ایک خاص قسم کا الحادی اشارہ اس توجیہ میں بھی پوشیدہ ہے۔ انسانی ذہن کو اس توجیہ کی راہ سے ایک ایسی لغزش گاہ تک پہنچا دیا جاتا ہے جس پر پہنچنے والا بہ آسانی انکار خدا کے

نتیجے کی طرف پھسلا کر پہنچایا جا سکتا ہے، یہ خود ہی بہ یک عنود اسی الحادی چٹان پر منہ کے بل گر سکتا ہے۔ یعنی بہ آسانی کہہ دیا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانے میں آدمی کی عقل، جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے پچھلے دنوں کے لحاظ سے چوں کہ بہت زیادہ ترقی یافتہ ہو چکی ہے، اس لیے ''ایک خدا'' کی ضرورت بھی آخر کیوں باقی رکھی جائے؟ بت پرستی کی اس خود تراشیدہ مغربی توجیہ کا یہ ایک قدرتی لیکن ایک ایسا نتیجہ ہے جس کی طرف اس راہ پر چلنے والے یا چلائے جانے والے چاہیے تو یہی کہ پھسل کر خود پہنچ جائیں۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ یورپ کے عام پیشہ ور ارباب فکر ونظر ہی نہیں بلکہ مستند پادریوں، بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی کتابوں میں بھی کسی پس وپیش کے بغیر بت پرستی کی توجیہ کا تذکرہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس طور پر کیا جاتا ہے کہ گویا جس دین یا مذہب کے وہ ماننے والے ہیں اس پر کسی قسم کی کوئی زد اس توجیہ سے نہیں پڑتی۔ بلکہ افسوس کے ساتھ اس کے اظہار پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ یورپ والوں کی طرح اس ذہنی پھندے کا شکار کچھ دنوں سے یہ دیکھا جا رہا ہے کے ہمارے ہاں کے مولویوں کا ایک طبقہ بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر ہو چکا ہے، اپنی تحریروں اور تقریروں میں شرک وبت پرستی کی اسی توجیہ کا چرچہ وہ بھی کرنے لگے ہیں، حالاں کہ اور کچھ نہیں تو ان کو یہی سوچنا تھا کہ پہلے انسان تورات، انجیل اور قرآن کے بیان کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

❁ ❁ ❁

باب سوم:

عقیدۂ توحید

انسان کا پہلا عقیدہ

العیاذ باللہ! اگر اسی کو واقعہ مان لیا جائے کہ توحید کا عقیدہ بنی آدم میں عقیدۂ شرک کے بعد پیدا ہوا تو اس کا مطلب آپ خود سوچیے اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کے بعد ابنائے آدم شرک میں مبتلا رہے۔ توحید کا عقیدہ پچھلی نسلوں میں عقیدۂ شرک کے بعد پیدا ہوا، ان کو سوچنا چاہیے کہ یہ مان لینے کے بعد کیا ان کی آسمانی کتابیں جنھیں وہ خدا تعالیٰ کی کتابیں یقین کرتے ہیں خدا کی کتابیں باقی رہتی ہیں؟ خود ہندوستان کا حال بعد کو جو کچھ بھی ہوا، لیکن مہا بھارت جیسی آسمانی کتاب تک میں اطلاع آج تک پائی جاتی ہے، یعنی بیان کرتے ہوئے ''کرت جگ جس کو ست جگ کہتے ہیں ❶۔''

پھر ست جگ جو انسانی تاریخ کے سب سے پہلے دور کی ہندی تعبیر ہے اسی عہد کی دوسری خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ اس جگ میں دھرم (ایمان) کا ناش نہیں ہوتا تھا، یعنی اس میں خلل نہیں پیدا ہوتا تھا۔ دھرم کے ناش نہ ہونے کا مطلب آگے یہ بیان کیا گیا ہے کہ دیوتا، دانو، گندھرپ، کنھر جکش منش ❷ ایک پرشوتم بھگوان ❸ کی پوجا کرتے تھے (بن پرب اکثر واں ادھیائے)۔

شرک اور بت پرستی میں زمین کا جو حصہ سب سے زیادہ بدنام ہے بلکہ آج تو

---

❶ مختلف قسم کے غیبی مخلوقات جن میں بعض ادنا اور بعض اعلا سمجھے جاتے تھے ان ہی کو ہندوستان قدیم میں مذکورہ بالا ناموں سے موسوم کیا کرتے تھے۔

❷ جکش ومنش کے معنی وہی ہیں جو ہمارے ہاں جن وانس کے الفاظ سے مراد لیتے ہیں۔

❸ پرشوتم لامثلہ ولامثل لہ کی تعبیر ہے، یعنی جس کی نظیر اور جس کا کوئی مدمقابل نہ ہو۔

شاید ساری دنیا میں سمجھا جاتا ہے، خود ہندوستان کا حال بعد کو جو کچھ بھی ہوا لیکن مہابھارت جیسی کتاب میں یہ اطلاع آج تک پائی جاتی ہے کہ بت پرستی اور مشرکانہ کاروبار کا سب سے بڑا علم بردار صرف ہمارا یہ ملک ہی باقی رہ گیا ہے۔ اب دیکھ رہے ہیں کہ اس کی بھی ایسی کتابوں میں جو دینی کتابوں ہی کے ذیل میں شمار ہوتی ہیں، یہی معلوم ہوتا ہے آدمی پہلے موحد اور تنہا خالق کائنات کا پرستار تھا۔ دھرم میں ناش ہونے کی کیفیت یعنی مشرکانہ جراثیم بعد کو شریک ہوئے تو پھر یورپ والوں کا یہ پھیلاتے پھرنا کہ آدمی پہلے مشرک تھا اور بہ تدریج عقلی ترقیوں کے بل بوتے پر وہ توحید کے موجودہ عقیدے تک پہنچا ہے، کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے؟

ایک غلط توجیہ:

اور یہ تو خیر نقلی شہادتیں ہیں، لیکن ان کے سوا انسانیت کی تاریخ کا حصہ اس وقت تک محفوظ رہ گیا ہے، اسی کا مطالعہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ خالق عالم کے ساتھ دوسری چیزوں کو پوجنے والے وقتاً فوقتاً جو پوجتے رہے ہیں اور اپنے معبودوں میں ان کو شریک کرتے رہے ہیں کیا کسی زمانے میں ان کو خدا یعنی یہ مانا گیا ہے کہ عالم کی آفرینش و تخلیق کا کام انھوں نے انجام دیا ہے؟ اس سلسلے میں پرانی تاریخ ملک مصر کی ہے، اس میں شک نہیں کہ اپنے عروج و اقبال کے زمانے میں مصر والوں کے یہاں بے شمار معبودوں کے پوجنے کا رواج تھا۔ کچھ دن ہوئے رسالہ برہان (دہلی) میں فقیر ہی کا ایک مقالہ شائع ہو چکا ہے، جس میں بتایا گیا تھا کہ سانڈ، کتے، بلی وغیرہ جیسی چیزیں بھی مصر میں پوجی جاتی تھیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ان سارے معبودوں کو مصر والے خدا کے مخلوقات ہی میں شمار کرتے تھے۔ ان میں کسی کے متعلق یہ خیال نہیں پایا جاتا تھا کہ دنیا کو وہ پیدا کرنے والے اور اس کے خالق ہیں۔ اسی مقالے میں میں نے لکھا تھا کہ مصر والوں کے چند ممتاز معبودوں میں وہ کیڑے بھی شریک تھے جنھیں عربی زبان میں جعلان اور ہم لوگ گبریلے کہتے ہیں۔ ان مصریوں کے متعلق یہ کیسے مان لیا جائے کہ اسی گبریلے کیڑے کو عالم کا خالق کسی

زمانے میں وہ مانتے تھے۔ یہ تو یورپ کے مادہ پرستوں ہی کا دل وجگر ہے کہ کاینات کے اس جیتے جاگتے نظام کے متعلق یہ ماننے پہ تیار ہو گئے ہیں کہ بے جان مردہ مادہ سے ابل پڑا ہے، جس میں زندگی نہ تھی اسی سے زندگی، جس میں علم وادراک نہ تھا اسی سے علم وادراک، الغرض ہر قسم کے کمالات سے جو مادہ خالی تھا اچانک اسی سے کمالات کا یہ سمندر ابل پڑا، جس کا نام عالم ہے۔

بہر حال پوجنے والے اس میں شک نہیں کہ مختلف زمانے میں مختلف چیزوں کو پوجتے رہے ہیں اور آج تک ان پوجنے والوں کی کافی تعداد آدم کی اولاد میں باقی ہے۔ ان میں جو گزر چکے ان کو جانے بھی دیجیے، لیکن جو باقی رہ گئے ہیں ان ہی سے پوچھیے اور سنیے، جواب میں بالاتفاق وہ یہی کہیں گے کہ چاند ہو یا سورج، آگ ہو یا پانی، سانپ ہو یا گائے، بیل، یہ سب کچھ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں۔ یہی خیال ان کے بزرگوں کا بھی تھا اور اب بھی وہ یہی مانتے ہیں۔ باوجود اس کے وہی نفع وضرر کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے بزرگوں نے بھی ان خدائی مخلوقات کے ساتھ دعا وعبادت کا رشتہ قایم کرلیا تھا اور اپنے باپ دادوں کی اسی روش پر اب وہ بھی گامزن ہیں۔

قدیم بت پرست اور ان کے وارثان جدید:

الغرض بت پرستی کی یہ مضحکہ خیز مغربی توجیہ کہ بہت سے خداوں کو بہ تدریج گھٹاتے ہوئے ایک خدا کے عقیدے تک عقل انسانی پہنچی ہے، عقلاً نقلاً تاریخاً بجز ایک ایسی ادعائی توجیہ کے اور کچھ نہیں ہے جس کا حقایق وواقعات سے قطعاً کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بالکل ممکن ہے کہ دنیا کی موجودہ موحد قوموں یعنی خالق عالم کے سوا کسی مخلوق کی عبادت کو جو دین نہیں بلکہ بے دینی ہی کا سب سے زیادہ خطرناک اور مہیب قالب یقین کرتے ہیں، ان کے قلوب میں بت پرستی کی اس مغربی توجیہ سے اس اغوائی وسوسے کا بھی ڈالنا توجیہ کرنے والوں کا مقصود ہو کہ پرانی مشرک اور بت پرست قوموں ہی کی یادگار اور جانشین دنیا کی موجودہ موحد قومیں ہیں۔ دونوں میں فرق اس

کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آہستہ آہستہ کثرت سے ہٹتے ہوئے وحدت کے نقطے تک عقل وخرد نے ان کو پہنچادیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ذہن انسانی اس توجیہ کے زیر اثر جیسا کہ عرض کرچکا ہوں طبعاً اس لغزش گاہ تک پہنچ جاتا ہے، جس پر پہنچنے کے بعد الحاد یعنی ایک خدا کے انکار کی گھائیوں میں پھسل کر گر پڑنے کا خطرہ سامنے آجاتا ہے۔ گویا الحادی ذہنیت کی زمین کی تیاری کا کام جہاں اس منحوس توجیہ سے لیا جا سکتا ہے وہیں خالق پرستوں کے دل میں اس خیال کو پیدا کرکے کہ پرانی مخلوق پرست مشرک قوموں ہی کی وہ یادگار اور جانشین ہیں، اس سے استقامت واطمینان، سکون وثبات کے ان جذبات کو مضمحل کرنا بھی مقصود ہو جو موحد توحیدی عقیدہ کے متعلق اپنے اندر پاتا ہے تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔ دجل وفریب کے اس عہد تار میں آنے والے جن جن راہوں سے آرہے ہیں اور سبیل اللہ سے اللہ کے بندوں کو روکنے، بلکہ بھڑکانے، بدکانے کی بے پناہ کوششیں نت نئی اور گوناگوں شکلوں میں ہر طرف جاری وساری ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے میرے اس خیال کو صرف بدگمانی قرار دینے کی جرأت مشکل ہی سے کوئی کرسکتا ہے۔ حالاں کہ اس راہ میں بھی اگر حقیقت پر نظر رکھی جائے تو بہ آسانی معلوم ہوسکتا ہے کہ خالق سے بے گانہ ہوکر مخلوقات ہی مخلوقات میں آج یورپ کے باشندے جو ڈوبے ہوئے ہیں، صحیح معنوں میں پرانی مخلوقات پرست قوموں کی یادگار یا جانشین ہونے کی عزت اگر حاصل ہوسکتی ہے تو اس عزت کے جائز حق دار اور وارث وہی ہوسکتے ہیں۔ آخر خود سوچیے! بت پرست قوموں کی سب سے بڑی خصوصیت جیسا کہ آپ سن چکے یہی تو تھی کہ بجائے خالق کے مخلوقات ہی سے اپنا رشتہ انھوں نے قایم کرلیا تھا۔ ان کا دستور ہی یہ تھا کہ نفع وضرر کے پہلو جن مخلوقات میں زیادہ نمایاں تھے ان ہی سے عقلی رشتے کے سوا عبادتی اور دعائی رشتہ بھی قایم کرلیا کرتے تھے۔ وہ دریاؤں پر قابو حاصل کرنے کے لیے عقل کے زور سے کشتی اور جہاز جیسی چیزیں بھی بناتے اور چلاتے تھے اور جہاں عقلی سہارا ختم ہوجاتا تھا وہاں دیکھا جاتا تھا کہ دعا وعبادت کے جذبات جو خالق ہی سے ربط پیدا کرنے کے لیے انسانی

فطرت میں ودیعت کیے گئے ہیں ان جذبات کا رخ بھی دریاؤں اور اس کے پانی کی طرف پھیرا دیا کرتے تھے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ جو کچھ تھا ان کے عقول کی خامی ہی کا نتیجہ تھا۔ شنوائی کی قوت جو آوازوں کے سننے کے لیے آدمی میں رکھی گئی ہے اس قوت سے رنگ اور روشنی جیسی چیزوں کے جاننے کی کوشش جس کے لیے بینائی کی قوت ہمیں بخشی گئی ہے، شنوائی کی قوت کا یہ غلط استعمال بدعقلی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح دعا و عبادت، پوجا پاٹ، جپ تپ کے فطری اقتضاؤں سے بجائے خالق کے مخلوقات کو راضی کرنے کی کوشش یہ بھی عقل کی خامی اور نابالغی ہی کے زمانے کا فیصلہ تھا، لیکن بہ ایں ہمہ خالق سے بے گانگی اور مخلوقات ہی میں ہمہ تن استغراق اس باب میں ان قدیم بت پرست قوموں کا حال ان نئی قوموں جیسا ہی تھا، جن کی زندگی کی سرگرمیوں میں مخلوقات کے سوا خالق کے لیے کسی قسم کی کوئی گنجایش نہیں رکھی گئی ہے۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہی ہے کہ اپنے عقلی ضعف اور نابالغی کی وجہ سے عقلی رشتے کے سوا دعائی رشتہ بھی پرانی بت پرست قومیں ان ہی مخلوقات سے قایم کیے ہوئے تھیں، جن کے افادی پہلوؤں سے وہ نفع اٹھانا چاہتی تھیں یا ضرر سے جن کے بچنا چاہتی تھیں اور عقل کے اس عہد ارتقا میں دعائی رشتے کو ختم کر کے نئی قوموں نے صرف عقلی رشتے کو ان ہی مخلوقات کے ساتھ باقی رکھا ہے جن سے وہ مستفید ہونا چاہتی ہیں۔ یا ضرر رسانی سے جن سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے صحیح معنوں میں پرانی بت پرست اور مخلوق پرست قوموں کی یادگار اور باضابطہ وارث اور جانشین اگر ہو سکتی ہیں تو اس زمانے کے وہی قومیں ہو سکتی ہیں جو خالق سے قطعاً کنارہ کش ہو کر یک سوئی کے ساتھ مخلوقات ہی میں گڑی ہوئی ہیں۔ ان ہی کے ادھیڑ بن میں اور ان ہی کے الٹنے پلٹنے میں مصروف و مشغول ہیں۔ لیکن خالق کے سوا کسی قسم کی کوئی مخلوق ہو، نباتات و جمادات وحیوانات ہی نہیں بلکہ ملک (فرشتہ) ہو، جن ہو، یا کوئی بڑے آدمی ہی سے رشتہ قایم کرنا جن کے نزدیک بددینی کی بدترین شکل ہو بھلا ان خالق پرست امتوں کو پرانی بت پرست یا مخلوق پرست قوموں کی یادگار یا جانشین قرار دینا تمسخر کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

لیکن اس ظلم کا کوئی ٹھکانا ہے؟ عرض کر چکا ہی ہوں کسی فن کی کوئی کتاب ہو، بڑی ہو، چھوٹی ہو، کسی نہ کسی حیلے سے بت پرستی کی مذکورہ بالا توجیہی اپچ کو ہر پھر کر دہرانے والے کچھ اس طرح دہراتے رہے کہ تورات والوں کے دماغ سے تورات کا وہ سبق نکل گیا جو پہلے انسان آدم علیہ السلام کے متعلق پڑھایا گیا تھا۔ انجیل والوں کو بھی یہ یاد نہ رہا کہ بت پرستی کی اس توجیہ پر ایمان لانے کے بعد انجیل پر ان کا ایمان باقی بھی رہتا ہے یا نہیں؟ اور جب قرآن کے ماننے والوں کے سامنے بھی قرآن کی آیتوں کا مفاد اس غوغائی ہنگامے میں اوجھل ہو گیا، جن میں بتایا گیا ہے کہ انسانوں کا پدر اول کن خصوصیتوں کا حامل تھا۔ اسی لیے محراب و ممبر سے بھی اس دجالی توجیہ کی آواز بازگشت ٹکرانے لگی۔ ایسی صورت میں مہابھارت کی رزمیہ نظم کو اپنی دینی کتاب والوں سے بھلا کیا شکایت ہو سکتی ہے کہ ست جگ یعنی تاریخ انسانی کے سب سے پہلے دور اور قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت ان غریبوں کو کیوں یاد نہ رہی؟

یورپ میں جدید صدائے توحید:

اگرچہ شکر ہے کہ تقریباً چند صدیوں تک یورپ کے علمی نقار خانے بت پرستی کی اسی توجیہ..... قطعاً غلط توجیہ، سراسر بے بنیاد توجیہ سے جو گونجتے رہے، ان ہی نقار خانوں سے کبھی کبھی طوطی کی زبان سے اس قسم کے الفاظ بھی نکلنے لگے ہیں۔ کچھ دن ہوئے یورپ سے مارسٹن صاحب کی کتاب ”دی بائیبل کمز الائیو“ نامی آئی تھی، جس میں بت پرستی کی مذکورہ عام اور مشہور توجیہ کے مقابلے میں یہ دعویٰ پیش کیا گیا ہے کہ

> ”نسل انسانی کی قدیم ترین مذہب کی تاریخ توحید سے آخری درجے تک کے شرک اور بدروحوں کے اعتقاد کی طرف ایک تیز رو پرواز ہے۔“

اور تاریخی شواہد دینیات کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ توحید کا عقیدہ انسان کا ابتدائی عقیدہ ہے۔ کچھ نقار خانوں میں طوطی ہی کی آواز سنی، لیکن جب وہ اٹھنے لگی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کس دجالی مشرکانہ اوہام و وساوس میں لوگ بعد کو مبتلا ہوئے۔ فریب کا پردہ آج نہیں تو کل چاک ہو گا۔ خدا کرے جیسے بہت

سے مسایل میں یورپ والے حقایق وواقعات کی روشنی میں نتیجے تک پہنچ چکے ہیں، اس مسئلے میں بھی اسی کی توفیق بخشی جائے اور یہ تو خیر بت پرستی کی گونہ نئی توجیہ ہے، چند صدیوں سے زیادہ اس کی عمر شاید آگے نہیں بڑھ سکتی، لیکن اسی بت پرستی یا مشرکانہ کاروبار کی ایک قدیم کہنہ توجیہ ہی ہے جسے بجاے توجیہ و تاویل کے آیا لوجی (معذرت) قرار دینا غالباً زیادہ درست ہوگا۔ عام طور سے شرک وتوحید کا تذکرہ جہاں چھڑتا ہے پیش کرنے والے اس کو پیش کردینے کے عادی ہیں یعنی نادیدہ ان دیکھے خالق ہی سے رشتہ قایم کرنے میں پیش نظر دیدہ مخلوقات سے سہارا لینے کی یہ کوشش ہے۔ مطلب گویا یہ ہوتا ہے کہ بت پرستی کی روح بھی درحقیقت خالق پرستی ہی ہے، لیکن خالق چوں کہ ہمارے سامنے نہیں ہے اس لیے کسی ایسی مخلوق کو سامنے رکھ لیا جاتا ہے جس پر نظر بھی جم سکتی ہے اور دل ودماغ کو بھی ہر طرف سے سمیٹ کر ایک نقطے پر ٹھہرانے میں مدد ملتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کہنے والوں نے پہلے بھی یہی کیا ہے اور آج بھی دہرانے والے بت پرستی کی اس پرانی توجیہ کو عموماً دہراتے رہتے ہیں۔ المسعودی جو چوتھی صدی کا سیاح ومورخ ہے، ہندوستان کی بت پرستی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بھی اطلاع دی ہے کہ

> اللبيب منهم يقصد بصلاته الخالق و يقيم التماثيل من الا صنام و الصور مقام قبلة۔
>
> (مروج الذہب برحاشیہ کامل ابن اثیر: جلد ۱ ص ۱۹۱)
>
> ''ان ہندوستانی بت پرستوں میں جو صاحب مغز وعقل ہیں وہ تو اپنی پوجاپاٹ پرارتھنا میں خالق ہی کو اپنا مقصود بتاتے ہیں اور مورتیوں یا تصویروں کو بہ طور قبلہ کے اپنے سامنے رکھتے ہیں (یعنی چہرہ بتوں کی طرف رہتا ہے اور توجہ خالق کی طرف)۔''

غالباً ہندوستان میں اس کے سامنے یہی توجیہ معذرت کی شکل میں پیش ہوئی ہوگی، کیوں کہ اس ملک میں وہ خود بھی آیا ہے اور مختلف مقامات کی سیر کی ہے۔

باب چہارم:

مظاہر وصور کا فریب

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خالق عالم جو اپنے حیرت انگیز تخلیقی آثار کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہوا ہے، اس کے متعلق یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے کہ وہ ہمارے سامنے نہیں ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ آثار سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو دنیا کی شاید ہی کسی چیز کے متعلق یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہے، حتی کہ باہم انسانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم جو ملتے جلتے ہیں، کہتے ہیں کہ آج میری ملاقات اپنے فلاں دوست سے ہوئی، اگر سوچا جائے تو دوست کی ذات جس سے ملاقات کی مسرت آپ کو حاصل ہوئی وہ کبھی آپ کے سامنے نہیں آتی، بلکہ اس کا جسمانی قالب اور بدن آپ کے سامنے ہوتا ہے۔ اور قالب و بدن بھی صحیح معنوں میں آپ کی دید کے دایرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کون نہیں جانتا کہ بینائی کی قوت صرف روشنی اور رنگوں ہی کی حد تک ایک ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہوا اسی لیے تو نظر نہیں آتی کہ کسی رنگ سے رنگین نہیں ہے۔ پس آپ کا دوست، دوست کا بدن اور جسمانی ڈھانچا بھی آپ کے سامنے نہیں آتا، بلکہ جو رنگ آپ کے دوست کے چہرے پر چڑھا ہوا ہے، واقع میں آپ صرف اس کو دیکھتے ہیں۔ بہ ایں ہمہ آپ یقین کرتے ہیں کہ آپ کا دوست ہی آپ کے سامنے آیا۔

پھر کائنات کا یہ سارا نظام خالق کائنات کی تخلیقی کارفرمائیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جب وہ آپ کے سامنے ہے تو یہ کہنا کہ کائنات کا خالق ہمارے سامنے چوں کہ نہیں ہے اس لیے کسی دیکھی ہوئی چیز کو اپنے سامنے رکھ لیا جاتا ہے۔ بتایا جائے کہ آخر اس کا مطلب ہی کیا ہوا؟

اور مان بھی لیا جائے کہ آثار کو ناکافی قرار دے کر خالق کائنات کی ذات ہی

کے دھیان و گیان کا ذریعہ ان مورتیوں اور بتوں کو ٹھہرایا جائے تو پتھروں یا لکڑیوں سے تراشی ہوئی مورتیوں اور بتوں کو خدا کی ذات تک منتقل ہونے کا ذریعہ آخر کس بنیاد پر ان مورتیوں اور بتوں کو سمجھا جاتا ہے؟ کیا ان کی شکل وصورت سے خالق کی ذات کی طرف ذہن کے منتقل کرنے کا کام لیا جاتا ہے؟ تو سوال یہ ہی ہے کہ خدا کیا کوئی صورت رکھتا ہے؟ پھر اس کی صورت کسی مرد یا عورت یا جانور کی صورت ہوتی ہے؟ کیوں کہ ان مورتیوں اور بتوں میں کھودنے والے اسی قسم کی شباہتیں تو کھود کھود کر قائم کیا کرتے ہیں اور اپنی صورتوں کے لحاظ سے یہ مورتیاں خدا کی نمایندگی اگر نہیں کرتیں، بلکہ ان کو رکھنے والے اپنے سامنے یہ سوچ کر رکھ لیتے ہیں کہ خدا کی یہ مخلوق ہیں تو اس نقطۂ نظر سے کسی خاص مورتی یا مخصوص بت کو سامنے رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ مخلوق ہونے کے لحاظ سے سوچیے تو سارا عالم ہی خدا کی مخلوق ہے۔ عرض ہی کر چکا ہوں کہ اپنے تخلیقی آثار کے ساتھ تو خدا ایک لمحہ کے لیے ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ امام الموحدین حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی لیے تو فرمایا تھا کہ

لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ. (سورۃ انعام: ۷۶)

''میں اوجھل ہونے والے معبود کو نہیں چاہتا۔''

آخر ہمارے سامنے کچھ نہ ہو اپنی ذات اور ذات کا شعور تو بہر حال ہمارے ساتھ باقی ہی رہتا ہے۔ ایک ایک عضو کٹ کٹ کر آدمی سے الگ ہو جائے، لیکن ذات اور ذات کا شعور اس حال میں بھی ہم سے الگ نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی وجہ سے شعور ہی کا چراغ بجھ جائے، لیکن جب تک یہ چراغ جل رہا ہے اس وقت تک خدا کے اس تخلیقی اثر یعنی اپنی ذات کے شعور کو بہر حال اپنے اندر ہم پاتے رہیں گے۔ پس خالق کے تخلیقی آثار ہی سے خالق کو اپنے سامنے اگر لانا ہے تو اس کے لیے پتھروں اور لکڑیوں میں کھودی ہوئی مورتیوں ہی کے سامنے رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ ان مورتیوں کو دیکھ کر بجائے خالق کائنات کے آدمی کا ذہن اگر ان سنگ تراشوں ہی میں الجھ کر رہ جائے، جو ان مورتیوں اور بتوں کو گھڑتے ہیں تو اسی کی

توقع بھی طبعاً کرنی چاہیے، بلکہ بنانے والے اگر ان پر اپنے صنعتی عمل کو نمایاں نہ کرتے اور بن گھڑی سپاٹ شکلوں ہی میں پتھروں اور لکڑیوں کو رہنے دیتے تو خالق کی طرف ذہن کے منتقل ہونے میں شاید زیادہ آسانی ہوتی، مگر اس ذہنی انتقال کے لیے کسی خاص پتھر یا لکڑی کے کسی خاص ٹکڑے کی کیا خصوصیت ہے۔ جیسے بعض قدرتی مظاہر مثلاً سورج، چاند یا خاص نباتی یا حیوانی مخلوقات کو پوجنے والے آخر کیا عذر پیش کر سکتے ہیں؟ خالق ہی کے شعور کو اس کے ان تخلیقی آثار کی راہ سے بیدار کرنا اگر منظور ہے تو ایک سانڈ اور ایک چیونٹی میں کیا فرق ہے؟ حق تو یہ ہے کہ کاریگری کی جن نزاکتوں کا تماشا چیونٹی میں کیا جاتا ہے اور اس کے وجود کی مختصر تقطیع میں جن کمالات اور محاسن کی نمایش قدرت کی طرف سے کی گئی ہے، احساس پر جو اثر ان کے دیکھنے سے مرتب ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے ہاتھی اور سانڈ، اونٹ اور گھوڑے شاید اس اثر کو نہیں پیدا کر سکتے۔

الغرض جس طرح بھی دیکھا جائے بت پرستی کی طرف سے یہ پرانی اپالوجی (معذرت) کسی حیثیت سے تسکین و تشفی کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ جو واقعہ ہے اس پر پردہ ڈالنے کی ایک ناکام و نامراد کوشش ہے۔ بنانے والے باتیں بنا کر دوسروں کو صرف چپ کر دینا چاہتے ہیں۔ ورنہ حقیقت کی جو واقعی صورت ہے وہ یہی ہے۔ ان بت پرستوں کی عام ذہنیت تو وہی ہوتی ہے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے المسعودی نے لکھا ہے کہ

الجاهل منهم ومن لا علم له يشرك الاصنام بالٰهية الخالق. (مروج الذہب برحاشیۂ کامل ابن اثیر: جلد ا صفحہ ۱۹۱)

''ان بت پرستوں میں جو جاہل اور ناواقف ہیں وہ تو ان مورتیوں ہی کو معبودیت اور الٰہیت میں خالق کائنات کا ساجھی اور شریک سمجھتے ہیں۔''

یعنی پتھر اور لکڑی میں کھودی ہوئی صورتوں، جنھیں مورتیاں اور بت کہتے ہیں، براہ راست ان ہی کو خدائی کاروبار میں شریک سمجھ کر ان سے نفع اٹھانے یا ان کی ضرر

سے بچنے کے لیے ان کو پوجتے ہیں۔قرآن میں بھی جہاں کہیں ان اصنام اور بتوں کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ نہ وہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں، نہ چل سکتے ہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ ضرر تو اس سے اشارہ اسی طرف کیا گیا ہے کہ بڑا طبقہ عوام کا بت پرستوں میں یہی سمجھتا ہے کہ ان ہی گھڑے ہوئے پتھروں یا لکڑیوں میں یہ سارے کمالات پوشیدہ ہیں، جن میں بینائی نہیں ہوتی، جن میں شنوائی نہیں ہوتی، ان میں فرض کر لیتے ہیں کہ بینائی بھی ہے اور شنوائی بھی، اور کیسی بینائی وشنوائی؟ جس کے سامنے پوجنے والے کی بینائی اور شنوائی کی کوئی حقیقت نہیں ہے، جو کچھ کر نہیں سکتا، مان لیا جاتا ہے کہ پتھر کا وہی ٹکڑا سب کچھ کر سکتا ہے۔ یہ اعتقادی نفسیات تو عوام کی ہوتی ہے۔ باقی بت پرستوں میں خواص طبقہ جو ہوتا ہے یعنی فکر ونظر سے کام لیتا ہے، ظاہر ہے کہ جس پتھر میں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کچھ نہیں ہے اسی میں کیسے مان لیں کہ سب ہی کچھ ہے۔اسی لیے وہ ذرا زیادہ بلند پروازی سے کام لیتے ہیں، یعنی عوام بے چارے تو پتھر اور لکڑی کے ان ہی گھڑے ہوئے ٹکڑوں ہی میں دیدوشنید، داد ودہش کی قوتیں فرض کر لیا کرتے ہیں، مگر خواص بجائے ان کے یہ مانتے ہیں کہ ان تراشیدہ پتھروں کے پیچھے ان دیکھی روحیں دبکی ہوئی ہیں۔ان ہی نادیدہ ان دیکھی روحانی ہستیوں کی نمایندگی کا کام ان اصنام اور مورتیوں سے لیا جاتا ہے اور خواہ اقرار کیا جائے یا نہ کیا جائے مگر واقعہ یہی ہے کہ ان مفروضہ ان دیکھی روحوں کو ان کے پوجنے والے یہ نہیں مانتے کہ وہی عالم کے خالق وآفریدگار ہیں۔

بلکہ یہی مانا جاتا ہے کہ یہ سارے اصنام اور مورتیاں کسی مخلوق ہی کی روح کی نمایندگی کرتی ہیں۔ مثلاً اگلے زمانے کے کسی سربرآوردہ آدمی کی روح سے سمجھا جاتا ہے کہ فلاں شکل وصورت کی مورتی کا رشتہ قایم ہو جاتا ہے۔اسی طرح مظاہر قدرت میں سے جن چیزوں کا انتخاب مختلف زمانوں اور ملکوں یا قوموں میں معبود بنانے کے لیے ہوتا رہا ہے خود ان کو تو مخلوق سمجھا ہی جاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ بت پرستوں کے خواص کا طبقہ ان کے پیچھے کسی قسم کے ملکوتی یا روحانی وجود کو بھی پوشیدہ سمجھتا ہے اور ان

کی پوجا پاٹ کے وقت بجائے بتوں کے دیدہ اجسام کے ذہن کو اسی پوشیدہ ملکوتی یا روحانی وجود کی طرف منتقل کرتا ہے، ان ہی کا دھیان جماتا ہے، مثلاً سورج کے آتشیں کرے کے ساتھ سمجھا جاتا ہے کہ سورج دیوتا کی روح سے بھی وابستہ ہے۔ یا جودریا پوجے جاتے ہیں، مانا جاتا ہے کہ ان کا تعلق کسی مذکر یا مونث ان دیکھے روحانی وجود سے ہے۔ مگر یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے بے دیکھے، بے جانے، صرف فرض کرنے کی قوت ہی کا کرشمہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان روحانی اور ملکوتی ہستیوں کا تسلیم کرنا بغیر مشاہدے کے ایک فرضی سی بات ہوتی ہے۔ پھر یہ باور کرلینا کہ پتھر کے کسی خاص ٹکڑے میں خاص قسم کی نوک پلک، شکل وصورت کو گھڑ دینے کے ساتھ ہی ان مفروضہ روحانی ملکوتی ہستیوں میں سے فلاں ہستی کا ایسا رشتہ قایم ہوجاتا ہے کہ مورتی کے سامنے کھڑا ہونا گویا اسی روحانی وجود کے سامنے کھڑا ہونا ہے، جس کی نمایندگی مان لیا گیا ہے کہ یہ مورتی کرتی ہے۔

بہر حال کہنے کی حد تک تو یہ طبقہ خواص کا طبقہ کہلاتا ہے، لیکن ان کے وہمی اور فرضی تخلیقات سچ پوچھیے تو بت پرستوں کے عوام سے بھی کہیں زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ عامی غریب کا قصہ تو صرف ایک فرض پر ختم ہوجاتا ہے یعنی فرض کرلیتا ہے کہ نہ دیکھنے والی مورتی اسے دیکھ رہی ہے اور نہ سننے والا بت اس کی باتیں سن رہا ہے۔ اس سے زیادہ اپنے مفروضات کے سلسلے کو آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن خواص کے طبقے کو تو ایک فرض کے بعد دوسرے، دوسرے کے بعد تیسرے فرض کے ذہنی عمل پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ یعنی جن روحانی اور ملکوتی ہستیوں کا مشاہدے سے کوئی تعلق نہیں ہے پہلے ان ہی کے وجود کو فرض کرلیا جاتا ہے۔

پھر فرض کیا جاتا ہے کہ ان میں ہر ایک خاص خاص قسم کی فعلی انفعالی قوتیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان دو مفروضات..... صرف مفروضات کے بعد تیسرا مفروضہ یہ ہوتا ہے کہ پتھر یا لکڑی میں فلاں نوعیت کی شکل وصورت جب منقوش ہوجاتی ہے تو ان روحانی وملکوتی ہستیوں میں سے فلاں دیوتا کا تعلق پیدا ہوجاتا ہے۔ الغرض عوام کا کام

تو ایک ہی مفروضے سے چل جاتا ہے، لیکن خواص کو عوام کی جماعت میں امتیاز حاصل کرنے کے لیے فرض کر لینے کے اس عمل کی مختلف منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

جو واقعی بت پرستی کرتے ہیں ان ہی سے پوچھا جا سکتا ہے کہ جو کچھ عرض کیا گیا کیا اصل حقیقت اور واقعے کی صحیح تعبیر یہی ہے؟ یہ دعویٰ کہ خالق کا نمایندہ قرار دے کر بتوں کی پرستش لوگ کرتے ہیں، ایک ایسا دعویٰ ہے جس کا واقعے سے قطعاً کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ قوموں کے علم الاصنام کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، وہی جانتے ہیں کہ خالق کائنات کی نمایندگی کا کام کسی زمانے میں مورتی یا صنم یعنی بت سے کبھی نہیں لیا گیا ہے۔ بجائے خود یہ بھی ایک مفروضہ ہی ہے۔ آخر دنیا سے بت پرستی کا ابھی انقراض نہیں ہوا ہے، پوچھا جا سکتا ہے کہ پوجے جانے والوں میں کیا کوئی ایسا بت یا ایسی مورتی بھی ہے جو بجائے مخلوقات کے براہ راست خالق کی نمایندگی کے لیے بنائی گئی ہو؟ جہاں تک فقیر کی تلاش و جستجو کا تعلق ہے اس وقت تک کسی ایسے بت یا مورتی کی نشان دہی نہ ان ہی لوگوں نے کی جو بت پرستی کرتے ہیں اور نہ کتابوں ہی میں اب تک کسی ایسے بت کا مجھے پتا چلا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ کائنات کے خالق و مالک پروردگار کی عبادت میں بعضوں کو (العیاذ باللہ) اسی قسم کا فرض کا رنگ نظر آتا ہے۔ حالاں کہ آپ دیکھ چکے کہ اپنے تخلیقی آثار کے لحاظ سے نہ کبھی وہ کسی سے اوجھل ہوا ہے اور جب تک اس کی تخلیقی کارفرمائیوں کا یہ سلسلہ جاری ہے وہ اوجھل ہوگا۔ ذات اس کی ضرور نادیدہ ہے، اسی لیے کہتے ہیں کہ خدا کا وجود بھی غیبی ہے، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ ذات کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو مشاہدات محسوسات کا بڑا ذخیرہ غیب ہی کے دایرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ مشاہدے کا تعلق تو عموماً شے کے آثار ہی سے ہوتا ہے، لیکن بت پرستی کے مفروضات کی نوعیت یہ نہیں ہے، کیوں کہ نہ ذات ہی ان مفروضات کے سامنے ہوتی ہے، نہ ان کے آثار ہی کو ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں، بتوں کے پوجنے والے بھی یہی مانتے ہیں کہ سارے کائناتی آثار ایک ہی وجود کے تخلیقی مظاہر ہیں۔ پھر بت پرستی

کے مفروضات کو پانے والے آپ خود سوچیے ان کے کن آثار کا سہارا لے کر ان کو پا سکتے ہیں؟ بجز اس کے کہ جہاں جس کا جی چاہے کچھ فرض کرلے، کچھ مان لے، اس کے سوا وہ بے چارے اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ بات طویل اور کافی طویل ہوگئی، لیکن طوالت کے خوف سے حقائق و واقعات کو کیسے دبایا جائے۔ غلط فہمیوں کی گتھیوں میں غریب آدمی کی سمجھ الجھادی گئی ہے، گرہوں پر گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔ احتیاط سے ان کو اگر نہ کھولا جائے اور جو کچھ لوگ پہلے سے کہتے چلے آئے ہیں ان ہی کے دہرانے پر قناعت کی جائے تو اس سے بہتر میرے نزدیک یہی ہے کہ کچھ نہ کہا جائے، کچھ نہ لکھا جائے۔ مجھے جو کہنا تھا اپنی علمی ذمے داریوں کے ساتھ اسے پیش کردیا گیا۔ آیندہ سوچنے والوں کے لیے ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن راہ سامنے آجائے۔

عملی مادّیت:

بہرحال روحانیت کے مقابلے میں بنی آدم کی عملی زندگی کا ایسا نظام جس میں خالق سے بے پروا ہوکر مخلوق شاہی لوگ جھک پڑتے ہیں، اپنی خاص اصطلاح میں جس مسلک کی تعبیر "عملی مادّیت" سے میں نے کی ہے، بت پرستی بھی میرے نزدیک اسی عملی مادّیت کی ایک مغالطہ آمیز پاستانی پارینہ شکل ہے۔ مغالطہ آمیزی سے میرا مطلب یہ ہے کہ بہ ظاہر عملی زندگی کے اس نظام میں دعا و عبادت وغیرہ دینی عناصر جو پائے جاتے ہیں ان ہی کو دیکھ کر سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ بھی دینی زندگی ہی کی ایک خاص شکل ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ بھی ایک قسم کی عملی مادّیت ہی کا ایک خاص قالب ہے۔ اسی لیے بت پرستی کا زور عموماً قوموں میں اسی زمانے میں ہوتا ہے جب دنیا طلبی کے نشے میں وہ سرشار ہوتی ہیں۔ ٹھیک جو آج حال یورپ و امریکہ کا ہے اسی قسم کا دورہ اگلی قوموں پر بھی جب پڑتا رہا تو خالق سے تعلق کو کم زور کرتے ہوئے مخلوقات ہی میں وہ ڈوب جاتی تھیں۔ فرق صرف وہی ہے کہ یورپ و امریکہ کی عملی مادّیت کی موجودہ زندگی میں مخلوقات سے صرف عقلی رشتے ہی کے قائم کرنے پر لوگ اب تک ٹھہرے ہوئے ہیں اور پچھلے زمانے میں عقلی رشتے کے ساتھ ساتھ مفید و مضر

مخلوقات کے ساتھ دعائی عبادتی رشتہ بھی قایم کرلیا جاتا تھا۔ اشور و بابل، مصر و سوریا (شام)، روم و ایران وغیرہ کی تاریخ کی شہادت یہی ہے۔ تمدن و عمران کے عین طوفانی ایام میں بت پرستی بھی عروج کی آخری منزل تک پہنچی ہوئی تھی، لیکن ان کی بت پرستی طبقۂ خواص کی بت پرستی تھی، اسی لیے حد سے زیادہ پیچیدہ فلسفے کی شکل اس نے ان قوموں میں اختیار کرلی تھی۔

باب پنجم:

اسلام کی تعلیم توحید خالص

دنیا کے عام مذاہب وادیان جو اپنے تاریخی وثائق کھو چکے ہیں، ان کے متعلق تو کہنے والے جو کچھ بھی چاہیں کہہ سکتے ہیں، لیکن انسانی دین کا آخری قدرتی قالب ''الاسلام'' تو تاریخ کے روشن دنوں میں سب کے سامنے آیا۔ اس کا ہر دور ماضی ہو یا حال، تاریخی ایام ہی سے گزرتا ہوا بنی آدم کی موجودہ نسلوں تک پہنچا ہے۔

اللہ اللہ! کتنی خالص، ہر قسم کی الجھنوں سے پاک وصاف، شستہ ورفتہ، دھلی دھلائی ستھری توحید سے مسلمانوں کی دینی امت کا آغاز ہوا تھا، لیکن تمدن وعمران کی رنگینیوں میں غوطے کھاتے ہوئے کیا کیا بتایا جائے کہ جن سوراخوں سے دنیا کی گذشتہ مذہبی قومیں داخل ہو چکی تھیں ان میں مسلمان نہ گھسے۔ سچ تو یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بخشا ہوا توحیدی عقیدہ بھی مشرکانہ اوہام کی آلودگیوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہی مشرکانہ آلودگیاں جن کو دیکھ دیکھ کر غریب مولوی پہلے بھی جھنجھلاتے رہے اور آج تک اس سلسلے میں ان کی کڑکڑاہٹیں ختم نہیں ہوئی ہیں۔ آخر تاریخ کی اس شہادت کو بھی آپ جھٹلا دیں گے اور یہی کہتے چلے جائیں گے کہ توحید کا عقیدہ مشرکانہ اوہام کے بعد پیدا ہوا ہے؟ اور میں تو حیران ہوں، یورپ کے ان ہی ارباب تحقیق و تنقیدی سرچ اور تلاش والوں کے حوالے سے ہمیں یہ بھی تو سنایا جاتا ہے کہ کائنات کے خالق کی یکتائی اور وحدت کا عقیدہ انسانی فطرت کا ایک ایسا لازوال سرمدی احساس ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کسی زمانے میں خالی نہیں رہی ہے۔ مذاہب وادیان کے مشہور مغربی مورخ پروفیسر میکس مولر کو تو اسی بنیاد پر اپنے اس مشہور تحقیقی فیصلے کا اعلان کرنا پڑا کہ

> ''ہمارے باپ دادوں نے خدا کو اس وقت مانا اور جانا تھا جب خدا کا صحیح نام بھی شاید وہ نہیں رکھ سکتے۔''

اور آج بھی دور دراز جنگلی علاقوں کی وحشی قوموں کے دینی احساسات کے جائزہ لینے والے جہاں کہیں بھی پہنچے ہیں خود ان ہی کا بیان ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں یہ عقیدہ کا ئنات اور اس میں جو کچھ ہے بالآخر اس کی انتہا ایک ہی ذات واحد پر ہوتی ہے۔ ہر جگہ ہر قوم میں مشترک نظر آیا۔ ایسی صورت میں خود سوچیے کہ ہمیشہ سے جس بات کو لوگ مانتے چلے آئے ہیں اسی کے متعلق یہ باور کرانے کا بھلا کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ شرک میں مبتلا ہونے کے بعد اسی حقیقت کو لوگوں نے تسلیم کیا تھا۔

پس واقعہ وہی ہے، پہلے بھی اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ کائنات کے خالق و آفریدگار کی وحدت و یکتائی کا انکار صحیح معنوں میں پہلے بھی کبھی نہیں کیا گیا [1] اور آج بھی اکثریت و عمومیت سے یہی اطلاع مل رہی ہے کہ اس حقیقت کے یقین کا چراغ ان کے سینوں میں نہیں بجھا ہے، لیکن باوجود اس کے پہلے بھی یہی ہوتا رہا اور آج بھی جو کچھ دیکھا جا رہا ہے، کہنے والے اسے دیکھ دیکھ کر خواہ کچھ ہی کہتے ہوں، مگر واقعہ یہی ہے کہ خالق جس کا سب کچھ ہے اور سب کچھ اسی کا نہ ہو تو سب کا خالق ہی وہ کیسے مانا جا سکتا ہے؟ بہر حال وہی خالق جس کا سب کچھ ہے، تاریخ کے مختلف دوروں میں اچانک اسی کے متعلق باور کرنے والے کچھ ایسی باتیں باور کرنے لگے جن کا مآل یہی تھا کہ گویا اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ ان ہی مخلوقات کے اختیار

---

[1] عیسائیوں اور قدیم ہند کی ثالوثیت یعنی ایک تین ہے، تین ایک ہے۔ جس کی تعبیر ہندوستان میں تو برہما، وشنو، شیو وغیرہ کے الفاظ سے کی گئی تھی اور عیسائیوں میں باپ بیٹا اور روح القدس صلیبی ثالوثیت کی تعبیر ہے۔ اسی طرح ایران کی ثنویت یعنی ایک دو ہے دو ایک ہے۔ یزدان و اہرمن یا نور و ظلمت لفظی گورکھ دھندوں سے جو عقیدہ ذہن نشین کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ بھی ہوا، فالتو عقل کی ایام بے شغلی کے ایک لاحاصل مشغلے کے سوا ان کی نہ کوئی قدر ہے نہ قیمت۔ اور بات بالآخر وہ ثابت ہوئی کہ ایک ہی سرچشمہ سے سب کچھ نکلا ہے۔ اسی سیدھی سادی بات کو الجھا کر بیان کرنے والوں نے الجھا دیا۔ ان لایعنی موشگافیوں سے طرح طرح کی غلط فہمیوں میں لوگ مبتلا ہوئے۔ مثلاً خالق قیوم اور فنا کرنے والے خالق کی ان تین صفات کو جیسا کہ کہا جاتا ہے ہندوستان میں برہما، وشنو، شیو کے الفاظ سے سمجھایا جاتا تھا، لیکن سمجھنے والوں نے کیا سمجھا؟ اب اسے میں کیا بتاؤں۔ عیاں را چہ بیان، یہی حال صلیبی ثالوثیت کا ہے۔

میں ہے، جن کے پاس خالق کی بخشی ہوئی بھیک کے سوا نہ کچھ ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اسی احساس بے بنیاد، قطعاً بے بنیاد، بے سر و پا احساس کا نتیجہ پہلے بھی یہی ہوا اور آج بھی یہی ہے کہ بنانے والوں نے اپنی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کی آماج گاہ، ان ہی مخلوقاتی مظاہر کو بنا لیا، جن کے ذریعے سے خالق لوگوں کو نفع بھی پہنچا رہا ہے اور ان ہی کی راہ سے ان حوادث کی لہریں بھی اٹھتی رہتی ہیں، جن سے آدمی اذیت اور تکلیف محسوس کرتا ہے۔ الغرض خالق کی کارفرمائیوں میں قدرت کے جن مظاہر کی حیثیت صرف وسایل اور ذرایع کی ہے، خالق سے بے گانہ ہو کر لوگ ان ہی پر ٹوٹ پڑے۔

یقین کیجیے کہ شرک کی قدیم فرسودہ و پارینہ ذہنیت، جس کا دور دورہ اصنامی نظام کے عہد میں تھا، اس میں تو خیر جیسا کہ کہہ چکا ہوں یہی ہوتا تھا، لیکن مادّیت کا جو طوفان آج یورپ و امریکہ سے سینہ تانے ہوئے انسانی بستیوں پر چھاتا چلا جا رہا ہے، سمجھنے والے خواہ اسے کچھ بھی سمجھتے ہوں مگر ٹھنڈے دل اور کھلے دماغ سے وہ اگر سوچیں گے تو پائیں گے کہ عملاً اس جدید مادی ذہنیت کے زیر اثر بھی وہی کچھ کیا جا رہا ہے جو کچھ پہلے کیا جا چکا ہے، قالب بدلے ہوئے ضرور ہیں، لیکن روح قدیم مخلوق پرستی اور جدید مادہ پرستی کی ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ ہمارے ملک کے مشہور بوڑھے مفکر اور مدبر راجہ گوپال اچاریہ کی زبان سے کچھ دن ہوئے بے ساختہ فقرہ جو نکل پڑا تھا کہ

''اس زمانے کا خدا تو ایٹم بم ہے۔''

سچ پوچھیے تو اسی ''مشترک روح'' کی طرف یہ اسی قسم کا ایک تاریخی اشارہ ہے، جیسے ان سے کچھ دن پہلے ہمارے قومی شاعر لسان العصر اکبر مرحوم نے بھی اپنے مخصوص مزاحی انداز میں یہ پیش کی تھی

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

''ایٹم بم خدا ہے'' یا برق اور بھاپ کو یورپ والوں نے خدا سمجھ رکھا ہے، ظاہر ہے کہ اس خدائی کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ کائنات کا خالق اور سر چشمہ قدرتی قوانین

کے ان مظاہر کو مان لیا گیا ہے۔

بلکہ مطلب وہی ہے کہ دنیا کی قدیم فرسودہ مشرک قوموں میں جیسے یہ فرض کرلیا جاتا تھا کہ پیدا ہونے یعنی نیست سے ہست ہونے کے بعد نظم کائنات کا تعمیری ہو یا تخریبی.....اقتدار ان ہی مخلوقات کی طرف منتقل ہو گیا ہے جن کی اہمیت کا احساس زندگی کی ضرورتوں میں وقتاً فوقتاً خاص اسباب و وجوہ کے تحت ان میں شدت پذیر ہوتا رہتا تھا۔ دیکھا جاتا تھا کہ گانے والے ان میں کبھی سورج دیوتا کا بھجن گا رہے ہیں۔ اور اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناچ رہے ہیں، تھرک رہے ہیں۔ کبھی کتھا بچارنے والے چند رما کی کتھا سنا سنا کر دلوں میں اسی کی عظمت وجلال کا سکہ جما رہے ہیں۔ کبھی اگنی کی استت کے نشے میں لوگ سرشار ہیں۔ سمجھا جا رہا ہے کہ سب کچھ وہی ہے ❶۔ یوں ہی مرکزیت کا یہ مقام مختلف مخلوقات کو حاصل ہوتا رہتا تھا۔ ان قوموں کو مشرک کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ ہی یہ تھی کہ اس طریقے سے مخلوقات کو بھی عالم کے کاروبار میں خالق کا ساجھی اور شریک فرض کر کے وہی رشتہ ان مخلوقات کے ساتھ قائم کر لیتے تھے جس کا قدرتی استحقاق کائنات کے خالق اور پیدا کرنے والے کے سوا یعنی وہی جس کا سب کچھ ہے، اس کے سوا نہ کسی کو ہے اور نہ کسی کو کبھی ہو سکتا ہے اور جو حال ان پرانی قوموں کی اس پارینہ مشرکانہ ذہنیت کا تھا۔ قریب قریب یہی رنگ عصر حاضر کی جدید مادی تہذیب کے زیر اثر زندگی گزارنے والوں کی ذہنیت بھی نظر آتی ہے۔ یعنی قدرتی قوانین کے ایسے مظاہر جن کے بعض پوشیدہ اسرار اور مخفی نوامیس سے اس زمانے میں وقتاً فوقتاً پردہ ہٹتا چلا جا رہا ہے اور تعمیری مقاصد ہوں یا تخریبی ہوسناکیاں، دونوں ہی کی تکمیل میں ان سے امداد مل رہی ہے۔ ان ہی سے افادہ و استفادہ کی راہوں میں ماننے

---

❶ قدیم علم الاصنام کے مطالعے سے عجب دل چسپ آگاہیاں حاصل ہوتی ہیں۔ سورج دیوتا کو عموماً پرانی مشرک قوموں میں غیر معمولی برتری حاصل رہی ہے۔ لیکن بابل کے بت پرستوں میں باور کرانے والوں نے یہ باور کرا رکھا تھا جیسا کہ کل جیکی صاحب نے لکھا ہے کہ چاند کے مقابلے میں سورج کا درجہ گرا ہوا ہے۔ چاند کو بابل والے ہمیشہ نر دیوتا سمجھتے تھے اور سورج کو دیبی یعنی مادہ ٹھہرایا جاتا تھا۔ کبھی سورج کو چاند کا بیٹا بھی کہتے تھے۔ (مینول ہسٹری آف پیپل (ترجمہ) صفحہ ۵۲)

والے یہ ماننے لگے ہیں کہ خالق کائنات کو درمیان میں آنے یا لانے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن باور یہی کرلیا گیا ہے کہ جن مخلوقات میں اپنا کچھ نہیں ہوتا براہ راست ان ہی سے رشتہ قایم کرکے سب کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسے خود آفریدہ احساس کہیے یا وہم، اسی کا نتیجہ ہے کہ خالق کی طرف سے موجودہ مادی تہذیب میں بے اعتنائیاں حد سے گزری چلی جارہی ہیں۔ اس راہ میں ان کی لاپروائیاں ناقابل برداشت بن چکی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ خالق کی طرف سے یورپ کی جدید مادی تہذہب میں اعتقاداً نہ سہی مگر عملاً اس حد کو پہنچ گئی ہیں کہ خالق کے انکار کا شبہ، اس پر بے جا نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور ٹھیک جیسے قدیم مشرک قوموں کے التفات و توجہ کے مرکز ان ہی مخلوقات کے سلسلے میں بدلتے رہتے تھے، جن سے وقتاً فوقتاً وہ وابستہ ہوتی رہتی تھیں، کچھ اسی رنگ میں مادّیت کی تہذیب جدید میں بھی دل چسپیوں اور سرگرمیوں کے محور بھی دیکھا جارہا ہے کہ بدلتے سدلتے رہتے ہیں۔ قدرتی قوانین کا ہر نیا راز جس کی روشنی میں تعمیر یا تخریب کی نئی قوت سامنے آتی ہے وہی لوگوں کو اپنے اوپر سمیٹ لیتی ہے اور اکھٹے ہونے والے اسی کے اردگرد دھونی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر جن انکشافات کا ڈھنڈورا اس سے پہلے پیٹا جاتا تھا، آسمان اور زمین کو ان کے چرچوں سے بھر دیا گیا تھا، کثرت استعمال و مشاہدہ ان کو عام برتی جانے والی پیش پا افتادہ چیزوں کے انبار میں شریک کرتا چلا جاتا ہے۔ اکبر مرحوم کے زمانے میں برق اور بھاپ کو ہر دل عزیزی کا یہ مقام حاصل تھا اور یہی اہمیت آج ''ایٹم بم'' اور آیٹم کی ان توانائیوں کی دی جارہی ہے جن کے ساتھ امید و بیم، رغبت و رہبت کا وہی رشتہ قایم کرلیا گیا ہے۔ جس کا حق دار ایٹمی توانائیوں اور ان کے سوا جو کچھ ہے سب ہی کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے اور یہی مطلب ان چیزوں کے خدا بنا لینے کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ و امریکہ کی جدید مادی تہذیب کے ان ہی رجحانات کو دیکھ کر بعضوں نے کہہ دیا کہ یہ ایک خدا بے زار تہذیب ہے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یورپ و امریکہ کے عام باشندے کلیتاً خدا کے منکر ہو چکے ہیں؟ بلکہ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے زیادہ سے

زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی اسی قسم کی مشرکانہ ذہنیت کا شکار ہیں، جس کا شکار ہونے والا بے سروپا ایسے پریشان خواب دیکھنے لگتا ہے کہ سب کچھ جس کا پیدا کیا ہوا ہے، عملاً وہی کچھ نہیں ہے اور جن مخلوقات میں خود اپنا کچھ نہیں ہوتا وہی سب کچھ بنا ہوا ہے۔

بہر حال بجز چند استثنائی گنی چنی ہستیوں کے جن کی تھوڑی بہت تعداد تقریباً ہر ملک اور ہر زمانے میں کسی نہ کسی رنگ میں پائی گئی ہے، یورپ و امریکہ کے عام باشندوں کی موجودہ مادی ذہنیت میرے نزدیک قدیم مشرکانہ ذہنیت ہی کا ایک نیا بھیس ہے۔ گویا شرک کا وہی پرانا آسیب ہے جو طریقہ بدل کر پھر آدم کی اولاد پر سوار ہو گیا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔

شرک کا پرانا بھوت جس نے تاریخ کے گزرے ہوئے دنوں میں انسانی آبادیوں کے اندر اودھم مچا رکھی تھی، اس کے ذکر سے تو خیر قرآن بھرا ہی ہوا ہے، لیکن بعض اشارے قرآن ہی میں ایسے بھی کیے گئے ہیں جن سے شرک کے اس جدید اطلاق کی تصحیح ہوتی ہے [1]۔

---

[1] سورۂ کہف میں دو باغوں والے اور اس کے صاحب کا تمثیلی قصہ۔ جو بیان کیا گیا ہے، اس قصے کو غور سے پڑھیے! باغ والا اسی مالی خولیا میں مبتلا تھا کہ قدرتی قوانین کو اپنے قابو میں لا کر اپنے باغوں اور کھیتوں میں جو غیر معمولی استحکام میں پیدا کر دیا ہے، اس نظم کو کوئی طاقت اب پراگندہ نہیں کر سکتی۔ مگر جب اس کا سارا نظم و اہتمام اور سارا کیا کرایا برباد ہو کر رہ گیا تو پچھتاتے ہوئے، قرآن میں ہے من جملہ دوسری باتوں کے یہ بھی کہتا تھا کہ کاش! اپنے رب کے ساتھ کسی کو میں شریک اور ساجھی نہ بناتا۔ غور طلب مسئلہ یہی ہے کہ قدیم مشرکانہ ذہنیت کے زیر اثر جو کچھ کیا جاتا تھا اس کا ذکر اس قصے میں کہیں نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن یورپ کی جدید مادی ذہنیت کے سارے خصوصیات اس کے ایک ایک لفظ سے جھلک رہے ہیں اور یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس قصے میں ''شرک'' کے لفظ سے اشارہ اسی ذہنیت کی طرف کیا گیا ہے۔ سورۂ کہف کی تذکیری تفسیر میں اس مسئلے کی تفصیل کی گئی ہے، جو افسوس ہے کتابی شکل میں پریس سے اس وقت تک باہر نہیں آ سکی۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کتاب کب شائع ہوگی۔

نوٹ از ناشر: ''تذکیر بسورۃ الکہف'' پاکستان کے کئی ناشرین شائع کر چکے ہیں۔ اب ''مکتبۂ اسعدیہ'' نے بھی اس کی جدید کمپوزنگ کرائی ہے اور شایانِ شان طریقے سے ان شاء اللہ شائع ہوگی۔

باب ششم:

خدا فراموشی اور اس کی سزا

سچ تو یہ ہے کہ شرک قدیم ہو یا جدید، آثار و نتائج بھی دونوں ہی کے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ سب کی تفصیل تو مشکل ہے لیکن چند کھلی کھلی واضح چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہی کہ ''خدا فراموشی'' آدمی کو ''خود فراموشی'' کے ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ قرآنی قانون:

نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ. (سورۂ حشر:۱۹)

''بھول گئے وہ اللہ کو، پس بھلا دیا اللہ نے ان کو اپنے آپ سے۔''

کا جو مفاد و اقتضا ہے۔ یا مآلاً اسی کے قریب قریب نفسیاتی مکافات و مجازات کا یہ قدرتی دستور، یعنی ''آغاز فراموشوں'' کا دل و دماغ ''انجام فراموشی'' کی آفت سے ماؤف ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس کا حاصل یہی ہے کہ ''انجام فراموشی'' کی بصیرت سے ان کو محروم کر دیا جاتا ہے جو ''آغاز'' سے آنکھیں چراتے ہوئے اپنے جینے کا پروگرام بناتے ہیں اور اپنی زندگی کے قیمتی سرمائے کے ساتھ کاروبار کرتے ہوئے نہ یہ سوچتے ہیں اور نہ سوچنا چاہتے ہیں کہ جہاں سے ان کو یہ سرمایہ ملا ہے وہاں کا منشا کیا ہے؟ یہی ناشکری، نمک حرامی اور کفر کی ذہنیت ہے۔ یوں تو سارا قرآن ہی اس ''قدرتی قانون'' کے ذکر سے بھرا ہوا ہے لیکن سورۃ الممتحنہ کے خاتمے کی آیتیں جن میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ

لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ. (سورۃ الممتحنہ:۱۳)

''نہ یہ میل جول رکھنا ان لوگوں سے جن پر اللہ کا غصہ بھڑک چکا ہے، وہ ''الآخرۃ'' (یعنی انجام) سے مایوس ہو چکے ہیں، (اسی طرح مایوس) جیسے ''الکفار'' (ناشکروں کا طبقہ) مایوس ہو چکا ہے قبر والوں سے۔''

ان الفاظ میں ایک طرف تو یہ بتایا گیا ہے کہ قبر والوں (یعنی اصحاب قبور) سے مایوسی کا احساس کفر کی پیداوار ہے اور دوسری طرف اس کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ ''انجام سے مایوسی کی یہ ذہنیت'' اللہ کے غصے کا نتیجہ ہے۔ اور یہی میری غرض ہے کہ ''انجام اندیشی'' کی بصیرت سے محرومی، سمجھنے والے خواہ اسے خرد و دانش کا ہی تقاضا کیوں نہ سمجھتے ہوں، لیکن یاس و قنوط کا یہ احساس درحقیقت قدرتی انتقال کا ایک باطنی اور ذہنی رنگ ہے۔ ''آغاز'' کی ذمے داریوں سے بے اعتنائی ''انجام'' سے مایوسی کی اس کیفیت کو دلوں میں پیدا کرتی ہے اور اس وقت تک پیدا کرتی رہے گی، جب تک کہ ''آغاز'' سے لاپرواہی اختیار کی جائے گی۔ لاکھ سمجھایا جائے مگر مایوسوں پر سمجھ کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ قرآن ہی میں یہ فرماتے ہوئے کہ خالق کائنات نے

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ. (سورۂ انعام:۱۲)

''رحمت اور مہربانی کو اپنے اوپر واجب ٹھہرا لیا ہے (اس کی مہربانی اور رحمت ہی کا اقتضا ہے) کہ اکٹھا کرے گا تمھیں قیامت کے دن (قیامت کا وہی دن) جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔''

مطلب جس کا یہی ہے کہ جینا چاہتے ہیں، ان کو ہمیشہ کے لیے مٹایا اور نیست و نابود کر کے نہیں رکھ دیا جائے گا، بلکہ پیدا کرنے والے کی رحمت ہی کا یہ اقتضا ہے کہ دنیا کی فرسودہ زندگی سے بھی زیادہ ترو تازہ حیات انھیں بخشی جائے گی۔

فہمایش کا یہ کتنا پیارا، کتنا دل آویز اور اثر انگیز لہجہ ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جاتا کہ جس پر کچھ بھی واجب نہیں، وہی اپنے اوپر رحم اور مہربانی کو واجب ٹھہراتے ہوئے مرنے والوں کو دلاسا دے رہا ہے کہ تم زندہ ہی رہو گے، مگر پڑھیے۔ اسی کے بعد یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ

اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ. (سورۂ انعام:۱۲)

''جنھوں نے اپنا دیوالہ نکال لیا ہے اور خسارے کے جو شکار ہو گئے ہیں وہ کبھی نہ مانیں گے۔''

یہ ''دیوالہ'' اور ''خسارہ'' جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے اس کا تعلق زندگی کے اسی سرمائے سے ہے جس میں زندگی کے آغاز کے متعلق یک سوئی حاصل کیے بغیر کاروباری تصرفات میں لوگ مشغول ہو جاتے ہیں [1]۔ آگاہ کیا گیا ہے کہ لاکھ ان کو سمجھایا جائے کہ تم مٹو گے نہیں، مگر وہ اڑتے ہی چلے جائیں گے کہ ہم تو مٹ ہی کر رہیں گے۔ ہٹ دھرمی یا اصرار بے باکی یہ دماغی کیفیت سزائی کیفیت کے سوا کیا ہے کہ اسے اور کیا سمجھا جائے!

ان دو قدرتی شکنجوں کے ساتھ تیسرا قدرتی ''شکنجہ'' وہ بھی ہے جس میں دبے اور کسے ہوئے ذہنی سزا پانے والے قدرت کے مخفی انتقامی ہاتھوں سے سزا پاتے رہتے ہیں۔ اپنے لفظوں میں جس کی تعبیر ''احد او کل احد'' سے کر کے اردو میں اسی کا ترجمہ ''ایک یا ہر ایک'' کر دیا کرتا ہوں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک خالق کے سامنے سے بھاگنے والے مجبور ہیں کہ مخلوفات جن کی تعداد گنی نہیں جا سکتی، ان ہی کے پیچھے بھاگے بھاگے پھریں۔ جو ایک سے نہیں ڈرتا اسے ہر ایک سے ڈرنا پڑتا ہے۔ وہی ہر ایک کے آگے جھکنے پر بے بس ہو جاتے ہیں جو اس ایک کے آگے جھکنا نہیں چاہتے۔ یہ قدرت کا ایک ایسا قدرتی شکنجہ ہے جس کی گرفت سے نکلنے والے نکلنا بھی چاہیں تو نکل نہیں سکتے۔ آدمی کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو اختیار کر کے جیے اور مرے۔ دیکھے کہ آسودگی، راحت و عافیت کی ضمانت کس میں ہے؟ قرآن میں ان ہی دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا گیا ہے کہ

ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ. (سورۂ یوسف:۳۹)

''بہت سے پروردگاروں سے (پرورش کا تعلق قایم کر کے جینا) یہ بہتر ہے یا
تنہا اللہ، جو سب پر سب سے غالب ہے (اسی ایک کو اپنا پروردگار بنا لینا؟)۔''

اسی واقع کو دوسرے پیرائے میں یوں بھی سمجھایا گیا ہے۔ سورۂ زمر میں ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ. (سورۂ زمر:۲۹)

---

[1] تفصیل اس کی مقصود ہو تو خاکسار کا رسالہ ''کائنات روحانی'' نامی کا مطالعہ کیا جائے۔

''اللہ ایک مثال پیش کرتا ہے۔ ایک آدمی تو ایسا ہے جو باہم چند کش مکش رکھنے والوں کے ساجھے میں ہے اور دوسرا آدمی وہ ہے جو مسلم ایک ہی شخص کے ساتھ مختص ہو۔''

اس مثال کو پیش کر کے پوچھا گیا ہے:

هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا. (سورۂ زمر: ۲۹)

''کیا یہ دونوں برابر ہو جائیں گے؟''

جواب تجربے کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ وہی بتا سکتا ہے کہ زندگی کی ان دونوں مثالی شکلوں میں زندگی کب تک باقی رہتی ہے اور موت سے زیادہ اجیرن بن کر یہی زندگی کب اور کس حال میں رہ جاتی ہے۔

بہر حال ایک کی نیاز مندی ہر ایک سے جب آدمی کو بے نیاز کر رہی ہو، ایک کا ڈر ہر ایک سے آدمی کو نڈر بنا رہا ہو، ایک کا سجدہ ہر ایک کے آگے ماتھا رگڑنے کی ذلت سے بچا لیتا ہو، قدرت کے اس قانون سے استفادے کی توفیق سے محرومی یقیناً سزا ہی کی ایک شکل ہو سکتی ہے، جو نمک حرامی کے مجرم ناشکروں کو دی جاتی ہے اور مرنے سے پہلے ہی دی جاتی ہے۔ زندانِ مصر میں یوسفی خطبے کا یہ فقرہ یعنی:

مَا كَانَ لَنَا اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ. (سورۂ یوسف: ۳۸)

''ہمارے لیے یہ جائز نہیں رکھا گیا ہے کہ کسی چیز کو بھی اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ یہ ہم پر بھی اللہ کا فضل ہے اور عام لوگوں پر بھی ہے۔''

اس کی قدر و قیمت اب سمجھ میں آتی ہے۔

قرآن جس زمانے میں نازل ہو رہا تھا اس وقت اس سے پہلے بھگتنے والے ان سزاؤں کو کس طرح بھگت رہے تھے؟ جاہلیت ہی میں نہیں بلکہ یورپ و امریکہ کی ''بقراطیت'' میں بھی اس کا جواب آپ کو مل سکتا ہے۔ کم از کم میرا ذاتی احساس یہی ہے کہ زیادہ مہیب اور زیادہ خوف ناک قالب میں یہی باطنی سزائیں آج دنیا کے

سروں پر کھیل رہی ہیں۔ بجز ایک خاص پہلو کے جس کا ذکر کیا جائے گا، یہ واقعہ ہے کہ یورپ وامریکہ کی ''نشئت جدیدہ'' کی پیدا کی ہوئی مادی زندگی میں ان کے کوڑھ جس طرح پھوٹ پڑے ہیں، جو پھوڑے اور گھاؤ سر نکال رہے ہیں، جو گندگی، سڑاندھ اور عفونت ان سے ابل رہی ہے شاید ان کو ''دماغ پاش'' بھبھکوں کا تجربہ گزری ہوئی جاہلیت کے زمانے میں بھی مشکل ہی سے لوگوں کو ہوا ہوگا۔ میں جو کچھ عرض کرتا ہوں اسے پڑھیے اور بتلایے کہ اپنے احساس میں کس حد تک فقیر حق بہ جانب ہے۔

دیکھیے! ''خدا فراموشی'' کی سزا میں ''خود فراموشی'' کے عذاب کو تہذیب جدید کی نئی اور ماڈرن مشرکانہ ذہنیت جس طریقے سے خرید چکی ہے اور اپنی اس ''خود فراموشی'' پر اصرار و ناز جس حد تک ترقی کر کے پہنچ چکا ہے اس کی تفصیلی داستان آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں۔ تحقیق و تلاش کی علمی فہرست میں دیکھ چکے کہ ذرہ سے آفتاب تک کیڑے مکوڑوں، جنگل کے بھیڑیوں اور درندوں، سانپوں اور بچھوؤں تک کے سامنے ''کس لیے'' کا سوال اور سوالیہ نشان؟ بنا دیا گیا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اب تو اسی ''کس لیے؟'' کے سوال کو زمین سے اٹھا کر سیاروں تک بھی پہنچایا جا چکا ہے۔ سورج کے اندر جو داغ اور دھبے دکھائی دیتے ہیں، پوچھا جا رہا ہے وہ کیوں ہیں اور کس لیے ہیں؟ مریخ کے سیارے میں دور بینوں سے جن نشانوں اور لکیروں کا پتا چلا ہے، کیوں اور کس لیے کے سوالات کے نشانے وہ بھی بن چکے ہیں۔

لیکن زمین اور آسمان کی ساری پیداواروں میں کس لیے کے اسی سوال سے محروم، قطعی محروم خود ان کا اپنا وجود بنا ہوا ہے۔ انسان کس لیے پیدا ہوا ہے؟ کس قدرتی نصب العین کی تکمیل آدمی کے وجود سے ہوتی ہے؟ عرض ہی کر چکا ہوں کہ یہی سوال ان کو بھلا دیا گیا ہے۔ ان کی مثال پانچ مسافروں کی اس ٹولی کی نظر آتی ہے جن میں ہر ایک اپنے رفیقوں کو اسی طریقے سے گنتا تھا کہ خود اپنے آپ کو گننا بھول جاتا تھا۔ کہرام مچا ہوا تھا کہ ہمارے پانچ رفیقوں میں کوئی نہ کوئی رفیق ضرور ڈوب مرا ہے۔ باہم پوچھتے تھے کہ بجائے پانچ کے آخر میزان سب کی کل چار ہی کیوں ٹھہرتی ہے؟ آج دنیا

کا نیا ''انسان'' اسی دماغی حادثے کا شکار ہے۔ یقین مانیے کہ ''خدا'' جب تک یاد نہ آئے گا اس وقت تک خود اپنے آپ کو بھی وہ کبھی یاد نہ آئیں گے۔

انسان کس لیے ہے؟ اس سوال کا جواب تو جواب میرا خیال تو یہی ہے کہ سوال کی یاد بھی ان کے حافظے میں انگڑائی کیا کروٹ بھی نہیں بدل سکتی۔ یہ ''خود فراموشی'' اسی ''خدا فراموشی'' کی قدرتی سزا ہے۔ اپنے سوا کسی دوسری چیز کو آدمی بھول جائے یہ تو ہوسکتا ہے اور ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن اپنے آپ کو بھی بہ ثبات عقل و ہوش کوئی بھول جائے، اپنے حافظے سے خود نکل پڑے، بہ ظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، مگر جو واقعہ آپ کے سامنے ہے بتایے اس کا انکار کیسے کیا جائے؟ یقیناً اپنے آپ سے آدمی بھلایا جاچکا ہے، خود اپنے حافظے سے اس کی اپنی یاد چھینی جا چکی ہے، اسی لیے تو اس کو میں ''ذہنی عذاب'' سمجھتا ہوں کہ بات جو سمجھ میں نہیں آتی وہی واقعہ بن کر ہم سب کے سامنے آچکی ہے! آخر اس کو عذاب نہ سمجھا جائے تو اور کیا سمجھا جائے؟ ''خدا فراموشی'' ''خود فراموشی'' کے عذاب کو آدمی پر مسلط کرتی ہے۔ زور تو:

نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ. (سورۂ حشر:۱۹)

''بھول گئے وہ اللہ کو، پس بھلا دیا اللہ نے ان کو اپنے آپ سے۔''

کے قرآنی قانون کا تھا۔ اب دیکھیے ''آغاز'' سے بے اعتنائی ''انجام'' سے آدمی کو اندھا کیسے بنا دیتی ہے:

ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ. (سورۂ ق:۳)

''کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک بن جائیں گے پھر زندگی واپس ہوگی؟
یہ دور از عقل خیال ہے۔''

یہ احساس تو عرب کے جاہل بت پرست مشرکین کا تھا، لیکن آج نئی روشنی میں دیکھیے کیا ہورہا ہے؟ یہ انسانی افکار پر ایک ازم کے بعد دوسرے ازم کی، دوسرے کے بعد تیسرے ازم کی ڈاک گاڑی مسلسل یکے بعد دیگرے جو چھوڑی جارہی ہے ان سارے ازموں کے انبار یا طومار کے اندر اگر صحیح طور پر ٹٹولیے گا تو صرف یہی ہاتھ

آئے گا کہ ''ماضی'' تو خیر ''ماضی'' ہی ہو چکا، ہر ''حال'' کو دوزخ ثابت کرتے ہوئے ہر ایک دوسرے کو اور ہر پہلی نسل پچھلی نسلوں کو ''مستقبل'' میں آدمی کے فردوس گم گشتہ کی پیداوار، صرف امیدوار اس طریقے سے بناتی چلی جارہی ہے کہ ہر امید دلانے والے کے سامنے سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ''انجام'' کے سوال کو اوجھل اور اوٹ میں ڈال دیا گیا ہے اور یوں دوسروں کو ''مستقبل'' کی جنت کی امید دلانے والے خود ''حال'' ہی کی جہنموں میں دم توڑتے چلے جارہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ''ناتمام زندگی'' کو بھی ''ناکام زندگی'' بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ اسی لیے تو میں کہا کرتا ہوں:

''جنت کا انکار کر کے دیکھو! یہی خاکی زندگی جہنم بن کر تم سے لپٹ پڑے گی۔''

باقی ''احد او کل احد'' یعنی وہی ''ایک یا ہر ایک۔'' کا قدرتی شکنجہ پرانے شرک کے مخبوطوں کو اس شکنجے کے اندر پھڑ پھڑانے اور تڑپنے کا نظارہ تو جتنا دردناک ہے اس کا قصہ تو آگے آرہا ہے، لیکن مادی شرک کی ''عصری ذہنیت'' کے تماشے بھی اس سلسلے میں کیا کچھ کم دل چسپ یا کم دل دوز ہیں؟ ایک کو چھوڑ کر بھاگنے والے آج کس کس کے پیچھے کہاں کہاں بھاگ بھاگ کر پہنچ رہے ہیں؟ آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا ہے زبان اور قلم سے اسے کیا دکھایا جائے؟ ایک سے نڈر بن کر اپنے اوپر جن جن چیزوں کے ڈر کو لوگوں نے مسلط کر لیا ہے کیا ان کو ہم گن سکتے ہیں؟ پانی کا ایک قطرہ جس زمانے میں صرف زہریلے کاٹ کھانے والے جراثیم کا سمندر بن چکا ہو، ہوا کی ہر موج سمی جرمس اور بکٹریا کی آندھی ٹھہرائی جارہی ہو؟ گویا دوسرے لفظوں میں ساری دنیا دہشت و خوف، اندیشہ اور ہیبت کی دوزخ کا قالب اختیار کر چکی ہے۔ بدتمیزی کے اسی طوفان میں انسانیت کی بہتی ہوئی لاش سمجھی جاتی ہو کہ بہ رہی ہے ایسی لاش جس کا نہ کوئی والی ہے نہ وارث، عذاب کے سوا بتایا جائے کہ اس ''فکری روش'' اور تصور کے اس طریقے کو ہم اور کیا قرار دیں؟

حق تو یہ کہ ''اوہام و خرافات'' کے پرانے عہد میں پرانے پیپل اور برگد کے ہر پیڑ پر شیطان کا گھونسلا اور املی کے ہرا کیلے درخت پر مان لیا جاتا تھا کہ بھوت پریت بسیرا

لیتے ہیں، چڑیلوں سے باور کرلیا جاتا تھا کہ ہر ویرانہ آباد ہے، خالی مکانوں کو جنات اور پریاں اپنا مسکن بنالیتی ہیں۔ گزرے ہوئے لوگوں کے ان پارینہ احساسات پر قہقہہ لگانے کا حق میری سمجھ میں تو نہیں آتا ان لوگوں کے لیے کیسے باقی رہا ہے جن کے لیے آج ہر لنگڑا مچھر دیوانے ہاتھی سے بھی زیادہ خوف ناک بن چکا ہے، جس کی ہر بھنبھناہٹ ان کے لیے موت کی آہٹ اور مرگ کا پیغام بن جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ باور کرایا جارہا ہے یہ سب جھوٹ ہے کہ جیسے ان پرانے اوہامی خرافات پارینہ میں بھی کہنے والے آج بھی مانتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ''حقیقت'' کے دھوکے بھی مخفی تھے۔ میں مانتا ہوں کہ آج بھی جو کچھ پھیلایا جارہا ہے اس کی بھی کچھ نہ کچھ ایسی ''بنیاد'' ضرور ہے جس کی تجربے سے تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن سوال اس خفقانی دور سے ہے جس کی بہ دولت راستے کی ہر گری پڑی رسی سانپ بن کو لوگوں کے سامنے لہرانے لگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سانپ سے بھی راستوں کے چلنے والے دوچار ہوجاتے ہیں، لیکن ہر رسی کو دیکھ کر اسی طرح بھاگنا جیسے سانپ کو دیکھ کر آدمی بھاگتا ہو، دماغی خبط کے سوا بتایا جائے کہ اسے آخر اور کیا باور کیا جائے؟ ایک ہی ارادہ، ایک ہی حکم، ایک ہی اذان، ایک ہی فعل کا یہ نظام محکم جس کا نام عالم ہے، انتشاری کثرتوں کی بکھری ہوئی دنیا کی شکل جن لوگوں کے لیے اختیار کر چکا ہے۔ انتشار اور کیسا انتشار؟ گویا کائنات کیا ہے؟ ایک میدان ہے، جس میں بگٹٹ گھوڑے ادھر سے ادھر سرپٹ بھاگے جارہے ہیں، کوئی نہیں جانتا کہ کب، کہاں، کس کو اپنی ٹاپوں سے کچل کر رکھ دیں گے۔ ان کی جھپٹ میں کون کس وقت آجائے گا۔ حد ہے اس دماغی کوفت، اور ''ذہنی دکھ'' کی جس کے بھنبھل میں انسانی احساسات جھونک دیے گئے ہیں، کوئی مانے یا نہ مانے لیکن ہے یہ قدرت کے اسی ''شکنجہ'' کی گرفت کا نتیجہ، جس کا نام میں نے ''ایک یا ہر ایک'' رکھ لیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، چاہا گیا کہ ایک کا ڈر دلوں سے نکال دیا جائے، ابھی اس ایک کا ڈر پورے طور پر نکلا بھی نہ تھا کہ ہر ایک کا ڈر ان ہی دلوں میں گھس پڑا۔ ایک سے ڈرو ورنہ ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے۔ اس قانون کی زد سے بچ کر نکل جانے کی

صورت ہی کیا ہے؟ مخلوق پرستی کے اصنامی نظام کے زیر اثر اگلوں نے بھی یہی کیا تھا اور اب جو خالق سے روٹھ کر مخلوقات ہی میں سب کچھ ڈھونڈ ھنے کا نیا سائنٹفک طریقہ جاری ہوا ہے، اس میں بھی یہی کیا جا رہا ہے اور جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کا نتیجہ بھی بھگتا جا رہا ہے۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ ''ایک'' سے بھی سر گرانیوں کا عارضہ پھیلا دیا گیا، لیکن ایک سے روٹھ کر ہر ایک کے منانے کی مہم سر کرنے کے لیے جو آمادہ ہوئے دیکھا جاتا ہے کہ کثرت کے اس بحر ناپیدا کنار میں وہ بھی اسباب وعلل کی چند کڑیوں کے بعد تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ آگے کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ''مجہول اعتماد'' کی مبہوتی کیفیت کے سوا خود ان ہی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو غریب پوچھنے والے کی تسلی وہ کیا کریں گے؟ حال آں کہ ایک کو جب چھوڑ ہی دیا گیا تھا تو ''ہر ایک'' کو قابو میں لائے بغیر اطمینان وسکون کی جو ضمانت بھی دی جائے گی وہ جھوٹی اور قطعاً جھوٹی ضمانت اور ان سائنٹفک ضمانت ہوگی اور یقین مانیے کہ اس ''ضمانت'' کے حاصل کرنے میں عقل وحواس والے نہ پہلے کبھی کامیاب ہوئے اور نہ آیندہ ہو سکتے ہیں۔

بہر حال اس قصے کو کہاں تک دراز کیا جائے؟ خلاصہ یہی ہے کہ ''خالق'' جس کا سب کچھ ہے اس کے ساتھ طوطا چشمیوں کی راہ کل اختیار کی گئی ہو یا آج بے باکیوں کی راہ اسی کے متعلق آج کھولی گئی ہو، نتیجہ اس باغیانہ طریقۂ کار کا ایک ہی رنگ میں چاہیے بھی یہی کہ سامنے آئے اور وہی سب کے سامنے آیا جو تماشہ عاد وثمود کے زمانے میں دیکھا گیا تھا۔ آسمان کبود کے نیچے آج بھی وہی نظارہ پیش ہے، تو اس کے سوا اور ہوتا کیا؟ میں نے تو صرف اشارہ کیا ہے، غور کرنے والے چاہیں تو ان اجمالی اشاروں کی روشنی میں تفصیلات کو خود سوچ سکتے ہیں۔ مگر آثار ونتائج کے اشتراک ویک رنگی کے باوجود اس کا اعتراف بھی واقع کا اعتراف ہوگا کہ ''مخلوق پرستی'' کا ''اصنامی قالب'' اور شرک قدیم کی جاہلی نوعیت یعنی ''بت پرستی'' کے پرانے فرسودہ مسلک کا ایک پہلو ایسا ''فکری مغالطہ'' بنا دیا ہے جس میں پھنس جانے کے بعد گلو خلاصی کا مسئلہ پہلے بھی کافی دشوار ثابت ہوا ہے اور آج بھی اس کی نہ سمجھنے والی پیچیدگیوں کی گرہ کشائی آسان نہیں ہے۔

باب ہفتم:

خالق سے بے اعتنائی اور اس کے مہلک نتائج

میرا مطلب یہ ہے اور بار بار ذکر کر چکا ہوں کہ خالق سے بے اعتنائی ولاپروائی کا رویہ اختیار کر کے ''مادّیت'' کی ''عصری ذہنیت'' میں مخلوقات کے ساتھ عقلی رشتہ چوں کہ قایم کیا جاتا ہے، اس لیے قدرتاً مذہبی جذبے کا جو رجحان انسانی فطرت میں پایا جاتا ہے وہ ان کے یہاں بے کار اور معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ صحیح ہو یا غلط کسی قسم کا کوئی کام اس جذبے سے نہیں لیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ''بت پرستی'' کے پرانے مسلک میں حسی اور عقلی قوتوں کے ساتھ ساتھ مخلوقات ہی کی طرف ''مذہبی جذبہ'' کا رخ بھی پھیر دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر اپنی شنوائی کی قوت کوئی اگر بے کار بنا لے اور رنگ روشنی جیسی چیزوں کے لیے بینائی کو قوت جو بخشی گئی ہے ان ہی کے دیکھنے اور جاننے میں اپنی بینائی کی اس قوت کو خرچ کرتا رہے تو شنوائی کے فواید سے محرومی کے ساتھ ساتھ کوئی وجہ نہیں کہ قوت بینائی کے فواید سے مستفید و متمتع نہ ہو۔ مادّیت کے دور جدید میں مذہبی جذبے کے تعطل اور بے کاری کے باوجود حسی اور عقلی قوتوں سے کافی فایدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ آخر کانوں میں اپنے جو ڈاٹ کس دے گا اس کے کان ہی تو بند ہوں گے، آنکھیں جب اس کی کھلی ہوئی ہیں اور دیکھنے کا کام ان سے لے رہا ہے تو بینائی کے منافع سے وہ محروم ہی کیوں رہے گا؟ لیکن مخلوق پرستی کے مسلک قدیم اصنامیت کے دور میں جو کچھ کیا جا رہا تھا یا اس وقت تک کرنے والے اس راہ میں جو کچھ کر رہے ہیں ان کی مثال گویا اس شخص کی ہے جو آنکھوں کے ساتھ ساتھ چاہتا ہو کہ کانوں سے بھی دیکھنے ہی کا کام لے اور اسی فیصلے یا ارادے کے زیر اثر کپڑوں کو کان سے رگڑ رگڑ کر پتا چلانا چاہے کہ وہ سرخ ہیں یا سبز، سفید ہیں یا سیاہ؟

الغرض بت پرستی یا شرک کی ''جاہلی ذہنیت'' میں مخلوقات ہی کی طرف ''مذہبی

جذبہ'' کا رخ جو پھیر دیا جاتا تھا یا آج بھی کرنے والے یہی جو کر رہے ہیں اس طرزِ عمل کے چند خطرناک اور مہلک نتائج میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

① سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ قدرت نے جس مقصد اور غرض و غایت کے لیے جس چیز کو پیدا کیا ہے، مثلاً کان سننے کے لیے دیے گئے ہیں، اب کوئی بجائے سننے کے دیکھنے کی کوشش میں شنوائی کی قوت کا تجربہ اگر کرے گا، اس تجربے میں لاکھ ہاتھ پاؤں مارے، رُپوں کی ندیاں ہی کیوں نہ بہادی جائیں، کچھ بھی خرچ کر ڈالا جائے، لیکن قدرت کے قانون کو کیسے بدل دیا جائے گا۔ شنوائی کی قوت کا جو کام ہی نہیں ہے وہ کام اس سے کیسے لیا جا سکتا ہے؟

اب دیکھیے مذہبی جذبے کی کمند تو آدمی کی جبلت میں ''یزداں گیری'' کے حوصلے کی تکمیل کے لیے بچھائی گئی ہے، یعنی خالق کی جستجو اور تلاش، قرب اور نزدیکی کا کام ''مخلوق انسان'' اس سے لے اور یوں باوجود مخلوق ہونے کے ''خالق'' تک رسائی حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو، ودیعت ہی کیا گیا ہے۔ آدمی کی فطرت میں مذہب کا یہ جذبہ اسی نصب العین تک پہنچنے اور پہنچانے کے لیے، اس کا حقیقی مقصد اور بالذات غرض یہی اور فقط یہی ہے۔ اب اسی جذبے کے رخ کو مخلوقات کی طرف پھیر کر ان ہی مخلوقات کے نفع بخش پہلوؤں سے مستفید ہونے یا ضرر رساں پہلوؤں سے بچنے کی کوشش کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جو اب تک ہوتا رہا ہے؟ اس تجربے کی راہوں پر کون بتا سکتا ہے کہ اپنی پیشانیوں کی گاڑھے پسینوں کی کمائی ہوئی آمدنیوں کا کتنا بڑا ذخیرہ آدم کی اولاد انتہائی بے دردیوں کے ساتھ برباد کر چکی ہے اور برباد کرتی ہی چلی جاتی ہے۔ دودھ ہی کی اس مقدار کو دنیا کے کس ترازو میں تولا جا سکتا ہے جو اب تک ان ہی سنگی مجسموں اور برنجی و آہنی مورتیوں کے قدموں پر بہایا گیا اور اس طور پر بہایا گیا کہ نہ ایک قطرہ اسی دودھ کا آدم کے بچوں کے حلق تک واپس ہوا اور کسی دوسری شکل میں بھی اس کا کوئی نتیجہ بہانے والوں ہی کے سامنے آیا اور نہ کسی دوسرے آدمی کو اس کا نفع پہنچا۔

اور ایک دودھ ہی کیا نذر و نیاز، منّت اور چڑھاوے کے ناموں سے جنس اور نقد کی شکلوں میں جو کچھ اب تک ان راہوں میں برباد ہو چکا ہے نہیں کہا جا سکتا کہ کتنی ہزار صدیاں اس کو روزی بنا کر آدم کی اولاد جی سکتی تھی، لیکن آدمی کے بچوں کے ہاتھوں میں آجانے کے بعد ان کے منہ سے سب کچھ چھین لیا گیا اور اس طور پر چھین لیا گیا کہ ان کا کوئی ثمرہ کسی زمانے میں خواہ کسی شکل میں ہو، کسی کے سامنے کبھی نہیں آیا۔ تماشہ یہ ہے کہ دیکھنے والے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں کہ کمائی ہوئی دولت انسانوں کی لاحاصل طور پر لٹ رہی ہے، لٹائی جا رہی ہے، لیکن کوئی زبان بھی اس کے خلاف ہلا نہیں سکتا اور وقت، انرجی کا جو ذخیرہ لاحاصل بن بن کر ان ہی راہوں میں ضایع ہوا بلکہ انسانی جانوں تک کو بھیٹ چڑھانے والوں نے بھینٹ چڑھایا اس کا ماتم کس سے کیجیے؟

④ واقعہ یہ ہے کہ خالق سے کنارہ کش ہو کر مخلوقات ہی میں استغراق! عرض کر چکا ہوں یہی بے دینی کی روح ہے۔ امریکہ و یورپ والوں کی لادین زندگی کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ خالق سے بے گانہ ہو کر مخلوقات ہی کے ساتھ وہ چمٹے اور چپٹے ہوئے ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ بت پرستی کا مسلک اپنی معنویت کے لحاظ سے دین نہیں بلکہ بے دینی کی روح کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ بار بار عرض کر چکا ہوں کہ یورپ و امریکہ کی جدید مادی مشرکانہ ذہنیت ہی کا ''اصنامیت'' یا ''بت پرستی'' ایک پرانا بھدا چولا ہے، یعنی خالق سے بے گانگی اختیار کر کے مخلوقات کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود بے دینی کے ہر بت پرست اپنے آپ کو پکا دین دار یقین کرتا رہا ہے۔ آج تک اسی یقین پر اس طبقے کا اصرار اس وقت تک قایم اور پوری قوت کے ساتھ قایم ہے۔ مغالطے کا منشا یہی ہے کہ ''مذہبی جذبہ'' کے سارے عملی مظاہر، عبادت و دعا، ذکر و فکر، پوجا پاٹ، پرارتھنا اور پرستش، جپ تپ یہ ساری چیزیں ان کی زندگی کے لازمی عناصر بنے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا ''مذہبی جذبہ'' بجائے تعطّل اور بے کاری کے قطعاً زندہ اور بیدار رہتا ہے۔ فخر کے

ساتھ سینے تان کر مذہب اور دین سے اختلاف ہی کیوں نہ ہولیکن بہر حال وہ بھی تسلیم ہی کرتے ہیں کہ بت پرست یورپ وامریکہ کی مادی ذہنیت رکھنے والوں کی طرح لامذہب اور بے دین تو نہیں ہیں، بلکہ مذہبی طبقات ہی میں شمار ہونے کا وہ جایز حق رکھتے ہیں۔

یہی ایک ایسا ذہنی الجھاؤ اور فکری سرسام ہے جس کی وجہ سے بے دینی نظر آتی ہے کہ دین داری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بھوک اور پیاس کی کیفیت آدمی میں اس لیے رکھی گئی ہے کہ حرارت غریزی سے بدن کے جواجزا تحلیل ہوتے ہیں ان کا بدل نئی غذا اور نئے پانی سے فراہم کیا جائے۔ اس لیے آدمی کھانا بھی کھاتا ہے اور پانی بھی پیتا ہے، لیکن بجائے روٹی کے جو سنکھیا کی ڈلی اپنے منہ میں پھوڑ رہا ہو اور پانی کی جگہ ہلاہل کا پیالہ چڑھا رہا ہو اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کے فطری تقاضوں کی تعمیل وہ بھی کر رہا ہے۔ لیکن نتیجہ ہی بتائے گا کہ ان فطری تقاضوں کے غلط استعمال کا انجام کیا ہوگا؟ بدن کے تحلیل یافتہ اجزا کا بدل مہیا ہوا یا تحلیل پانے کے بعد بچے کھچے عناصر بھی بدن کے خشک ہو کر ختم ہو گئے؟ یقیناً سنکھیا کھانے اور زہر ہلاہل کا شربت پینے سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ بھوک اور پیاس کے تقاضوں ہی سے ایسا آدمی بہرا گونگا بن جاتا جو نہیں کھا رہا ہے، نہیں پی رہا ہے۔ اس کے متعلق تو یہ امید ہو سکتی ہے کہ آخر کب تک؟ فطرت کے تقاضوں کو کب تک جھٹلائے گا؟ بھوک اور پیاس کے اندرونی مطالبے بہر حال اسے بے چین کر کے رہیں گے۔ ہر پھر کر اسے کھانا بھی پڑے گا، لیکن جو کھا ہی رہا ہو خواہ سنکھیا ہی کیوں نہ کھا رہا ہو، جو پی ہی رہا ہو خواہ زہر کا پیالہ ہی کیوں نہ پی رہا ہو، بھلا اس کو کھانے اور پینے کا مشورہ کیسے دیا جائے؟ اور کیا دیا جائے؟ بت پرستی میں ''مذہبی جذبہ'' خوابیدہ نہیں بلکہ بیدار اور قطعاً بیدار، زندہ جیتا جاگتا رہتا ہے، مگر اس جذبے کے استعمال کا جو قدرتی طریقہ ہے اور جس کام کے لیے یہ جذبہ آدمی میں پیدا کیا گیا ہے اس پیدائشی مقصد سے ہٹا کر اس جذبے کے استعمال کو غلط کر دیا گیا ہے۔

(۳) غلط ہی نہیں بلکہ بجائے خالق کے الٹ کر ''مخلوق'' کے ساتھ اس جذبے کا رشتہ قایم کر کے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی جاتی ہے کہ اونچا کرنا اور اوپر چڑھانا یہی کام جس جذبے کا تھا اسی کے بل بوتے پر آدمی اپنے خالق و مالک کے قدموں تک پہنچ سکتا تھا۔ جب مخلوقات ہی کے ساتھ اسی جذبے کو الجھا دیا جاتا ہے تو بجائے چڑھانے کے انسانی فطرت کی یہی قوت محرکہ یا اس کا یہی اندرونی رجحان آدمی کو گھسٹتے ہوئے گراتا ہی چلا جاتا ہے۔ خالق جو ایک ہے، اس سے ڈر کر مخلوقات ہی کے ساتھ مذہبی جذبے اور دینی میلان کے رشتے کے جوڑنے کی راہ جب کھول دی گئی تو مخلوقات کی بھلا کوئی حد ہے یا انتہا؟

مذہبی جذبے کے استعمال کا یہ تجربہ، ناکام تجربہ چند مخلوقات ہی تک پہنچ کر کیسے ختم ہو سکتا تھا؟ اس مخلوق سے نہیں تو شاید اس مخلوق سے، یہاں نہیں تو وہاں کی مخلوق سے شاید کام نکل جائے۔ اس گھن چکر میں پھنس جانے کے بعد جن بھول بھلیوں میں آدمی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے، اسے کھانا ہی چاہیے۔

بت پرستی کی تاریخی روداد بتا رہی ہے کہ اس راہ میں آدمی پھسلتا اور بھٹکتا ہی چلا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''خالق'' سے ہٹا کر جب کبھی ''مذہبی جذبے'' کو مخلوقات کے ساتھ وابستہ کیا گیا تو پھر قدرت نے کسی نقطے پر ان ہٹنے والوں کو شاید تکنے نہ دیا۔ ٹھوکروں پر ٹھوکریں تھیں، جو مسلسل لگتی ہی چلے جاتی تھیں۔ اس کا متعین کرنا تو دشوار ہے کہ پوجنے والوں نے سب سے پہلے خالق کو چھوڑ کر کس ''مخلوق'' کو پوجا۔ کس مخلوق کے آگے آدمی نے اپنا سر نیاز پہلی دفعہ خم کیا؟ لیکن تاریخ کی شہادت بھی یہی ہے اور آج بھی یہی ہے اور آج بھی دیکھا جا رہا ہے کہ ملائکہ، شیاطین، جن، انس، حیوانات، نباتات، جمادات، عناصر، سیارے اور ستارے الغرض سارے علویات وسفلیات کو آدمی کے معبود بننے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔ واقعہ جس شکل میں پیش آیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ '' ۔ پر کِک (ٹھوکر) لگاتے ہوئے قدرت کا انتقامی قدم ایک درجے سے گرا کر دوسرے درجے پر اور دوسرے سے

تیسرے درجے پر مخلوق پرستوں کو پٹکتا ہی چلا گیا۔ اللہ اللہ آنکھوں نے اس راہ میں کیا کیا نہیں دیکھا؟ آدمی نے آدمی کو پوجا، وہاں سے بھی دھکا پاکر نیچے گرا، دیکھا گیا کہ جانوروں کی ٹانگوں کے آگے ہی منہ کے بل وہی آدمی پڑا ہوا ہے۔ گھوڑوں، گدھوں، بیلوں اور ہاتھیوں، بندروں، اور ریچھوں، لنگوروں اور بھیڑیوں، سانپوں اور بچھوؤں کے سامنے آدم کی اولاد سر بہ سجود ہے۔ بات اسی نقطے پر پہنچ کر ختم نہیں ہوگئی! لگانے والے نے اور ٹھوکر لگائی، پایا گیا کہ نباتات کی جڑوں کے نیچے بھی وہی غریب آدمی لوٹ رہا ہے اور اس پر بھی وہ نہ ٹھہرایا، شاید نہ ٹھیرایا گیا، پھر جو نہ سنتے تھے اور نہ دیکھتے تھے نہ ان میں کسی قسم کا احساس تھا، ان کے آگے یہی سننے والا، دیکھنے والا، سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان، کیسی عجیب بات اور کتنا حیرت انگیز، دردناک نظارہ تھا کہ اپنے ہاتھوں کو جوڑے بھیک مانگنے کے لیے کھڑا ہوا ہے، دریاؤں کے آگے، پہاڑوں کے آگے، پہاڑوں کی چٹانون کے آگے، سورج کے آگے، چاند کے آگے اور میں کیا کیا بتاؤں کن کن کے آگے دست سوال دراز کیے ہوئے اسی اشرف المخلوقات کو دیکھنے والوں نے کیا نہیں دیکھا ہے یا آج بھی کیا نہیں دیکھ رہے ہیں؟ خالق سے کٹ جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے "انسانیت" لٹ گئی، اس کی آبرو لٹ گئی، اس کا مقام ڈھ گیا۔ اپنے پیدا کرنے والے سے کٹ جانے والوں کی قسمت میں ٹھوکروں پر ٹھوکروں، دھکوں پر دھکوں کے سوا شاید اور کچھ باقی نہیں رہتا جو اسی طرح دیکھتے ہیں، بلکہ بسا اوقات ان میں دور دور کی کوڑیوں تک کے لانے والوں کو پایا اور دیکھا گیا، اسی سے تو سمجھ میں آتا ہے کہ شاید مکافات و مجازات کے حقیقی مظاہر کے ظہور سے پہلے قدرتی انتقاموں کی یہ پرچھائیاں ہیں جو خاکی زندگی کے اسی عبوری دور میں ان انسانیت سوز رسوائیوں کے بھیس میں ان لوگوں کے آگے آتی رہی ہیں جو اپنے پیدا کرنے والے کے آستانے کو چھوڑ کر وہی جس کا سب کچھ ہے ان مخلوقات کی طرف دوڑ پڑے، جن کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ اس حد تک یعنی خالق سے بے گانگی اور مخلوق میں استغراق

کی حد تک کہہ چکا ہوں کے شرک کے پرانے اور نئے مجرم دونوں ہی برابر ہیں، بلکہ کائنات کی آفرینش و پیدائش کے کام کو خدا کی طرف منسوب کر کے زندگی کی عام ضرورتوں اور حاجتوں میں خود اپنے آپ کو اپنی بیرونی اور اندرونی صلاحیتوں کو کافی ٹھہراتے ہوئے حق سبحانہ وتعالیٰ سے بے نیازی کے خیال، خام خیال کو جو اپنے اندر پکاتا ہے اس حد تک تو شرک ہی کے جرم کا مجرم وہ بھی ہے۔ آخر خود وہ بھی تو خالق نہیں مخلوق ہی ہے۔ بتایا جا چکا ہے کہ اس مشرکانہ ذہنیت کے تسلط ہی کے ساتھ آدمی کا وجود زمین کی پشت کا ایک ایسا لایعنی، لاحاصل، ناکارہ بوجھ بن کر رہ جاتا ہے کہ اس فکری آفت میں مبتلا ہونے والے لاکھ سوچیں، کچھ بھی کر گزریں، لیکن یہ بات کہ ان کا وجود ان کے عدم سے بہتر ہے۔ دنیا کی کوئی منطق اس دعوے کے ثابت کرنے میں ان کی مدد نہیں کر سکتی۔

جس نصب العین کی تکمیل کے لیے پیدا کرنے والے نے آدمی کو پیدا کیا ہے جب تک وہی نصب العین سامنے نہ آجائے اس سوال کا یعنی آدمی کس لیے پیدا کیا گیا ہے؟ جواب نہ اب تک کسی کو ملا ہے اور نہ آئندہ مل سکتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اپنے وجود کے اس قدرتی نصب العین کو گم کر دینے کے ساتھ ہی یہ واقعہ ہے کہ عفونتوں اور غلاظتوں کے مقابلے میں بھی آدم کی اولاد بے قیمت ہو کر رہ جاتی ہے، جن سے اور کچھ نہیں تو کھیتوں میں ڈال کر کھاد ہی کا کام لیا جا سکتا ہے اور لیا جاتا ہے۔ کھاد ہی کی شکل میں سہی اپنے وجود کا فائدہ اپنی قدر و قیمت کو وہ بھی ثابت کر کے تو رہتی ہیں، پہلے بھی اس پر کافی بحث کر چکا ہوں۔

بہرحال حق یہی ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رسوائیوں اور خواریوں کی شکار انسانیت جیسے پرانی مشرکانہ ذہنیت یعنی مخلوق پرستی کے دور میں ہوگئی تھی آج بھی جدید مادی تہذیب میں ذلت و پستی، بے قدری و لاحاصلی کا یہ داغ، سیاہ داغ اس کی پیشانی سے نہیں مٹا ہے۔ آخر کائنات کی صفوں میں سب سے زیادہ بے قیمت، بے نتیجہ، لاحاصل بن کر رہ جانا، حقارت و ذلت، خواری اور رسوائی کے سوا اسے اور کیا سمجھا

جائے؟ کوئی شبہ نہیں اور اسے ماننا ہی چاہیے کہ اس حد تک شرک قدیم ہو یا جدید دونوں ہی کا حال کچھ ایک سا ہے۔ لیکن بہ ایں ہمہ اشتراک و یک رنگی معاذ اللہ انسانی شرافت و کرامت کے چہرے کی وہ سیاہیاں جو ''مخلوق پرستی'' کے ہاتھوں پھیری گئیں وہی جس کی بہ دولت گویا ساری مخلوقات اور ساری کائنات ہی کو حق حاصل ہو گیا کہ آدمی کے معبود اور ''الہ'' بن جائیں اور بن جائیں کیا معنی؟ ان میں کون سی چیز ایسی باقی رہ گئی ہے جس کی بندگی کا پٹہ آدم کے بچوں کے گلے میں نہیں بندھ چکا ہے یا اس وقت تک نہیں بندھا ہوا ہے؟ اف! جوان سب میں اونچا، سب سے بڑا، سب سے مکرم، سب سے زیادہ محترم و گرامی عزت والا تھا وہی سب کے نیچے جا پڑا۔ ساری کائنات ہی گویا اس پر چڑھ بیٹھی، سب ہی، آقا کیا باضابطہ رب اور معبود بن گئے اور انسانیت کے نیچے جھکی ہوئی، پسی ہوئی ''انسانیت'' کراہتی رہی اور اس وقت تک کراہ رہی ہے۔ قرآن کی سورۂ تین کی آیتوں یعنی:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍO ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ. (سورۂ تین:۴،۵)

''یہ واقعہ ہے کہ پیدا کیا ہم نے آدمی کو سب سے اچھے قالب میں، پھر پلٹا دیا ہم نے اسی آدمی کو اس طور پر کہ سارے نیچوں میں سب سے زیادہ نیچے وہی ہو گیا۔''

کا مطلب لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ لیکن آگے جو خبر دی گئی کہ ایمان اور عمل صالح والوں کے سوا سب ہی اس حال میں گرفتار ہوئے یعنی سارے نیچوں کے نیچے ہو گئے۔ اپنا خیال تو اس کی روشنی میں اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ جو واقعہ پیش آ چکا ہے آنکھوں سے جو کچھ دیکھا جا رہا ہے یہ اسی کی تصویر ہے۔ شرک کے دور قدیم میں بھی اس کا تماشا کیا گیا تھا اور نئے مادی چولے میں شرک کی اس ''ذہنیت'' نے آج یورپ و امریکہ سے جو سر نکالا وہ بھی ''انسانیت'' کو اسی دردناک انجام تک تقریباً پہنچا چکی ہے۔ کم از کم آدمی کا وجود سب سے زیادہ بے قیمت بن کر تو رہ ہی گیا ہے، بلکہ دوسری جگہ یعنی سورۃ الحج میں

جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ

مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ
اَوْ تَهْوِىْ بِهِ الرِّيْحُ فِىْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ○ (سورۂ حج:۳۱)

''اللہ کے ساتھ جو بھی کسی کو شریک بناتا ہے، ایسا سمجھو کہ گویا وہ آسمان سے چکرا کر گر پڑا، پھر (بیچ ہی میں) کسی پرندے (باز، بحری وغیرہ) نے اس کو اچک لیا یا گراتے ہوئے آندھی اسے دور دراز جگہ میں (اڑائے) لیے چلی جاتی ہو۔''

آپ دیکھ چکے کہ مادّیت کے جدید مشرکانہ رجحان میں آدمی کا وجود کیا عدم کے برابر نہیں ہو جاتا؟ یقیناً ایسی ہستی کی شکل وہ اختیار کر لیتا ہے جس کے ساتھ کسی قسم کا مفاد کسی کا وابستہ نہیں ہے۔ اپنے پیدا کرنے والے خالق کے لیے ہے؟ نہیں! اور مخلوقات میں بھی کسی کو انسانی وجود کی ضرورت نہیں۔ ایسی صورت میں نظام کائنات کے اندر ایک ایسی حیثیت اس کی ہو جاتی ہے کہ رہے تو کیا اور نہ رہے تو کیا۔ ہمارے زمانے کی جدید نئی مشرکانہ ذہنیت کا یہ قدرتی منطقی نتیجہ ہے۔ مطلب جس کا یہی ہوا کہ وہ کچھ باقی نہ تھا، اس کا بود نابود کے ہم معنی ہو کر رہ گیا۔ بار بار اس مسئلے کو دہرا چکا ہوں کہ دوسرے تو دوسرے، آدمی کے حافظے سے خود اپنی یاد کا چراغ اس ذہنیت کے شکار ہونے کے ساتھ ہی بجھ جاتا ہے۔ گویا اپنے آپ ہی کو آدمی کا حافظہ اس طور پر نگل جاتا ہے کہ اگلوانے کی لاکھ کوشش کی جائے تو وہ اس کو اگل ہی نہیں سکتا، جب تک کہ وہی یاد نہ آجائے، جس کی یاد کے لیے آدمی پیدا کیا گیا ہے۔ الغرض بے مقصد ہو کر ''انسان'' اس زمانے میں جو کھویا گیا ہے سمجھا جائے تو ''فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ'' (سورۂ حج:۳۱) (اچک لیا اس کو پرندے نے) کے الفاظ میں ''شرک جدید'' کے اس منطقی نتیجے کا اشارہ شاید ہم پا سکتے ہیں۔ شکاری پرندے باز، بحری، جرے یہی تو کرتے ہیں۔ اڑتی ہوئی چڑیوں کو ہوا سے اچک لیتے ہیں۔ ان کے پوٹوں میں پہنچ کر چڑیوں کا وجود عدم کی شکل اختیار کر کے گم ہی تو ہو جاتا ہے! سوچیے شرک کے جدید مادی رجحان میں اس کے سوا

''انسانیت'' کا انجام اور کیا ہوتا ہے؟ باقی ''مشرکانہ ذہنیت'' کا دوسرا نتیجہ کہ آندھی گراتے ہوئے دور دراز مقام کی طرف لیے، اڑائے لیے چلی جاتی ہے۔ یعنی اَوْتَھْوِیْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ مَکَانٍ سَحِیْقٍ. (سورۂ حج:۳۱) مخلوق پرستی میں مبتلا ہونے کے بعد جو بپتا آدم کی اولاد پر پڑی آپ دیکھ چکے کہ اس کی یہ کتنی سچی تصویر ہے۔ خالق کی بندگی اور عبادت سے اکتانے کے بعد اسی مخلوق کو جاہلیت والے قدیم شرک میں معبود اور الہ جب بنالیا گیا تو آدمی کی پیشانی کے لیے پھر کوئی ''قرار گاہ'' میسر آئی؟ خالق سے آدمی کٹا اور پٹھا، پھر دیکھیے کنے سے اکھڑ جانے والی پتنگ کی طرح ''انسانیت'' کے لیے غوطوں کے بعد غوطوں کے سوا اور بھی کچھ دیکھا گیا؟

بتا چکا ہوں کہ کس طرح ایک زینے سے لڑھک کر دوسرے پر، دوسرے سے تیسرے پر یوں ہی نہ ختم ہونے والے سیڑھیوں کے ڈنڈوں پر قلابازیاں کھاتے ہوئے وہ لڑھکتی ہی چلی گئی!

سچ ہے کہ مشرک آسمان سے چکرا کر گرتا ہے، پھر بیچ ہی میں بے چارا کھو کر گم ہو جاتا ہے یا مخلوق پرستی کے عارضے میں مبتلا ہو کر پٹخنیاں کھاتے ہوئے گرتا ہے، گرتا چلا جاتا ہے اور گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اسی کے اندر سے ''شرک'' کی آندھی اٹھتی ہے، وہ اسے اڑائے لیے چلی جاتی ہے۔ بس ''شرک'' کا خواہ پرانا رنگ ہو یا نیا، ہر حال میں تباہی و بربادی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہ پہلے سامنے آیا اور نہ آج آیا، نہ آیندہ آئے گا۔

مگر بہ ایں ہمہ اپنے دل کی بات کو بھی کیسے چھپاؤں! میرا ایک ذاتی احساس ہے، آپ بھی سن لیجیے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرک کا باطنی وسوسہ دلوں میں جب کبھی پیدا ہوا تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ عموماً اس ذہنی وسوسے اور دماغی دغدغے کے بعد ''مخلوق پرستی'' کہیے یا ''بت پرستی'' اسی کو لوگوں نے اپنا خوش گوار قومی مشغلہ بنالیا۔

لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں ''نزول قرآن'' کے بعد شاید یہ پہلا موقع ہے کہ سرزمین یورپ کے باشندوں کے اندر درحقیقت شرک ہی کی خارشت کا تقاضا پیدا

ہوا، جس میں مبتلا ہونے کے بعد خالق سے بے اعتنائی کا رجحان یقیناً ان میں بڑھا اور بہت زیادہ بڑھا، بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ''عقلیت'' اور ''آزاد تنقید'' کا ذوق اور سلیقہ بھی غیر معمولی طور پر ان میں نشو ونما پاتا رہا اور اب تک پاتا رہا ہے، گویا ''ملکہ راسخہ'' کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ان کی اس عقلی اور تنقیدی مشق ومہارست کو دیکھتے ہوئے بہ ظاہر اس کی گنجایش باقی نہیں رہی ہے کہ ''مخلوق پرستی'' کے پرانے سبق کو وہ بھی اسی طرح دہرانے لگیں گے جیسے ''نزول قرآن'' اور ''ظہور اسلام'' سے پہلے ''خالق'' کو ناکافی ٹھہراتے ہوئے قوموں نے خدا ہی کی پیدا کی ہوئی مخلوق کو پوجا ہے۔ آخر کچھ بھی سوچا جائے لیکن کیا یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ یورپ وامریکہ کے باشندے، سانپوں بچھوؤں، کتوں اور بلیوں، بندروں اور لنگوروں کو پوجیں گے، ان کے آگے سر نیاز وعبودیت کو جھکائیں گے، پتھر کی تراشیدہ مورتیوں پر ملیدہ اور ریوڑیاں نہ سہی، چاکلیٹ اور لیمن جوس، کیک اور پیسٹریاں چڑھائیں گے؟ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو عقل انسانی کی رسوائیوں کی تاریخ کا شاید سب سے بڑا خرد گداز اور حد سے زیادہ دانش سوز یہ حادثہ ہوگا اور گویا یہ ماننا پڑے گا کہ بدیہی مشاہدات کے نتائج بھی جھٹلا دیے گئے، لیکن جب تک مشاہدات سے پیدا کیے ہوئے نتائج غلط ثابت نہیں ہوتے ہیں اس وقت تک بھلا یہ کون سوچ سکتا ہے کہ اپنی موجودہ عقلی اور تنقیدی مہارتوں کے ساتھ ''مخلوق پرستی'' کے عارضے کے یورپ وامریکہ کے باشندے اسی طرح شکار ہو جائیں گے جیسے ''قبل الاسلام'' نزول قرآن سے پہلے قومیں شکار ہوتی رہی ہیں۔

سوال یہ بھی ہے کہ فطرت کا یہ ''جبلی تقاضا'' جس کا نام ''مذہبی جذبہ'' ہے، اس کا انجام آخر کیا ہونے والا ہے؟

اس وقت تک تو نام نہاد، عیسائیت (کرسچینٹی) کلیسائی ہو یا غیر کلیسائی اسی کی دریدہ وبریدہ، کرم خوردہ جھول ان ممالک کے باشندوں پر پڑی ہوئی ہے۔ اسی طرح کچھ ''تھیوسوفزم یا سپر یچولزم'' وغیرہ جیسی کچی، ادھوری، ناقص راہوں سے بھی بری بھلی

کچھ خوراک ''جبلت'' کے اس تقاضے کو مل رہی ہے، اگر مجازی خوراکوں کا یہ سلسلہ بھی ان ممالک میں بند ہو گیا اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ان ہی لوگوں کی ''بے درد اور آزاد عقلی تنقید'' فریب کے اس ساز و سامان کو زیادہ دن تک لادے ہی چلی جائے گی، جیسے بہ مشکل اس گٹھری کو اب تک وہ اٹھائے ہوئے ہے۔ بس دیکھنے کا وقت وہی ہوگا جب فطرت کا مذہبی تقاضا قطعی تعطل اور حقیقی مفلوجیت کے جال میں آ جائے گا۔ باہر کی یہ ساری جھولیں اتر جائیں گی اور ادھر ادھر سے طفل تسلیوں کی جو صورتیں کبھی کبھی نکل آتی ہیں جب ختم ہو جائیں گی اور وہ بہر حال ختم ہو کر ہی رہیں گی، مذہب یا دین کے نام سے جو چیز ان کے یہاں پائی جاتی ہے یعنی عیسائیت! باطن سے اس کا بہت کم تعلق باقی رہا ہے، رسم و رواج، روایات اور ٹریڈیشن، کلچر وغیرہ جیسے الفاظ کے لفافوں میں اس کے بھرم کو چھپانے اور دبانے کی کوشش ظاہر ہے کہ کب تک کامیاب ہوگی۔ بس جب یہ سب کچھ نہ رہے گا، یہ لفافے پھٹ جائیں گے، مصنوعی ٹٹیاں ٹوٹ جائیں گی تو بہ ظاہر دو ہی صورتوں کا امکان ہے۔ یعنی تعطل و مفلوجیت کے بعد درحقیقت تربیت کا یہ جذبہ واقعی بے جان اور قطعاً مردہ ہو کر ہمیشہ کے لیے ختم اور فنا ہو جائے گا، لیکن اس مذہب کے اس رجحان اور دین کے اس میلان کو پیدا کرنے والے ہی نے آدمی کی جبلت اور فطرت کے خمیر میں اگر گوندھا ہے، اسی سرشت کو لے کر آدمی پیدا ہوا ہے جس کے قوام ہی میں دینی جذبے کا عنصر گھولا گیا ہے، تو یہ ناممکن ہے کہ ''انسانیت'' باقی رہ جائے اور اس کے فطری تقاضے ہمیشہ کے لیے مردہ بے جان ہو کر رہ جائیں۔ حیلوں حوالوں، دوسرے وقتی خوش کن مشاغل اور رنگینیوں میں منہمک رکھ کر یہ تو ہو سکتا ہے کہ آدمی کچھ دیر کے لیے بھوک اور پیاس جیسے تقاضوں سے بھی غافل ہو جائے۔ لیکن اندر کے کسی تقاضے اور مطالبے سے غفلت یا تغافل دوام و ثبات کی شکل اختیار کر لے، یہ ناممکن ہے۔

ان تقاضوں کے کلیتاً ختم ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی ہی باقی نہ رہے۔ حرارت اور روشنی، آگ کی فطرت کا خلقی تقاضا ہے۔ ان دونوں جوہری خصوصیتوں

کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی ظاہر ہے کہ کوئلہ رہ جائے یا چراغ کی بتی تو باقی رہ سکتی ہے، لیکن آگ کا وجود یقیناً ختم ہو گیا۔

پس ان قوموں میں مذہب کا یہ فطری تقاضا جب کبھی بیدار ہوا تو اس کا خطرہ یعنی ''خالق'' کی جگہ مخلوقات ہی کے گریبان میں اسی طرح لپٹ پڑے، جیسے پہلے لپٹا رہا ہے اور گھسٹتے ہوئے پھر ان ہی کنوؤں کو جھکوائے، جن کی تہہ میں بھی کنوؤں اور گندے حد سے زیادہ سڑے چہ بچوں ہی کا ناپیدا کنار سلسلہ ہے۔ کھائیاں اتھاہ کھائیاں، جن کا نہ اور ہے نہ چھور، ایڑیوں پر پھر ''انسانیت'' واپس ہوگی۔ انسانی نفسیات کے نبض شناسوں کے نزدیک آج یہ مسئلہ ناممکن قرار پا چکا ہے۔ پھر کیا ہوگا؟ اس کے سوا اور کیا کہا جائے جو کہنے والا کہہ کے جا چکا ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ!

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

(اقبال)

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زمین کے کس خوش قسمت حصے میں یہ واقعہ پیش آئے گا، مگر کچھ زیادہ دور نہیں ہے، اب وہ زمانہ کہ ''انسانی جبلت'' کا یہ فطری میلان اپنے پیدا کرنے والے خالق کو بھی ڈھونڈھے گا، اس کو ڈھونڈھے گا، اس کی مرضی کو ڈھونڈھے گا۔ اس کی مرضی اور یہ کہ اپنے بندوں سے واقعی وہ کیا چاہتا ہے؟ اس کی آگاہی، غیر مشتبہ آگاہی کی جو قدرتی راہ ہے اسی کو پا کر رہے گا۔ اسی راہ پر چڑھے گا، چلے گا اور آدمی کو جو کچھ ہونا چاہیے وہی ہو کر رہے گا۔ اسی منزل تک پہنچ کر دم لے گا۔

لیکن خدانخواستہ اگر ''تعطل تام'' کے بعد یعنی کسی قسم کی مجازی ہو یا غیر مجازی خوراک کے میسر آنے کے تمام ذرائع جب ختم ہو جائیں گے، اس کے بعد مذہب کا یہ رجحان اور دین کا یہ جذبہ یورپ و امریکہ کے باشندوں میں مردہ ہو کر رہ گیا تو پھر یہی حادثہ دلیل ہوگا اس بات پر کہ یہ جذبہ آدمی کا فطری اور جبلی جذبہ نہ تھا، بلکہ بیرونی موثرات کے زیر اثر کسی وجہ سے اتفاقاً مذہب کا یہ تقاضا دلوں میں پیدا ہو گیا تھا یا کرا دیا

گیا تھا، لیکن ایسا ہوگا بھی کم از کم ''مذہبی جذبہ'' کی چیرہ دستیوں کا جوتماشا انسانی تاریخ دیکھ چکی ہے، اس کا صحیح استعمال ہو یا غلط۔ لیکن ہلچل، غیر معمولی ہلچل اسی جذبے کی بہ دولت آدم کے گھرانوں میں جواب تک برپا رہی ہے یا اس وقت تک کسی نہ کسی شکل میں یہ ہنگامہ آج بھی جس طریقے سے گرم ہے، گرفت کی غیر معمولی طاقت سے دلوں پر جس رنگ میں یہ مسلط ہے، دماغوں پر چھایا ہوا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ زور اندر سے نہیں بلکہ باہر سے پیدا ہوا یا پیدا کر دیا گیا۔

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (سورۂ روم ۳۰)

''اللہ کی فطرت، اسی فطرت پر پیدا کیا ہے اللہ نے آدمی کو۔''

قرآن کی آیت ہے۔ کم از کم ایک مسلمان تو اس میں شک کرنے کے ساتھ ہی کچھ اور باقی رہے یا نہ رہے، لیکن مسلمان تو باقی نہیں رہ سکتا۔

بہر حال ہے تو یہ کچھ عجیب بات یعنی الحاد اور بے دینی کی ''انسانیت سوز آگ'' آج یورپ و امریکہ سے جو اٹھی ہے، بنی آدم کے بہی خواہوں میں جس سے کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ اس آتشیں سیلاب کے آیندہ عواقب و انجام کو سوچ سوچ کر سوچنے والے سہمے سہمے جا رہے ہیں، لیکن اسی آگ کے پیچھے دیدہ دلیری سمجھیے یا ایمانی فراست کہ میں دین ہی کے ہرے بھرے سرسبز اور شاداب باغوں کا خواب دیکھ رہا ہوں اور طرفہ لطیفہ یہ ہے کہ ایک طرف خالص بے دینی کے اس مغربی قالب میں ''صالح اور صادق دین'' کی تڑپتی ہوئی روح مجھے محسوس ہو رہی ہے اور دوسری طرف اسی کے مقابلے میں مذہب اور دین کا وہ مانا ہوا پرانا ڈھانچا جس کا نام ''مخلوق پرستی'' اور ''اصنامیت'' ہے، اس کے متعلق یہ خیال کہ باہر سے دیکھنے والوں کو دین کا مستقل نظام ہی کیوں نہ نظر آتا ہو، لیکن روح اس کی بھی وہی بے دینی ہے جس میں موجودہ مادی تہذیب نے آدمی کو مبتلا کر دیا ہے۔ حالاں کہ عام احساس یہی ہے کہ ''بت پرستی'' مذہب کی چاہے جتنی بگڑی ہوئی مسخ شدہ شکل ہو مگر ہے تو وہ دین داری ہی کا ایک چولا اور رنگ۔ مغربی الحاد اور دہریت کے سامنے سمجھنے والے جیسا کہ کہہ چکا ہوں کہ اس رنگ کو بھی غنیمت

ہی خیال کرتے ہیں، سمجھا یہی جاتا ہے کہ عبادت اور دعا، ذکر وفکر، نماز وروزہ وغیرہ جیسے مذہبی لوازم و آثار کا مضحکہ اڑانے والوں سے بہرحال وہ بہتر ہیں، جو مذہبی کاروبار کی ان شکلوں کو اب بھی احترام وعظمت ہی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، ان کی قدر و قیمت کے معترف بھی ہیں اور عملاً جو اس کاروبار میں مشغول ہیں ان کی اب بھی عزت اور کافی عزت ان کے قلوب میں پائی جاتی ہے۔ خواہ یہ سارے مذہبی کاروبار ''خالق'' نہیں بلکہ ''مخلوق'' ہی کے تعلق سے ان میں انجام دیے جاتے ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ نام تو جپتے ہیں۔

خالق کائنات کے ''اسماء حسنیٰ'' نہ سہی اس کی کسی مخلوق، مثلاً آفتاب و ماہ تاب وغیرہ کے ہم سر نام ہی سہی، بہرحال ان سے تو بہتر ہیں جو ''نام جپے'' یا ''ذکر'' کے اس طریقے ہی کو سرے سے مہمل اور احمقانہ فعل قرار دیے ہوئے ہیں۔

کچھ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ بجائے خوابیدہ اور معطل ومفلوج بنا کر چھوڑ رکھنے کے مذہب اور دین کے فطری تقاضے ان میں پیدا اور برسرکار تو ہیں۔ ''خالق'' نہ سہی ''مخلوق'' ہی کے ساتھ اپنے ذہنی میلان اور رجحان کا رشتہ قایم کر کے اس کو وہ چگاتے اور تروتازہ تو کرتے رہتے ہیں۔

بہ ظاہر یہ بات دل کو لگتی بھی ہے، لیکن آپ دیکھ چکے کہ غلط ہی نہیں بلکہ مذہبی جذبے کو بیدار کر کے ان کا الٹا اور قطعاً معکوس استعمال بھی تو وہ پھندا ہے جس نے دین کی روح کو شرک کے اس قدیم قالب میں گھونٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔

اس کا نتیجہ تو یہ ہوا کہ انسانیت کے عروج اور ارتقا کے لیے جو جذبہ اور تقاضا آدمی کی فطرت میں محفوظ کیا گیا تھا، چڑھانا، بلند کرنا اور اتنا بلند کرنا کہ خاکی انسان خالق قدوس کے قدموں تک جس کے دست و بازو کی مدد سے پہنچ کر دم لیتا تھا اور لے سکتا تھا، اس کی الٹی اور اوندھی گردش گراتے ہوئے اور ایک درجے سے اتار کر دوسرے درجے سے تیسرے درجوں پر پٹخنیاں دیتے ہوئے کہاں سے کہاں تک پہنچاتی رہی۔ مخلوقات میں جو سب سے اونچا تھا وہی سب سے نیچے پڑ گیا، سب کی

بندگی کا طوق اس کے گلے میں پڑ گیا۔ ''قدیم علم الاصنام'' یا دیو مالا کا مطالعہ ہی بتا سکتا ہے کہ جن باتوں کو آج ہم سوچ بھی نہیں سکتے، بہ ثبات عقل و ہوش کرنے والے انھیں کرتے رہے! آج سن کر بھی جن قصوں کے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے دیکھنے والے ان کو دیکھتے تھے اور دانش و خرد کا تقاضا ان کو یقین کرتے تھے۔ آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ گبریلے کیڑے تک کی بندگی کا حلقہ کانوں میں ڈالا گیا اور گبریلے ہی کیا، کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ خود گوبر اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی عبادت پر اسی آدمی نے فخر کیا اور اپنی آرزوؤں و تمناؤں کے پورے ہونے کی امیدیں ان ہی بے حس و بے ارادہ گری پڑی گندی چیزوں کے ساتھ باندھیں۔ اور بات اسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہوگئی! یہ سب چیزیں خدا نہ سہی خدا کی پیدا کی ہوئی تو ہیں، لیکن اس راہ میں گرتے پڑتے لڑھکتے، قلابازیاں کھاتے ہوئے، واقعہ یہ ہے کہ انسانیت انحطاط وزوال، تنزل اور پستی کے اس نقطے تک پہنچی کہ خود اپنے ہاتھوں کے کھودے ہوئے پتھروں کے آگے دیکھا گیا، دیکھا جا رہا ہے، آنکھیں بند کیے، دست بستہ دلوں میں آرزوؤں اور تمناؤں کے ہجوم کو لیے لوگ کھڑے ہیں اور ان کھودے پتھروں میں جنھیں ''اصنام'' اور ''مورتیاں'' کہتے ہیں پتھر کے نقش و نگار نہ سہی، خود پتھر تو خدا ہی کی پیدا کیے ہوئے ہوتے ہیں، صورت نہ سہی مادہ تو ان کا خدائی ہے، لیکن ان میں تو ایسوں کو بھی پایا گیا ہے جو پتھروں کی ان کھودی ہوئی مورتیوں اور بتوں کے پیچھے بے دیکھے بے سنے یہ فرض کرلیا کرتے تھے کہ کوئی ان دیکھی روح پوشیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ''ان دیکھی روح'' ان پوجنے والوں کے دماغوں کے سوا اور کہیں نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ تو ان کو اپنے آپ سے باہر فرض کرتے تھے، لیکن رہتی تھی وہ ان ہی کے اندر، اپنی خیالی قوت سے باہر خود ان کے پیدا کرنے والے بھی ان پوشیدہ روحوں کو نہ پاتے تھے نہ پا سکتے تھے۔ الغرض ان کی خیالی قوت اس ان دیکھی روح کو بھی پیدا کرلیتی تھی اور اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کرلیتی تھی کہ پتھر کی کھودی ہوئی کسی مورتی سے اس کا رشتہ ان کی اپنی تجویز اور خواہش کے مطابق قائم ہوجاتا ہے۔ جہاں کہیں جس وقت ان کا جی

چاہتا تراشیدہ پتھروں کے کسی ٹکڑے کو اپنی اسی مفروضہ خیالی روح کا نمائندہ فرض کر لیتے تھے۔ مطلب جس کا یہ ہوا کہ خدا ہی کے مخلوقات نہیں، بلکہ خود اپنے خیالی اور فرضی ''مخلوقات'' کا بھی آدمی بندہ اور بھکاری بنتا رہا ہے اور اب بھی کتنے ہیں جو اپنے خیال کی پیدا کی ہوئی اس قسم کی مخلوقات کی بندگی و نیازمندی کو اپنی سعادت اور خوش بختی کا سرمایہ باور کیے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری بے دینیاں ''دینی جذبہ'' کی بیداری ہی کی بہ دولت تو اسی لیے پیدا ہوئی کہ مذہبی رجحان کے چکے کا رخ بجائے اوپر کے اس کے بالکل برعکس نیچے کی طرف پھیر کر اس کو چالو کر دیا گیا۔ چکہ تو یقیناً گھومتا رہا اور پوری قوت سے گھومتا رہا لیکن بجائے چڑھنے کے ''انسانیت'' اسی کی ساتھ لپٹی ہوئی گرتی اور نیچے ہی کی طرف ڈھلکتی اور پھسلتی ہی چلی گئی۔

''مذہبی جذبے'' کی یہ بیداری جس میں بجائے چڑھنے کے ''آدمی'' نیچے ہی گرتا چلا گیا، گرتے ہوئے اپنی تیرہ و تار بھیانک اتھاہ کھائیوں میں پہنچ کر غوطے کھانے لگا ایسے دلدل میں جا کر دھنس گیا جس سے نکلنے کی ہر کوشش اسے دھنساتی ہی چلی گئی۔ دینی رجحانات کے اس جاگ سے یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ سلا ہی دیے جاتے۔ جیسے جدید مشرکانہ مادی ذہنیت میں حیلوں حوالوں اور طرح طرح کے مشغلوں کی تھپکیاں دے دے کر وہ سلا دیے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سوتوں کو تو جگایا جا سکتا ہے لیکن جاگنے والوں کو جاگنے کا مشورہ کیسے دیا جائے؟ سچ پوچھیے تو بت پرستی کی قدیم مشرکانہ ذہنیت اپنی اسی خاص صورت حال کی وجہ سے ایک ایسی گتھی بن گئی ہے جو سلجھانے سے اور زیادہ الجھ جاتی ہے۔ مذہبی جذبے کا یہ چکر اگر گردش میں نہ رہتا اور معطل کر کے اس کو چھوڑ دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ خسارے سے تو اس وقت بھی بچنے کی اگرچہ کوئی صورت نہ تھی جس ''مشین'' کی افادیت چالو کرنے ہی پر موقوف ہو اس کو بند کر کے نقصان کے سوا فایدے کی بھلا کوئی کیا امید کر سکتا ہے؟ لیکن اسی ''مشین'' کی الٹی گردش نے تو سارے کارخانے ہی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ خود اس کی اپنی ہی طاقت سے اسی کا ایک ایک پرزہ ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا ہے۔ سارے جوڑ بند اس کے

کھل گئے۔ خود ''مشین'' کے بھی پرزے اڑ گئے اور اس کی معکوس گردش کی لپیٹ میں جو چیز بھی آئی وہ بھی چور چور ہو کر رہ گئی۔ سب ہی کا بھونسا نکل گیا۔

تفصیل میں میں جانا نہیں چاہتا، لیکن اجمالاً کہہ چکا ہوں کہ ''مخلوق پرستی'' کے غلط تجربے کے پیچھے کون اندازہ کرسکتا ہے، کہاں کہاں کتنی انسانی نسلوں کا وقت، انرجی، مال، دولت بلکہ خون تک رائیگاں اور برباد ہوا۔ سوچنے کی اور بات ہے ورنہ مخلوق پرستوں میں کسی زمانے میں اس کا شعور اور احساس کہ جن جن چیزوں کو پوجتے ہیں ان کی طرف سے کسی قسم کا کوئی اخلاقی ضابطہ بھی ان پر عاید ہوتا ہے؟ اگر اس سوال کو اٹھایا جائے تو نفی کے سوا مشکل ہی سے اس کا جواب اثبات میں مل سکتا ہے۔

دیکھنے والے اس سلسلے میں جو کچھ دیکھتے رہے ہیں زیادہ سے زیادہ لے دے کر بس یہی ہے کہ نذر و نیاز، منّت اور چڑھاوے کے ناموں سے کچھ پیش کر کے فرض کرلیا جاتا ہے کہ ان کے معبودوں کے مطالبات کی تکمیل کر دی گئی۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے آج تک اس کا پتا نہ چل سکا، بلکہ ''علم الاصنام'' پر یورپین نقطۂ نظری سے بحث کرنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ساری اخلاقی کمزوریوں کو ان ہی معبودوں کی طرف منسوب کر کے لوگ ان کے ''جواز'' ہی کا پہلو پیدا کررہے ہیں۔ فن فریب سے کام لینے والے کہہ دیا کرتے ہیں کہ فلاں دیوتا نے بھی تو فلاں موقع پر فریب سے کام لیا تھا اور ایک فریب ہی کیا شاید ہی کوئی ''اخلاقی جرم'' ہوگا یورپ کے ان بحث کاروں کا بیان ہے کسی نہ کسی دیوتا کی طرف اس کو منسوب کر کے ''ضمیر کی آواز'' کے دبانے کا کام نہیں لیا جاسکتا ہے یا نہیں لیا گیا ہے۔ یہی تو میں بھی عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ دین ہی کا ڈھانچا سہی لیکن اندر اس کے بے دینی کے سوا ڈھونڈھنے والوں کو بھی کچھ نہیں ملا ہے۔

کچھ نہیں تو لوگوں کو اس پر غور کرنا چاہیے تھا کہ ''انسان'' اور ''انسانی فطرت'' کے ساری امکانات کی نشو و نما کو اپنی بحث کا موضوع بنا کر قرآن میں ہر شعبے پر جاننے والے جانتے ہیں کہ روشنی ڈالی گئی ہے اور جیسا کہ اس ''قدرتی کلام'' کا قاعدہ ہے کہ

اس سلسلے کے ''مبہمات'' کے متعلق بھی چند جامع و مانع لیکن اعجازی فقروں کو ہی دے کر حکم دیا گیا ہے کہ اسی ''قدرتی اجمال'' سے تفصیلات پیدا کیے جائیں۔ یہی حال قدرت کے کاموں کا بھی ہے۔ گویا رنگ اور جو حال ''قدرت کے کام'' کا ہے کچھ وہی رنگ ڈھنگ اس ''قدرتی کلام'' یعنی قرآن کا بھی ہے۔

عرض ہی کر چکا ہوں کہ شرک یا مشرکانہ ذہنیت کلیہ یا رنگ جو یورپ کی ''نشئت جدیدہ'' میں زیادہ شوخ اور گہرا ہو کر نگاہوں کے آگے نکھر گیا ہے، انسانی ذہن کی اس ''لغزش'' کی طرف بھی قرآن میں اشارے کیے گئے ہیں، لیکن انصاف سے پوچھتا ہوں کہ گھن گرج کا جو ہنگامہ شرک کے اصنامی نظام کے مقابلے میں اس کتاب میں پایا جاتا ہے، دون اللہ (یعنی اللہ کے سوا) مخلوقات کو ''الٰہ'' معبود بنانے کے جرم کو جتنی غیر معمولی اہمیت قرآن میں دی گئی ہے اسی قدیم مشرکانہ طریقۂ فکر اور طرز عمل کی سامنے ''مستقل محاذ'' قایم کر کے بار بار مختلف پیرایوں میں یہی مضمون اس کتاب میں اول سے آخر تک جس جس طریقے سے دہرایا گیا ہے کیا کسی دوسرے قرآنی مسئلے کو ہم اس کی نظیر بنا کر پیش کر سکتے ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ لوگ سوچتے نہیں اور سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ شاید قرآن کی ایک عادت قرار دے کر آگے نکل جاتے ہیں، لیکن ''انسانیت'' کو اس عجیب وغریب ''طریقۂ فکر'' اور ''طرز عمل'' سے حد سے زیادہ مہیب اور خوف ناک نقصانات خاکی زندگی کے اسی عبوری دور میں جو پہنچ چکے ہیں میرا تو خیال ہے کہ وہی ہر اس شخص کو بوکھلا دینے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں جس کے دل میں اپنے ابنائے جنس کا کچھ بھی درد پایا جاتا ہو اور وہی کچھ اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن کی تیوریاں اس فکری و عملی بغاوت کے مقابلے میں کیوں اتنی غیر معمولی طور پر چڑھی ہوئی ہیں۔ باقی جن خمیازوں کو آدم کی اولاد اس وقت بھگتے گی جب فکر و عمل کے نتایج مجسم بن کر سامنے آجائیں گے ہم اس وقت اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں جو قرآن ہی میں اطلاع دی گئی ہے۔ یعنی ہر نقصان کی تلافی کی کوئی نہ کوئی شکل زندگی کے اس ''دوامی دور'' میں بالآخر

نکل ہی آئے گی مگر ایک اور صرف یہی ایک انسانیت سوز جرم ہے جسے تلافی مافات کے اس عام قانون سے قرآن نے قطعاً مستثنیٰ کر دیا ہے۔ مشہور آیت ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ O (سورۂ نساء ۴۹)

''قطعاً اس جرم کو اللہ نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی (مخلوق) کو شریک ٹھہرایا جائے اور بخش دے گا اس کے سوا جس (جرم) کو چاہے گا۔''

ایک بڑا اہم مسئلہ یعنی عہد جدید کے لادینی رجحانات کا، کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ قدیم مخلوق پرستی ہی کی ایک ترمیم یافتہ شکل ہے جو نئے رنگ و روپ میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ درمیان میں اسی مسئلے کا ذکر چھڑ گیا۔ اجمالی اشارے ناکافی تھے اس لیے ذرا طول بیانی سے کام لینا پڑا۔ ورنہ اس وقت تک ''خالق و مخلوق'' کے تعلق سے دو ہی آئیڈیا لوجیاں روحانیت و مادیت آپ کی سامنے پیش کی گئی ہیں۔ مخلوق سے لاپروائی ہی نہیں بلکہ نفرت اور بے زاری کے شعور کو مسلسل مشتعل رکھتے ہوئے خالق ہی کے گیان دھیان جپ تپ، ذکر و فکر، طلب و جستجو میں ممکن حد تک زندگی بسر کرنے کی کوشش عرض کیا گیا تھا کہ اپنی خاص اصطلاح میں زندگی کے اس طریقے کا نام میں نے ''روحانیت'' رکھ لیا ہے۔ قرآن میں ''رہبانیت'' کے لفظ سے اس مسلک کو جہاں تک میرا خیال ہے روشناس کیا گیا ہے۔ ٹھیک اس کے عکس انسانی زندگی کا وہ قالب جس میں ''خالق'' کی طرف سے بے اعتنائی و بے نیازی کے رجحانات کو بڑھاتے ہوئے زندگی کی ساری ضرورتوں میں اپنی جد و جہد، کد و کاوش کا اساسی محور'' مخلوقات ہی کو ٹھہرایا لیا گیا ہے۔ اسی مسلک کا نام میں نے ''مادیت'' اس لیے رکھ لیا ہے کہ اس طریقۂ فکر کے زیر اثر جینے والوں میں اور ان لوگوں کی زندگی میں عملاً بہت کم فرق نظر آتا ہے جو واقعی فلسفے والی مادیت کے قایل ہیں۔ یعنی صراحۃً خدا کا انکار کر کے عالم اور عالم میں جو کچھ ہے سب کو اسی ''مادہ'' سے اگا لینے کی مضحکہ خیز کوشش میں مشغول ہیں، جس میں خود کچھ نہ تھا، نہ زندگی تھی، نہ علم تھا، نہ شعور تھا۔ کہتے ہیں کہ اسی

سے سب کچھ برآمد ہو گیا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ کتابی اور درسی حد تک انکار خدا والی یہ مادّیت، فلسفۂ مابعد الطبیعات کی ایک پرانی ویمقراطیسی دقیانوسی یادگار ہے۔ تعلیم گاہوں میں اب بھی اس کی آواز گشت کسی نہ کسی رنگ میں گونجتی ہی رہتی ہے، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں اس دماغی مرض نے عام وبائی شکل نہ پہلے کبھی اختیار کی اور نہ آج۔ کہنے والے خواہ کچھ ہی کہتے ہوں لیکن بنی آدم کی اکثریت کی طرف ''انکار خدا'' والی اس مادّیت کا انتساب افترائی جرأت کے سوا شاید اور کچھ نہیں ہے۔ بلکہ قصہ وہی ہے کہ کائنات کی تخلیق اور آفرینش کے کام کو خدائے حی وقیوم پر ختم کر کے آگے زندگی کی عام حاجتوں اور ضرورتوں میں ''مخلوقات'' ہی کو لوگوں نے ماویٰ و ملجا بنا لیا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ خدا یا خالق کو درمیان میں لائے بغیر سب کچھ ان ہی مخلوقات سے حاصل کر لیا جائے گا۔ یہی وہی قدیم ''مشرکانہ ذہنیت'' ہے جس کا شکار پرانی بت پرست قومیں ہوتی چلی آئی ہیں۔ بجائے ''مادّیت'' کے اسی لیے واقعہ تو یہی ہے کہ ''شرک'' کی قرآنی تعبیر ہی اس ''ذہنیت'' کو ظاہر کرنے کے لیے مناسب ترین تعبیر ہے۔ حقیقت کی صحیح ترجمانی ''شرک'' ہی کا لفظ کر سکتا ہے مگر تفہیمی سہولتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''روحانیت'' کے مقابلے میں ''مادّیت'' ہی کے لفظ کو میں نے اختیار کر لیا، جس سے اعتقادی نہیں بلکہ صرف ''عملی مادّیت'' مراد ہے۔ یعنی عملاً وہی سب کچھ وہ بھی کر رہے ہیں جس کی توقع انکار خدا والی ''مادّیت'' کے ماننے والوں ہی سے کی جا سکتی ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں؟ ''روحانیت'' اور ''مادّیت'' کے اس جھگڑے کو سوچیے! ان دونوں متخالف آئیڈیالوجیوں میں مصالحت کی کوئی صورت کس طرح سے کیا نکالی جا سکتی ہے؟ حال یہ ہے کہ ان میں ہر ایک مسلک کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہے کہ جس چیز سے توڑنے کا حکم ایک میں دیا جاتا ہے دوسرے میں ٹھیک اسی سے جوڑنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ ''روحانیت'' ہی کے سلسلے میں یاد ہو گا کھانے تک کے متعلق یہ مطالبہ کتابوں میں پایا جاتا ہے کہ جنگل میں اپنے بچے کے گوشت کھانے پر

گویا کھانے والا مجبور ہوا ہے ❶۔ بھوک کی تکلیف کے مٹانے میں ہر لقمہ اس احساس کے ساتھ حلق میں جہاں اتارا جاتا ہو وہاں مخلوقات سے بے زاری کا اندازہ کرنا چاہیے کہ کوئی حد بھی ہے؟ روحانیت کے اس مسلک میں ''مادّیت'' کے اس نقطۂ نظر کی گنجائش بھلا کیا پیدا ہو سکتی ہے؟ جس میں پیدا ہونے کے سوا چاہا جاتا ہے کہ سب کچھ ''مخلوقات'' ہی سے حاصل کر لیا جائے۔

الغرض توڑنے کی منفی کوشش اور جوڑنے کی مثبت کوشش کا تعلق ان دونوں آئیڈیالوجیوں میں ایسی دو مختلف چیزوں سے ہے کہ نہ توڑ ہی میں اشتراک کی کوئی جہت دونوں میں نکل سکتی ہے اور نہ جوڑ میں۔ نظریاتی جنگ کی یہ ایک ایسی شکل ہے جس کے متعلق ''صلح'' کا کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔ کہنے والے جو کہتے ہیں کہ دنیا اور دین دونوں کا جمع کرنا محال ہے۔ مراد ان کی دین سے شاید ''روحانیت'' کا یہی مسلک ہے۔ اگر یہی ہے تو دنیا اور دین کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کا ارادہ خیال ہو، محال ہو، جنون ہو یا اس کے سوا کچھ اور ہو، آپ سب ہی کچھ کہہ سکتے ہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ ایسی خطرناک جنگ جس پر ''صلح'' کے دروازے بند اور قطعاً بند ہیں۔ اس پر راضی ہو جانے کے بعد بھی ''روحانیت'' ہو یا ''مادّیت'' اپنی دوسری انسانیت سوز تباہیوں کے ساتھ ساتھ یہ عجیب بات ہے کہ ''کس لیے؟'' کے سوال کے حل میں دونوں ہی ناکامی و نامرادی ہی کے نتیجے تک پہنچ کر دم توڑ دیتی ہیں۔ شاید پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں۔ مطلب یہی ہے کہ انسان کے سوا کائنات میں جو کچھ ہے، روحانیت کے مسلک میں خالق کی کارفرمائیوں کے ان سارے مظاہر کو لاحاصل اور بے نتیجہ ٹھہرایا جاتا ہے۔ گویا کس لیے؟ کے سوال کے متعلق صرف انسانی وجود کے

---

❶ ہندوستانی رہبانیت کی تشریح کرتے ہوئے میں نے شاید پہلے بھی نقل کیا تھا کہ برتر کی تمنا کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ غذا سے نفرت کرے اور کچھ کھائے بھی تو اس احساس کے ساتھ کھائے کہ جنگل سے گزرنے والا مسافر اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے بچے کا گوشت کھا رہا ہو۔

(''ہندی فلسفہ'' ڈاکٹر گپتا مترجم دارالترجمہ حیدر آباد (دکن): صفحہ ۱۵۲)

نصب العین کو پیش کر کے یعنی آدمی خدا کے لیے پیدا ہوا ہے، باقی یہاں جو کچھ بھی ہے خدا نے اس کو کس لیے پیدا کیا؟ اس کا جواب ''روحانیت'' والے نہ دیتے ہیں اور نہ دینا چاہتے ہیں۔ بلکہ منہ سے اقرار کریں یا نہ کریں، لیکن اپنے طرزِ عمل سے وہ بھی ثابت کرتے رہتے ہیں کہ عالم اور اس کا یہ سارا نظام اپنے اندر نہ کوئی معنی رکھتا ہے اور نہ مطلب۔ آخر مکان سے، لباس سے، غذا سے، پانی سے، بے زاریوں کے عام رجحانات جن کی روحانیت میں عموماً حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، سانس لینے کی ہوا تک سے بے نیازی کا ثبوت حبس دم وغیرہ کی طویل مشقوں سے جو پیش کیا جاتا ہے، روحانیت کے ان جسم گداز، روح فرسا مہیب، کڑی کڑی سخت ریاضتوں کے ہتھوڑوں سے چاہا جاتا ہو، نہ چاہا جاتا ہو، لیکن کائناتی حقایق کے افادی پہلوؤں پر جو چوٹیں قدرتاً جن سے انسانی زندگی کی عام ضرورتوں میں عموماً کام لیا جاتا ہے بلکہ زندگی کی ناگزیر ضرورتوں میں جن کو شمار کرلیا گیا ہے، کیا اس کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ آخر جہاں یہ دکھایا جارہا ہو کہ جینے والے ان کے بغیر جی سکتے ہیں اور جی رہے ہیں تو روحانیت والوں کے طرزِ عمل کو ان ہی چیزوں کی ضرورت کے مقابلے میں کھلے ہوئے عملی احتجاج کے سوا خود ہی سوچیے کہ اور کیا سمجھا جائے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ روحانیت کے اس مسلک میں کرنے والے جو کچھ کر کے دکھاتے ہیں ان کی غرض بھی یہی ہوتی ہے، لیکن جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے تو بہر حال یہی ثابت ہوتا ہے کہ خود پیدا کرنے والے نے تو جو ہوا کو، پانی کو یا اس قسم کی دوسری چیزوں کو اس لیے پیدا نہیں کیا تھا کہ آدمی ان سے نفع اٹھائے، لیکن نفع اٹھانے والوں نے اپنی طرف سے افادیت کا خود ساختہ مصنوعی پہلوان میں پیدا کر دیا ہے۔

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ فقط ایک انسان وجود کے متعلق کس کے لیے سوال کا حل پیش کر کے ساری کائنات اور خدا کے ساری مخلوقات کو اسی ''کس لیے؟'' کے سوال کے جواب میں گونگا بہرا بنا کر ''روحانیت'' یا ''رہبانیت'' میں جو چھوڑ دیا جاتا ہے اگر یہی خالق آفریدگار کے علم وحکمت کا اعتراف و اقرار ہے تو اسی خالق کے علم

وحکمت کے انکار کی شکل اخیر کیا ہوگی؟

اللہ اللہ! اپنے کسی فعل وعمل پر لاحاصلی اور عبث کاری کے الزام کو جو برداشت نہیں کر سکتے ان ہی کے اندر اس فیصلے کی گنجایش کیسے پیدا ہو جاتی ہے کہ خود ان کے سوا قدرت کی ساری کارفرمائیاں لاحاصل وعبث ہیں؟ بلکہ الٹے ان ہی پر تیوریاں چڑھائی جاتی ہیں جو اپنی زندگی کی ضرورتوں میں مستفید ہو کر خدا کے ان کارناموں کی قدر و قیمت کو ہویدا اور نمایاں کرتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ''مادّیت'' کا مسلک بجائے خود جس لعنت و ملامت کا بھی مستحق ہو، لیکن کائنات کے ذرے ذرے میں پیدا کرنے والے خالق کی دانائیوں اور اس کی حکیمانہ مصلحتوں کی جستجو وتلاش جو کم از کم مادّیت کی جدید ذہنیت کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ہے، اس نقطۂ نظر سے تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ رہبانیت اور روحانیت والوں کے مقابلے میں مادّیت والوں ہی کی پیٹھ ٹھونک دی جائے۔ مگر یہ سوچ کر ہاتھ رک جاتا ہے کہ جس چراغ کی روشنی میں ''مادّیت'' والے ہر چیز کا مطلب خود بھی سمجھ رہے تھے اور دوسروں کو بھی سمجھا رہے تھے ان کی اس آئیڈیالوجی میں اچانک اسی چراغ کو گل کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ مطلب میرا وہی ہے کہ انسانی وجود کو بے معنی اور بے مطلب ٹھہرا کر آپ دیکھ چکے کہ روشنی میں لانے کے بعد کتنی بے دردیوں کے ساتھ ساری کائنات کو اچانک مادّیت کا نقطۂ نظر اندھیرے، گھپ اندھیرے میں دھکیل دیتا ہے۔ عرض ہی کر چکا ہوں کہ مادّیت میں کبوتر کا وہی ''پر'' نوچ لیا گیا ہے جس میں دلبر کا نامہ بندھا ہوا تھا۔ آخر دنیا کی چیزیں انسانی ضرورتوں ہی میں کام آ آ کر اپنی قدر و قیمت کو ثابت کر رہی ہیں۔ جب انسانی وجود ہی کو بے قیمت بنا کر ''مادّیت'' میں چھوڑ دیا جاتا ہے تو دنیا کی کسی چیز کی قدر و قیمت کا معیار ہی کیا باقی رہا؟ سب کچھ انسان کے لیے اور انسان کسی کے لیے نہیں، تو نتیجۂ منطق یہی تو نکلا کہ سب کچھ کسی کے لیے نہیں۔ مختلف پیرائے میں مسلسل اس مسئلے کو سمجھاتا چلا آرہا ہوں کہ آدمی کس لیے ہے؟ اس سوال کے جواب سے خاموشی کے ساتھ عالم کا یہ سارا

نظام ہی گونگے کا خواب اور ''نظام باطل'' بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی جوہری روگ ہے مادّیت کی ملعون ذہنیت کا۔ جس کی بہ دولت سب کچھ ہوتے ہوئے زندگی کا مادی قالب'' کچھ بھی نہیں'' بن کر رہ جاتا ہے۔ گھوڑے والی وہی مثال امام غزالیؒ کی صادق آتی ہے کہ گھوڑا سمندر بھی ہے سیاہ زانو بھی ہے، پچ کلیان بھی ہے، لیکن مرا ہوا ہے۔ یہی ''مادّیت'' کا ''پائے طاؤس'' ہے جسے دیکھ کر اس کا ''طاؤسی سر'' ندامت سے جھک جاتا ہے یا چاہیے کہ وہ جھک جائے۔

آخر روحانیت کچھ بھی ہو، لیکن انسانیت کی گلیم کو تو ہستی کے اس بحرِ بے کراں کی موجوں سے باہر نکال لینے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا، لیکن مادّیت تو انسان اور انسان کے ساتھ سارے عالم کو لپیٹے ہوئے لاحاصلی کے اتھاہ سمندر میں لے جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دنیا کیوں اور کس لیے پیدا ہوئی تھی اور ہم اس دنیا میں کس لیے لائے گئے تھے؟

''مادّیت'' اور ''روحانیت'' کے باہمی موازنے کے مسئلے کو آیندہ کسی مناسب وموزوں مقام پر ہم بیان کریں گے اس باب میں جو قرآنی نقطۂ نظر ہے اسے ہم پیش کریں گے۔ سردست اتنا ہی اشارہ کافی ہے۔

درحقیقت گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ اتنی شدید نظریاتی کش مکش میں اپنے آپ کو الجھا دینے کے بعد بھی جسے دنیا کی کوئی منطق سلجھا نہیں سکتی۔ روحانیت والے ہوں یا مادّیت والے، دونوں کے دونوں ہی کائنات کی مقصدیت کی کامل توجیہ یعنی وہی ''کس لیے؟'' کے سوال کے اسی جواب کے پانے میں قطعاً ناکام ہیں جو انسان اور ماورائے انسانی حقایق وموجودات، سب ہی پر منطبق ہو۔ ہر ایک کے متعلق سمجھ میں آجائے کہ پیدا کرنے والے نے اس کو کس لیے پیدا کیا ہے۔ متعین ہو جائے کہ کس نصب العین کی تکمیل ان کے وجود سے ہوتی ہے؟ مگر کیا کیجیے کہ اسی ''ذہنی تناقص'' کی ''دماغی کوفت'' کو خود بہ خود خرید کر ''مادیت'' بھی سر پٹک رہی ہے، اور ''روحانیت'' کہیے یا ''رہبانیت'' اسی جال کے اندر تڑپنے اور پھڑکنے پر مجبور ہے۔

باب ہشتم:

الاسلام یا اسلامی نظامِ زندگی

①

اب آیے! ان دونوں آئیڈیا لوجیوں کے مقابلے میں انسانی زندگی ہی کے تیسرے قالب کو آپ کے سامنے رکھا جاتا ہے۔

یہ اسلامی نظام زندگی ہے۔ حقیقی نام تو اس کا ''الاسلام'' ہے، لیکن ''مادّیت'' اور ''روحانیت'' کے معاملے میں جی چاہے تو ''اسلامیت یا اسلام'' کے الفاظ سے بھی اس کی تعبیر کر لیجیے۔ آدمی کی زندگی کا یہ اسلامی نظام جب کہ دنیا جانتی ہے قرآن میں پیش کیا گیا ہے، لیکن خود قرآن میں زندگی کے ان تینوں طریقوں کے متعلق جو آگاہی بخشی گئی ہے دوسرے مباحث سے پہلے مناسب ہے کہ اسی کو سمجھ لیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ ''روحانیت'' جسے قرآن میں ''رہبانیت'' کا نام دیا گیا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے جیسے:

رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ. (سورۂ حدید: ۲۷)

''رہبانیت (کا طریقہ) جسے لوگوں نے خود ہی تراش لیا ہے ان پر اس کا مطالبہ ہم نے عاید نہیں کیا۔''

کا مشہور اعلان کیا گیا ہے۔ اسی طرح رہبانیت کے بالکل برعکس جینے کا وہ طریقہ جس میں ان مخلوقات کو جو خود اپنے اندر اپنا کچھ نہیں رکھتے ان کو تو سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے اور خالق جس کا سب کچھ ہے اسی سے کتراتے ہوئے اور زندگی کے سارے کاروبار میں عملاً اسی کو کچھ ایسے طریقے سے نظر انداز کرتے چلے جانا کہ گویا ''وہ کچھ نہیں'' بن کر رہ گیا ہے۔ جو قدیم ہو یا جدید مشرکانہ ذہنیت کی مشترکہ خصوصیت ہے۔ اسی کے متعلق قرآن میں پوچھا گیا ہے:

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ. (سورۂ روم: ۳۵)

''کیا ان پر ہم نے کوئی سلطان (دلیل) نازل کیا ہے؟ وہی دلیل بولتی ہے ان چیزوں کو جنھیں وہ اس (خالق) کا شریک ٹھہراتے ہیں۔''

یا اس کے قریب قریب

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْهُ. (سورۂ فاطر: ۴۰)

''کیا ہم نے ان کو کوئی نوشتہ دیا ہے؟ اسی لیے اپنے آپ کو کھلی دلیل کی روشنی میں پاتے ہیں۔''

وغیرہ سوالات کے ساتھ ان ہی ''مخلوقات'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جنھیں مشرکانہ زندگی میں سب کچھ ٹھہرایا جاتا ہے۔اس قسم کے مطالبات مختلف پیرایوں میں بہ کثرت کیے گئے ہیں۔مثلاً:

اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ (سورۂ احقاف: ۴)

''دکھاؤ مجھے! ان چیزوں نے (جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو، انھوں نے) زمین کی کسی چیز کو پیدا کیا یا ان کا ساجھا آسمانوں میں ہے؟ لاؤ کوئی نوشتہ جو پہلے نازل ہوا ہو یا علم جو چلا آتا ہو ان کے ہاں اگر تم سچے ہو۔''

یا ان ہی سے دریافت کرتے ہوئے پوچھا گیا ہے کہ

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا. (سورۂ انعام: ۱۴۸)

''کہو! کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے؟ تو نکالو اس علم کو ہماری آگاہی کے لیے۔''

اس نوعیت کی تحدّیوں یا چیلنج پر چیلنج کے بعد خود ان کو بھی جنھیں اس مشرکانہ نقطۂ نظر کے مطابق زندگی بسر کرنے پر اصرار ہے، قرآن اس قسم کے الفاظ سے چونکاتا چلا گیا ہے کہ

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ۝ (سورۂ انعام: ۱۴۸)

”نہیں پیچھے چل رہے ہو تم لوگ مگر صرف خیالی گمان کے اور نہیں تم لوگ مگر یہ کہ صرف اٹکل سے کام لے رہے ہو۔“

اور دوسروں کو بھی آگاہ کرتے ہوئے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ○ (سورۂ فاطر: ۴۰)

”بلکہ (نظریۂ شرک کے متعلق واقعاتی) حدود سے ہٹنے والے باہم ایک دوسرے کو نہیں امیدوار ٹھیرا رہے ہیں مگر صرف فریب کا۔“

حاصل سب کا یہی ہے کہ رہبانیت اور روحانیت جیسے زندگی کا کوئی قدرتی دستور و آئین نہیں ہے، بلکہ اپنے ذاتی رجحانات، ذہنی افتاد یا اتفاقاً پیش آنے والے حوادث و حالات کے زیر اثر تراشنے والوں نے جینے کا ایک مصنوعی، غیر فطری طریقہ خود ہی تراش لیا ہے۔ یہی حال اس مشرکانہ مادی زندگی کا بھی ہے، جس میں نظریۂ شرک آدمی کو مبتلا کر دیتا ہے۔ قرآن نے چیلنج کیا ہے کہ نہ تو علم کے حکیمانہ اور سائنٹفک معیار پر جانچی اور پرکھی ہوئی کوئی حقیقت مشرکانہ نظام زندگی میں ڈھونڈھنے والوں کو کبھی مل سکتی ہے اور استناد و اعتماد کی قدرتی ضمانت وحی و الہام کی لاہوتی راہ کے مکشوفات معلومات میں جو پائی جاتی ہے، اسی کی ضمانت اس خوامخواہ کے بے بنیاد وسوسے کو میسر آ سکتی ہے جس میں مبتلا ہو ہو کر باور کرنے والے باور کر لیتے ہیں کہ جس کا سب کچھ ہے، وہی عملاً کچھ نہیں ہے اور جن میں خود اپنا کچھ نہیں ہوتا وہی سب کچھ بن بیٹھے ہیں اور ہے بھی بجائے خود یہ اتنی بودی پھسپھسی مضحکہ خیز، تبسم انگیز بات کہ وحی الہام کی طرف انتساب کا دعوی ہی اس کی تردید اور یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اتنا بے بنیاد وسوسہ یا وہم خدائے علیم وخبیر کا بخشا ہوا علم نہیں ہو سکتا۔ عقل بے چاری ہر بھلی بری بات کی تائید اور جذبات و احساسات کی وکالت میں لاکھ بدنام سہی، لیکن ایسے بے معنی دعوے کی برداشت کی گنجایش بتایئے کہ اس غریب میں بھی کیسے پیدا کی جائے؟ کسنا اور کس کر دکھانا تو خیر دور کی بات ہے سچ تو یہ ہے کہ ایسے دانش سوز، عقل گداز وسوسے کو تجربے اور مشاہدے کی حکیمانہ وعلمی کسوٹی پر کسنے کا بھلا کوئی

تصور بھی کر سکتا ہے؟ خدا کا انکار کر کے تو خیر بنانے والے کچھ الٹی سیدھی باتیں بنا بھی سکتے ہیں، لیکن مشرکانہ طریقۂ فکر جس میں خدا کا انکار بھی تو نہیں کیا جاتا، یہی مانا جاتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اسی صورت میں بتایا جائے کہ فرض و تخمین کی ایک ''اٹکل پچو'' بات ظن اور گمان کے سوا اوہام و وساوس کے ان تھپیڑوں کی توجیہ اور کیا کی جائے جن سے ''مشرکانہ ذہنیت'' ٹکرا کر جو کچھ نہیں ہے اسی کو سب کچھ اور جو سب کچھ ہے اسی کو'' کچھ نہیں'' ٹھہرانے کی ابلہ فریبیوں میں خود مبتلا ہے اور دوسروں کو بھی مبتلا کرتی چلی آ رہی ہے۔

بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا○ (سورۂ فاطر: ۴۰)

''بلکہ (واقعات کے حدود سے ہٹ کر زندگی بسر کرنے والے) ظالمین باہم ایک دوسرے کو نہیں امیدوار ٹھیرا رہے ہیں مگر صرف فریب کار۔''

کے سوا اور کن لفظوں میں آخر کاروبار کے اس سارے نظام کی روداد قرآن پیش کرتا جو شرک کی راہوں میں انجام دیے جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں مشرکوں ہی کو خطاب کر کے قرآن میں مطالبہ کیا گیا ہے:

فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ○ (سورۂ رعد: ۱۰)

''لاؤ اپنے فکر و عمل کی صداقت پر کوئی سلطان مبین یعنی کھلی دلیل۔''

اور اس کے ساتھ اس واقع کا بھی اظہار و اعلان کر دیا گیا ہے کہ

مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ. (سورۂ نجم: ۲۳)

''نہیں اتارا ہے اللہ نے اس کے متعلق کوئی سلطان یعنی دلیل۔''

جہاں تک میرا خیال ہے ایسی بات جو انسانی عقل و احساس پر مسلط ہو کر اس طریقے سے چھا جائے کہ اس کے ماننے پر آدمی بے بس ہو جائے قرآنی اصطلاح کی رو سے اسی نوعیت کے دلایل کی تعبیر ''سلطان'' کے لفظ سے کی گئی ہے۔ بظاہر اس پیرایۂ بیان سے ادھر توجہ دلانا مقصود ہے کہ زندگی بہر حال زندگی ہے، وہ کوئی ہنسی مذاق، کھیل کود، لہو و لعب نہیں ہے کہ من مانے، خود تراشیدہ خیالات و اوہام کے نیچے

بننے اور بہانے کے لیے حیاتی توانائیوں کے اس انمول قیمتی سرمائے کو چھوڑ دیا جائے۔ ''سلطان'' کے لفظ سے قرآن چونکانا چاہتا ہے اور اس احساس کو دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے کہ جو قدم بھی اس زندگی میں اٹھایا ہے چاہیے کہ ''سلطانی دلایل'' ہی کی روشنی میں اٹھایا جائے۔ اور شکر ہے کہ نزول قرآن کے بعد نظر و فکر کے اسے سلطانی کہیے یا قرآنی طریقے پر اصرار کا مذاق روز بہ روز شدت پذیر اور اپنے دایرے کو وسیع کرتا چلا جا رہا ہے۔ تعلیم کا نیا مغربی نظام اپنے جوہری کوتاہیوں بلکہ بعض انسانیت گداز خصوصیتوں کے ساتھ سلطانیت کے مذاق کو آگے بڑھانے میں جو کام کر رہا ہے اس کا انکار میرے نزدیک تو ایک حقیقت اور واقعے کا انکار ہوگا۔ مگر کیا کیجیے مغربی تمدن و تہذیب کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ جب بہ قول شخصے

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

کے پہلوؤں پر نظر پڑتی ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے، سب کچھ سوچا جا رہا ہے، ہر مسئلے پر بحث کا دروازہ کھول دیا گیا ہے، لیکن زندگی کے بنیادی سوالوں کی طرف سے دوسرے تو دوسرے خود یورپ و امریکہ والے بھی غفلت یا تغافل ہی سے کام لے رہے ہیں۔ تاہم پہلے بھی عرض ہی کر چکا ہوں کہ حال کی تاریکی کے پیچھے میری ایمانی بصیرت و فراست کسی روشن مستقبل کو دیکھ رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہ زور ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائے یعنی وہی باتیں جن کے چرچا کرنے والے تو ہر جگہ مل جاتے ہیں لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ کسی نے ان کو دیکھا بھی ہے تو ہر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتا ہے یا زیادہ سے زیادہ کسی انفرادی شخصیت کا ''سپنا'' یا خواب یا افراد ہی کے مراقباتی و نفسیاتی کرشموں کے ان آثار کو پیش کر دیا جاتا ہے جن میں یقین سے زیادہ شکوک اور شبہارت ہی کے جراثیم بھنبھناتے رہتے ہیں۔ توقع تو یہی ہے کہ ایسی پارینہ کتابیں جن کی قدیم تعبیروں میں اللہ اور زمانے سے ہر مفہوم اور ہر مطلب کے نکال لینے کی گنجایش پیدا ہو گئی ہے، ان ہی غیر سلطانی مبہم فقروں سے نکالے ہوئے مشکوک و مشتبہ نتایج پر بھروسہ کر کے آدم کی اولاد زیادہ دن تک اپنی زندگی سے کھیلتی نہ رہے گی

اور قرآنی مطالبہ:

فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ○ (سورۂ رعد:۱۰)

''لاؤ (مشرکانہ کاروبار کی صداقت پر) کوئی سلطان مبین یعنی کھلی دلیل۔''

پر دھیان دینے کے لیے آج نہیں تو کل ان شاء اللہ دنیا آمادہ ہو جائے گی ❶۔

یہ تو خیر ایک ضمنی بات تھی، میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک طرف رہبانیت کہیے یا ''روحانیت'' اور نظریۂ شرک والی ''مادّیت'' دونوں ہی کو لوگوں کا ساختہ پرداختہ، خود آفریدہ و تراشیدہ مصنوعی طریقۂ حیات قرار دیتے ہوئے جہاں قرآن میں:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ○ (سورۂ آل عمران:۱۹)

''قطعاً اللہ کے پاس دین ''الاسلام'' ہی ہے، کا اعلان کیا گیا ہے۔''

جس کا مطلب یہی ہے کہ ''رہبانیت'' اور ''مادّیت'' ان دونوں مصنوعی خود ساختہ آئیڈیالوجیوں کے مقابلے میں آدمی کی زندگی کا ایسا قدرتی دستور جس کی پابندی کا مطالبہ اللہ یعنی خالق کائنات کے پاس سے کیا گیا ہے وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔

---

❶ اس موقع پر میرے قلم سے یہ چند فقرے اگرچہ بہ طور جملہ معترضہ ہی کے نکل پڑے ہیں مگر اسی کے ساتھ ایک مسئلے کی طرف ضمنی اشارہ بھی مقصود ہے یعنی قرآن میں مشرکانہ نقطۂ نظر کے متعلق بار بار دہرا کر یہ چیلنج جو کیا گیا ہے کہ وحی والہام کی راہ سے معلومات مختلف زمانے میں جو قوموں میں اشاعت پذیر ہوئے ہیں ان میں بھی کوئی توثیقی شہادت ''نظریۂ شرک'' کی تصحیح میں پیش کرنے والے پیش نہیں کر سکتے۔ آج دنیا میں الہامی کتابوں کے نام سے جو کتابیں مشہور ہیں باوجود مشتبہ و مشکوک ہونے کے یہ واقعہ ہے کہ بنیادوں کی تعلیم بھی مسئلہ توحید ہی پر رکھی گئی ہے۔ اسی لیے ان کتابوں کے ماننے والے توحید ہی کو اپنا دینی عقیدہ قرار دیتے ہیں، لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں توحید کے بعد عموماً دیکھا گیا ہے کہ قوموں میں مشرکانہ ذہنیت کی وبا پھوٹ پڑی۔ حد یہ ہے کہ قرآن پر ایمان لانے والی امت بھی اس وبائی حادثے سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اس کے بعد تاویل و توجیہ کی چابک دستیوں سے عموماً کام لینے والوں نے کام لیا ہے، جب قرآن پر ایمان لانے کے ساتھ مشرکانہ کاروبار کی گنجائش پیدا کر لی گئی تو دوسری الہامی کتابوں کے سننے والوں پر یہی افتاد آ کر پڑی تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے؟ لیکن آدمی کا ضمیر بہر حال جب زندہ ہو جاتا تو تاریکیوں کے یہ بادل چھٹ جاتے ہیں اور قرآن کا یہ چیلنج بھی اصل حقیقت سے تعلق رکھتا ہے۔ ورنہ تاویل و توجیہ کی رو سے تو کافیہ کی کتاب کو بھی لوگوں نے تصوف کی کتاب ثابت کر کے دکھا دیا ہے۔

باب نہم:

الاسلام یا اسلامی نظامِ زندگی

(۲)

یہ تو ''اسلام'' یا ''اسلامیات'' کی پہلی خصوصیت ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری طرف اسی ''اسلام'' کو پیش کرتے ہوئے قرآن میں اس سوال کو اٹھا کر کہ

اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَ هُمْ مَالَمْ یَاْتِ اٰبَآئَهُمُ الْاَوَّلِیْنَ○ (سورۂ مومنون ۶۸)

''کیا بات کو وہ سوچتے نہیں یا ان کے پاس کوئی ایسی بات آئی ہے جو ان کے اگلے باپ دادوں کے پاس نہ آئی تھی۔''

اس سوال کے جواب کو اجمالی رنگ میں کبھی بہ ایں الفاظ:

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی. (سورۂ اعلیٰ ۱۸)

''قطعاً یہ (جو قرآن میں بیان کیا گیا) پہلے صحیفوں میں بھی بلاشبہ یہی تھا۔''

ہم قرآن میں پاتے ہیں اس مقصد کو کہیں:

اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ. (سورۂ شعراء ۱۹۶)

''اور (یہی باتیں) اگلوں کی کتابوں میں تھیں۔''

اسی اجمال کی گونہ تفصیل کرتے ہوئے خبر دی گئی ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَاوَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖ اِبْرَاهِیْمَ وَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی......

(سورۂ شوریٰ: ۱۳)

''تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جاتا ہے جس کی وصیت خدا نے نوح کو کی تھی اور اسی کی وحی ہم نے تم پر بھی کی اور اسی کی وصیت ہم نے

ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ کو بھی کی تھی۔'' (علیہم الصلوٰۃ والسلام)

گویا رسالات ونبوات کی پہلی مشہور تاریخی شخصیت حضرت نوح علیہ السلام اور نزول قرآن سے پہلے اسی سلسلے کی آخری ہستی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ جو کچھ اگلوں کو دیا گیا تھا وہی پچھلوں تک پہنچایا جاتا رہا۔ اسی طرح سورۃ الاعراف میں اسی راہ کے چند ممتاز مشہور بزرگوں کے اسمائے گرامی یعنی: ① نوح، ② ابراہیم، ③ اسحاق، ④ یعقوب، ⑤ داؤد، ⑥ سلیمان، ⑦ ایوب، ⑧ یوسف، ⑨ موسیٰ، ⑩ ہارون، ⑪ زکریا، ⑫ یحیٰ، ⑬ عیسیٰ، ⑭ الیاس، ⑮ الیسع، ⑯ یونس، ⑰ لوط علیہم السلام کے ذکر کے بعد:

وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيَاتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ. (سورۂ نحل: ۸۷)

''اوران ہی کے باپ دادوں میں جو تھے اوران کی اولاد میں جو تھے اوران کے بھائی۔''

کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں بہ ظاہران سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس راہ کی ساری برگزیدہ ہستیاں جن میں نسلی تعلق ہو یا نسلی نہیں بلکہ صرف نبوت کی اخوت کا رشتہ قایم ہوا❶، اِخْوَانِهِمْ (ان کے بھائیوں) کے الفاظ سے جن کی تعبیر کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سارے نمایندے اوراس کے پیغام کو بندوں تک پہنچانے والے خواہ ایک نسل اور قوم سے ہوں یا مختلف نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہوں سب ہی کے متعلق:

اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ. (سورۂ انعام: ۹۰)

''یہی وہ لوگ ہیں جن کی رہنمائی اللہ نے کی۔''

کی خبر دینے کے بعد قرآن پر ایمان لانے والوں سے:

---

❶ معراج کی حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ان پیغمبروں سے جب ہوتی جن سے نسلی رشتہ آپ کا تھا تو وہ مرحبا بالابن الصالح کہتے اور جن سے نسلی رشتہ نہ تھا وہ مرحبا بالاخ الصالح کے الفاظ سے آپ کا خیر مقدم کرتے۔

فَبِهُدٰا هُمُ اقْتَدِهْ. (سورۂ انعام: ۹۰)

''پس چاہیے کہ جن باتوں کی ہدایت ان کو کی گئی تھی ان ہی کی پیروی تم بھی کرو۔''

کا مطالبہ کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ ''الاسلام'' کو قبول کرتے ہوئے ہر مسلمان کو یہ بھی ماننا پڑے گا اور اس پر ہی بیعت کرنی ہوگی کہ

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ○ (سورۂ بقرہ: ۱۳۹)

''مانا ہم نے اللہ کو اور ان چیزوں کو جو ہم پر اتاری گئیں اور اترا ابراہیم پر، اسماعیل پر، اسحاق پر، یعقوب پر اور اسباط (اسرائیلی پیغمبر) پر جو کچھ کہ دیا گیا موسیٰ کو اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے (سب پر ہم ایمان لائے) اور ان میں سے کسی کو کسی سے ہم جدا نہیں کرتے اور ہم سب (خالق کائنات) ہی کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔''

بیعت کے اس کلمے میں آپ دیکھ رہے ہیں، نام بہ نام چند خاص بزرگوں کے ذکر کے بعد اقرار لیا جاتا تھا کہ ''النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ'' یعنی جہاں کہیں جس زمانے میں بھی اپنے رب کی طرف سے نبی اور پیغمبر بنا کر جو بھیجے گئے، خواہ ان کے نام معلوم ہوں یا نہ ہوں لیکن اجمالاً سب ہی پر ایمان لاتا ہوں۔ ان پر بھی ایمان لاتا ہوں اور جو کچھ اللہ کے پاس سے وہ لائے اس کو بھی مانتا ہوں۔ اس لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہ سمجھوں گا۔

اور یہ چند آیتیں تو گویا بہ طور مثال کے یہاں پیش کر دی گئی ہیں، ورنہ چاہا جائے تو ایسی قرآنی آیتوں کا کافی ذخیرہ آپ کے سامنے لا کر رکھ دیا جا سکتا ہے، جس کا قدر مشترک یہی ہے کہ انسانی زندگی کا یہ قدرتی دستور جس کا نام ''الاسلام'' یا

اسلامیت'' ہے، سارے بنی آدم کا دوامی دستور ہے۔ خالق کائنات کے پاس سے ہر زمانے میں اسی کی پابندی کا مطالبہ ہر اس شخص سے کیا گیا ہے جو آدمی بن کر زمین کے اس کرّے پر پیدا ہوا۔ خواہ وہ کسی ملک کا رہنے والا ہو، کسی نسل اور قوم سے اس کا تعلق ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ خود آیت قرآنی:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ○ (آل عمران ۱۹)

''قطعاً دین اللہ کے پاس وہ الاسلام ہی ہے۔''

میں بھی کوئی ایسا لفظ یا اشارہ نہیں پایا جاتا جس کی بنیاد پر خواہ مخواہ بلا وجہ یہ باور کرلیا جائے کہ قرآن کا یہ ''اطلاقی اعلان'' کسی خاص زمانے تک محدود ہے اور اس سے پہلے خدا کے پاس سے زندگی کے کسی ایسے دستور کی پابندی کا مطالبہ بھی پیش ہوتا رہا ہو ''الاسلام'' سے مختلف تھا۔ کچھ بھی آپ کے سامنے رہبانیت اور نظریۂ اشتراک والی مادّیت کے مصنوعی طریقوں کے مقابلے میں انسانی زندگی کے اسی قدرتی دستور کو پیش کرتا ہوں جس کا قرآنی نام ''الاسلام'' ہے اور قرآن ہی کی رو سے اسی کی پابندی کا مطالبہ ہر زمانے میں آدم کی اولاد سے خدا کے پاس سے پیش ہوتا رہا۔

اس میں شبہ نہیں جیسا کہ آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں ہم جو کچھ بھی پیش کریں گے قرآن اور قرآن سے جو کچھ سمجھا گیا ہے اسی کی روشنی میں پیش کریں گے ❶۔ لیکن قرآن ہی کی بنیاد پر ہر پڑھنے والے کو یہ سمجھنا چاہیے اور اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے میں اسلام کو پیش کروں گا کہ اسی قدرتی دستور کے مطابق زندگی بسر کرنے کا مطالبہ خدا کے پاس سے چین والوں سے بھی کیا گیا تھا اور ان سے بھی جو جاپان کے جزیروں میں رہتے تھے، اسی کے مکلّف اپنے پیدا کرنے والے کی طرف سے وہ بھی ٹھہرائے گئے تھے جو ایران میں یا ہندوستان میں، عرب میں یا مصر میں پیدا ہوئے تھے۔ الغرض ایشیا ہو یا افریقہ، یورپ ہو یا امریکہ، کسی ملک کے رہنے والے

❶ گویا اصولی قانون کے ساتھ آئین ہی کے ان حصوں کی نسبت ہوتی ہے جنھیں بائی لاز کہتے ہیں۔ وہی نسبت قرآن کے ساتھ جن چیزوں کی ہے جن کو اصطلاحاً حدیث و آثار و فقہ وغیرہ کہتے ہیں۔

ہوں۔ سامی نسل سے تعلق رکھتے ہوں یا آریائی گوت سے، تورانی ہوں یا سلاف اور ٹیوٹانی، خواہ جزایر کے باشندے ہوں یا بر ہاے اعظم میں ان کا وطن ہو، کوئی بھی ہوں کہیں کے بھی ہوں، کسی زمانے میں پیدا ہوئے ہوں، قرآن کے واضح بینات اور محکم آیات ہی کا اقتضا ہے کہ اصولاً سب ہی کے آگے ''الاسلام'' ہی کی پابندی کا مطالبہ ان کے خالق کے پاس سے پیش کرتے رہے۔ ممکن ہے کہ نام زندگی کے اس ''نظام'' کا ''الاسلام'' نہ ہو اور ممکن کیا بہ ظاہر عام حالات کے لحاظ سے شاید ممکن نہ تھا، لیکن ''نام'' نہ سہی ''کام'' جو ان سے چاہا گیا، وہ تو یقیناً ''الاسلام'' ہی تھا اور اسی کو ہونا بھی چاہیے تھا۔ آخر نزول قرآن سے پہلے بھی تو زمین کے اس کرّے پر آدم ہی کی اولاد آباد تھی، وہ بھیڑ بکری تو نہ تھے۔

کچھ بھی ہو، موازنے اور مقابلے کے میدان کو میں اپنی اسی کتاب میں کیا بلکہ اصولاً صرف زندگی کے ان ہی دونوں خود ساختہ، مصنوعی، غیر فطری اور غیر عقلی طریقوں (رہبانیت و مادّیت) ہی کی حد تک محدود سمجھتا ہوں۔ ان دونوں کے مقابلے میں ''الاسلام'' یا ''اسلامیت'' ہی میرے نزدیک آدمی کی زندگی کا قدرتی اور فطری دستور ہے۔ باقی دنیا کے عام مذاہب و ادیان جن کے ماننے والے دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں ان بے چاروں کو دیکھتا ہوں اور دل ہی دل میں گھٹتا ہوں، بلکہ کبھی کبھی تو رو پڑتا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں کہ اپنے گھر کی پونجی کو پرائی پونجی باور کر کے ایک بے بنیاد مغالطے میں لوگ مبتلا کر دیے گئے ہیں۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ ان ہی کے گذرے ہوئے بزرگوں، ان ہی کے اسلاف اور باپ دادوں کا ''موروثی سرمایہ'' ہر قسم کی اشتباہی آلایشوں سے پاک وصاف ہو کر قرآن کے قالب میں ان کو واپس کیا گیا ہے۔ ان ہی کی اپنی چیز ہے جو ان کے سامنے لائی گئی ہے، مگر وہ تو یہ سننا بھی نہیں چاہتے کہ آخر قرآن کا پیغام کیا ہے، وہ ان سے کیا کہہ رہا ہے؟ بدگمانیاں، بے بنیاد وقطعاً بے بنیاد بدگمانیاں تھیں کہ سننے اور سن کر سمجھنے سے پہلے ہی بدکنے والے بدک رہے ہیں، بھڑکنے والے بھڑکتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ان میں یہ

غلط احساس پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن کو مان کر اپنے ''آبائی ترکہ'' سے ہم محروم ہو جائیں گے اور اپنے بزرگوں سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔

ہائے! ان کو کیسے سمجھایا جائے کہ جس ''موروثی حق'' سے محروم کرنے والوں نے ان کو محروم بنا کر چھوڑ دیا تھا حق داروں تک قرآن ان کے اسی ''موروثی حق'' کو پہنچانے ہی کے لیے نازل ہوا ہے۔

بغیر کسی پاس داری کے کھلے دماغ کے ساتھ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اپنے آباؤ اجداد کے چھوڑے ہوئے ''موروثی حق'' تک پہنچنے اور پہنچانے کا کوئی ذریعہ قرآن کے سوا آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر باقی نہیں رہا۔ سامنے والوں نے حق کو ناحق کے ساتھ کچھ اس طرح سان دیا ہے کہ جیسے ناخن کو ممکن ہے گوشت سے چھڑا بھی لیا جائے مگر اس سلسلے میں خواہ تنقیح و تصحیح کے سارے عقلی ذرائع اور منطقی کارروائیوں سے کیوں کام نہ لیا جائے، صورت حال ہی ایسی ہے کہ اب حق کو ناحق سے جدا کرنے میں قطعاً کامیابی نہیں ہو سکتی۔

حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی مذہب اور دین جس کے متعلق تصحیح کی ضرورتوں کو محسوس کر کے تنقیحی سوالات نہیں اٹھتے، یا نہیں اٹھائے جاتے اور ترجیحی نتائج جو عموماً عقلی راہوں سے نکالے جاتے ہیں اور ان ہی پر بھروسا کر کے جینے والے جی رہے ہیں۔ گویا رہبانیت و مادّیت کے مصنوعی طریقوں کی طرح اپنے عقل ساختہ فیصلوں پر وہ بھی بھروسا کر رہے ہیں۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ تصحیح و تنقیح و ترجیح کے یہ سارے کاروبار جو ہر مذہب کے ماننے والوں ہی کے محدود دائروں میں جاری ہیں، ان میں سے کوئی نہیں بھڑکتا۔ سمجھا جاتا ہے کہ اپنے اپنے دین کے احاطے کی یہ اندرونی بات ہے، لیکن بجائے کسی خاص مذہب اور دین کے نسل انسانی کے سارے مذاہب و ادیان کو اپنے دائرۂ بحث میں لا کر عقل کی غیر تشفی بخش راہوں سے نہیں، بلکہ وحی والالہام کے مقدس لاہوتی ذریعے سے تصحیح و تنقیح کی اسی ضرورت کو خود قدرت نے قرآن کی شکل میں جب پورا کر دیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ ہر مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب اور دین کو تصحیح و تنقیح کی ضرورت سے بے نیاز ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ ان میں ہر ایک اپنے طرز عمل سے یہی باور کرانا چاہتا ہے کہ اس کی دینی زندگی کو تصحیح و تنقیح کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ جس کے پاس جس شکل میں بھی جو دین پایا جا رہا ہے سمجھا جاتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کا صحیح دین یہی تھا اور ان کے آبائی مذہب یا دھرم کی کوئی شکل اس کے سوا نہ تھی جس شکل میں آج ان کے پاس وہ موجود ہے۔ حالاں کہ وحی والہام نہیں بلکہ صرف عام عقلی ذرائع سے کسی دین کے ماننے والوں کو آئے دن یہ دیکھا جاتا ہے کہ تصحیح و تنقیح کی ضرورت کی طرف توجہ دلانے کے لیے کوئی کھڑا ہوتا ہے تو عموماً لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور سب نہیں تو ایک طبقہ عقل کے نکالے ہوئے تنقیحی نتائج کے تسلیم کرنے پر آمادہ بھی ہو جاتا ہے۔ دنیا کے کسی مذہب پر شاید ہی کوئی ایسی صدی گزری ہو جو اصلاح و ترمیم، تصحیح و تنقیح کی آوازوں سے خالی رہی ہو۔ کل بھی یہی ہوتا تھا اور آج بھی یہی ہو رہا ہے، جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ جس ضرورت کی طرف قرآن نے مذاہب و ادیان کی ماننے والی ہستیوں اور قوموں کو توجہ دلائی ہے کسی زمانے میں اس کا انکار نہیں کیا گیا ہے۔ اور کون و فساد والی اس دنیا میں بناؤ اور بگاڑ کے اس عام قانون سے کون سی چیز محفوظ ہے جو آدمی کی دینی زندگی اس قانون کی زد سے بچ سکتی تھی [1]؟

بہر حال ارباب مذاہب و ادیان سے اس کے سوا مجھے اور کچھ کہنا نہیں ہے کہ جو

---

[1] خود مسلمانوں کی دینی زندگی جس پر ابھی کل تیرہ صدیاں گزری ہیں، جاننے والے جانتے ہیں کہ اس راہ میں کن کن حوادث کی کہاں کہاں نہیں شکار ہوتی رہی۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ مذاہب و ادیان کی تصحیح کا واحد قدرتی ''معیار'' ہونے کا جو موقف قرآن کو حاصل ہے یعنی اسی پر پیش کر کے چاہیے کہ اپنی دینی زندگی کی لوگ تصحیح کرتے رہیں۔ اس باب میں مسلم اور غیر مسلم سب ہی کے لیے قرآن مساوی نسبت رکھتا ہے۔ محض نام کے مسلمان بنا کر یہ خیال کہ اپنی دینی زندگی کو قرآن پر پیش کر کے صحیح کرنے کی ضرورت سے ہم بے نیاز ہیں، قطعاً غلط ہے۔

قرآن ہی نے سکھایا ہے یعنی قرآن جس دینی زندگی کے نظام کو تم پر پیش کر رہا ہے یہ وہی طریقہ ہے جس کی وصیت خدا نے نوح کو کی تھی، ابراہیم وموسیٰ کو بھی اسی کی وصیت کی گئی تھی، یعنی وہی سورۃ الشوریٰ والی آیت شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ ...... جسے نقل کر چکا ہوں اسی سلسلے میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ الہامی کتابیں وراثۃً جن لوگوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں وہ اپنی کتابوں کے متعلق شک میں مبتلا ہو کر دبدھے میں پڑ گئے ہیں۔ آخر میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ وَّأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ. (سورۂ شوریٰ: ۱۵)

''پس ان ہی وجوہ سے (یعنی اول سے آخر تک دین ایک ہی تھا، مگر لوگ شک میں مبتلا ہوئے اس لیے اسی پرانے دین کی طرف تم پھر لوگوں کو) پکارو اور خود بھی اس پر ڈٹ جاؤ، جیسے تمھیں حکم دیا گیا اور مت پیروی کرو (لوگوں کی اپنی من مانی خواہشوں کی اور مصنوعی خود ساختہ طریقوں کی) اور کہو کہ اللہ نے جو کچھ اتارا ہم نے تو صرف اسی کو مانا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگوں (یعنی دینی قوموں) کے درمیان میں فیصلہ کروں (یعنی حق کو ناحق سے جدا کر کے بتا دوں)۔''

دنیا کے عام مروجہ مذاہب و ادیان کے درمیان قرآن کا یہی ''طبعی موقف'' اور ''قدرتی مقام'' ہے۔ آیت کو ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ مروجہ مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کو خطاب کرتے ہوئے یہی کہا کرو کہ

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيْرُO

(سورۂ شوریٰ: ۱۵)

''اللہ ہی ہمارا پروردگار ہے اور تمہارا پروردگار بھی وہی ہے۔ ہمارے لیے

ہمارے کام اور تمہارے لیے تمہارے کام، کوئی جھگڑا ہمارے تمہارے درمیان نہیں ہے۔ اللہ ہم سب کو (قدرتی دستورِ حیات) پر اکٹھا کر دے اور واپسی اسی اللہ کی طرف ہے۔"

یہی ہمیں سکھایا گیا ہے۔ چاہیے کہ عام مذاہب وادیان کے ماننے والوں کے مقابلے میں اسی قرآنی نقطۂ ہائے نظر کو زندہ اور تروتازہ رکھا جائے اور میں تو ناامید نہیں ہوں کہ قرآن کی بتائی ہوئی دعا ہے:

اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا. (سورہ شوریٰ۔۲)

"ہم سب کو (جو دین کے ماننے والے ہیں، زندگی کے قدرتی دستور) پر اللہ جمع کر دے۔"

قبول نہ ہوگی۔ قرآن کے متعلق لوگ غلط فہمیوں کے شکار ہیں، ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو کر رہے گا۔ وہ کتاب پہچانی جائے گی جو ہر قوم کو اس کے سچے آبائی دین اور دھرم تک پہنچانے کے لیے سب سے آخر میں قدرت کی طرف سے نسلِ انسانی کو سپرد کی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بجائے اپنے ذاتی خیالات واظہار کے قرآن کو اسی رنگ میں قوموں کے آگے رکھا جائے جس رنگ میں اس نے خود اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ آپ اس کتاب میں بھی دیکھیں گے کہ "الاسلام" یا "اسلامی نظامِ حیات" کے نام سے جو چیزیں پیش ہو رہی ہیں اور ہوں گی تو وہ قرآن اور قرآنیات ہی سے ماخوذ ہیں، لیکن دنیا کے عام مذاہب وادیان کا آپ نے اگر مطالعہ کیا ہے یا تھوڑی بہت معلومات بھی اس سلسلے میں آپ کے پاس ہوں گی تو آپ یہ پائیں گے کہ عموماً یہ وہی باتیں ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں دنیا کے دوسرے عام مروجہ مذاہب وادیان میں بھی ملتی ہیں۔ نہ جاننے والے اس حال کو دیکھ کر کبھی کبھی پوچھتے بھی ہیں کہ جن باتوں کو لوگ پہلے ہی سے مانتے چلے آرہے ہیں جب وہی باتیں اسلام میں بھی منوائی جاتی ہیں اور ان ہی کی پابندی کا مطالبہ بھی "اسلام" میں کیا جاتا ہے تو اپنے پرانے دین کو چھوڑ کر اس نئے دین کو لوگ آخر کیوں مانیں؟ حتیٰ کہ بعض لوگوں نے تو بہ ظاہر تحقیق کی داد

بھی اس قسم کی کتابیں لکھ لکھ کر پچھ دن ہوئے حاصل کی ہے۔ انھوں نے مذاہب و ادیان کی کتابوں کو الٹا پلٹا اور ان ہی سے نکال نکال کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اسلام میں کوئی نئی بات نہیں بتائی جاتی۔

مگر تحقیق و تلاش کے ان پیشہ وروں سے یہ کون پوچھے کہ دین کی ساری کتابوں کے ساتھ تم نے قرآن کا بھی مطالعہ کرلیا تھا، اس کا دعویٰ کیا تھا، اس کو بھی تم نے منقح کیا تھا؟ قرآن کسی ''نئے دین'' اور ''نئی تعلیم'' کی دعوت ہی کب دیتا ہے؟ وہ تو قوموں کو ان کے آباے اولین (گذشتہ باپ دادوں) ہی کے دین اور دھرم کو تازہ ترین مکمل شکل میں اشتباہی آلودگیوں سے پاک کر کے پیش کرنے کا مدعی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ''اسلام'' اور اسلامی زندگی کے اجزا کو پیش کرتے ہوئے اگر چاہا جاتا تو قرآن کے سوا بھی عام اور مروجہ مذاہب و ادیان کی کتابوں کو فراہم کر کے اس کتاب میں ہم درج کر سکتے تھے تا کہ معلوم ہو کہ روحانیت اور مادّیت کے مقابلے میں ''اسلام'' یا ''اسلامیات'' نفسانی زندگی کا کوئی نیا دستور و آئین نہیں ہے، بلکہ اول سے آخر تک یہی قدرتی مطالبہ خالق کائنات کی طرف سے پیش ہوتا رہا۔ مذہبی نمایندوں یعنی حضرات انبیا و رسل علیہم السلام کی یہی مشترک تعلیم ہے۔

لیکن ایک ہی ''آئین و دستور'' کا تازہ ترین ایسا مکمل و جامع و حاوی ایڈیشن جب ہمارے پاس موجود ہے جو ہر قسم کے شک وشبہے سے قطعاً پاک ہے۔ اس کی تاریخی زندگی پر شروع سے آخر تک تاریکی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا ہے جس میں ردوبدل کی بدگمانیوں کی گنجایش کا ہلکے سے ہلکا احتمال بھی پیدا ہو سکتا ہو۔ ایسی صورت میں اسی دستور کے ان نسخوں کے استعمال کی ضرورت ہی کیا تھی جن کے ورق ورق میں شکوک وشبہات کے کیڑے رینگتے نظر آتے ہیں۔ خود ان کے ماننے والے بھی جانتے ہیں کہ کن تاریخی حادثوں سے ان کتابوں کو گزرنا پڑا ہے اور ان حادثوں میں ان کتابوں پر کیا کچھ نہیں گزر چکی ہے۔ ان ہی باتوں کا نتیجہ

ہے کہ تائیدی شہادتوں کے ساتھ ساتھ ان ہی مشکوک و مشتبہ نسخوں سے تردیدی شہادتوں کو بھی لوگ پیش کر سکتے ہیں ❶۔ اب اپنی اس تمہیدی گفتگو کے بعد انسانی زندگی کے اسلامی نظام کو پیش کرتا ہوں۔

واللہ ولی الامر والتوفیق

---

❶ دور کیوں جایے! عیسائی مذہب کا شمار بھی ان ہی ادیان میں کیا جاتا ہے جو عقیدۂ توحید کے حامی ہیں۔ انجیل توحیدی شہادتوں سے بھری ہوئی بھی ہے، لیکن اسی انجیل سے تو ''ایک تین ہے تین ایک ہے'' کا معمہ بھی نکالا جاتا ہے۔ تورات میں خدا کے جلال و جمال کو جس رنگ میں پیش کیا گیا ہے اس کا کون انکار کر سکتا ہے! مگر اسی تورات میں خدا کی طرف ایسی باتیں بھی منسوب کی گئی ہیں جن کے بعد خدا مشکل ہی سے خدا باقی رہتا ہے۔ یہی حال ان تمام مذاہب وادیان کا ہے جنھیں بری بھلی شکلوں میں لوگ مانتے چلے جاتے ہیں۔ والقصة بطولها!

باب دہم:

اسلام کا عملی نظام حیات

①

اچھی طرح سے اس مسئلے کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ قرآن کی طرف عملی زندگی کے اس نظام کو جو میں منسوب کرتا ہوں تو اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ آج آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر اسی کتاب میں آدمی کی عملی زندگی کے اس نظام کے کلیات تروتازہ حالت میں ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہو کر اپنی مکمل ترین شکل میں پائے جاتے ہیں، جن سے اس سلسلے میں رہتی دنیا تک کی پیش آنے والی ضرورتوں کے متعلق احکام اور نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ ورنہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں دنیا کے عام مذاہب و ادیان جنھیں منسوب کرنے والے خالق کائنات کی طرف منسوب کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے اسی کی پابندی کا مطالبہ کیا گیا ہے یعنی حضرات انبیا ورسل علیہم السلام کی طرف منسوب ہونے والی امتوں میں جو دین اور دھرم پایا جاتا ہے اصولاً اسی ''اسلامی نظام'' کی وہ پرچھائیاں ہیں، جن میں کافی ردوبدل، ترمیم و اضافے کے باوجود اب بھی بہت سے عناصر اور اجزا اسی ''اسلامی نظام'' زندگی کے پائے جاتے ہیں۔

اگر یہ سمجھا جائے کہ ''مادیت'' اور ''روحانیت'' کے مقابلے میں دنیا کے سارے مذاہب و ادیان کی ترجمانی اور وکالت کا فرض ادا کیا جا رہا ہے، گویا دنیا کی عام مذہبی قوموں اور پیغمبروں کی امتوں کی ایک صف بنا کر ہم ''مادیت'' اور ''روحانیت'' کے طریقوں کو چیلنج کر رہے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ عملی زندگی کے یہ دونوں ناقص خاکے فطرت کے جبلی مطالبات کو تشنہ اور غیر تشفی یافتہ حال میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ''اسلام'' یا ''اسلامیت'' ہی عملی زندگی کا ایسا کامل و مکمل نظام ہے، جس

میں آدمی کی جبلت کے تمام تقاضوں کے لیے مناسب خوراک مہیا کی گئی ہے۔ صحیح معنوں میں دلوں کی آسودگی اور اطمینان کا کوئی ذریعہ ''اسلامی زندگی'' کے سوا نہ پہلے سوچا گیا ہے اور نہ آیندہ سوچا جا سکتا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ''مادّیت'' یا مادی زندگی گزارنے والوں کا عملی پروگرام جبلت کے جن تقاضوں پر مبنی ہے اور اس لحاظ سے پست سے پست اور بلند سے بلند تر نصب العین جنھیں ''مادّیت'' کی راہوں میں پیش کرنے والے وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے ہیں ان پر بھی تصدیق و تصحیح کی مہر ''اسلامیت'' میں ثبت کی گئی ہے اور عملی زندگی میں ان کو شریک کرلیا گیا ہے۔ اسی طرح فطرت کے جن احساسات پر ''روحانیت'' کی بنیاد قایم ہے اسلام میں بھی عملی زندگی کی تعمیر اسی کو بنیاد بنا کر کی گئی ہے۔ الغرض ''مادّیت'' اور ''روحانیت'' دونوں ہی کے لیے مناسب اور موزوں غذائیں اسلامی نظام میں چوں کہ خود بہ خود مہیا ہو جاتی ہیں، اس لیے عملی زندگی کے اسلامی نظام کے قبول کرنے سے مذاہب و ادیان کی کش مکش کے قصوں سے جیسے فرصت مل جاتی ہے اسی طرح ''مادّیت'' اور ''روحانیت'' کی نہ ختم ہونے والی آویزش کی داستانوں کو بھی...... یہ واقعہ ہے کہ الاسلام یا ''اسلامیت'' کے مسلک نے بے معنی بنا کر رکھ دیا ہے۔ کیوں کہ مادی زندگی کے سارے مطالبوں کی تکمیل کا سامان بھی اس میں موجود ہے اور ''روحانیت'' میں جو کچھ چاہا جاتا ہے اس کو بھی پورا کر دیا گیا ہے۔ ہر ایک کو اس کا مناسب حصہ اس مسلک میں خود بہ خود مل جاتا ہے اور یوں اپنے اپنے فطری مقام پر اسلامی نظام زندگی کے چوکھٹے میں مادّیت اور روحانیت دونوں ہی فٹ ہو کر کھپ جاتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس اساسی نقطۂ نظر کے زیر اثر اسلامی زندگی منظّم ہوتی ہے۔ اس کے قدرتی منطقی نتائج و ثمرات کو سامنے رکھ کر اگر سوچا جائے تو یہ واقعہ ہے کہ ہستی کا یہ پورا نظام ہی ایک مکمل دایرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک ایسا دایرہ جس میں نہ کہیں خلا ہی باقی رہتا ہے اور نہ کس لیے؟ کے سوال کا کوئی پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔ یہی دایرہ ہے جس کا نام اپنی خاص اصطلاح میں میں نے ''دایرۃ الایمان'' رکھ چھوڑا ہے۔ اردو کے عصری میلان کے رو سے آپ کا جی

چاہے تو ''دھرم چکر'' کے نام سے بھی اس کو آپ موسوم کر سکتے ہیں۔

وَلَا مُشَاحَةَ فِي التَّسْمِيَةِ وَالْإِصْطَلَاحِ.

میں نے جو کچھ عرض کیا یہ کوئی شاعری یا کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جس کے لیے غیر معمولی مطالعے اور نئے معلومات کے حاصل کرنے کی ضرورت ہو بلکہ عام مذاہب وادیان، خصوصاً ''اسلام'' کے متعلق اجمالی معلومات بھی جن کے پاس ہیں، ان ہی معلومات کا معمولی جائزہ لیتے ہوئے ہلکی سی منطقی ترتیب ان میں پیدا کر لینے کے ساتھ وہی سب آپ کے سامنے بھی آجائے گا جسے میں پار رہا ہوں۔

آخر خالق کائنات کے تخلیقی مظاہر جسے عالم اور کائنات کہتے ہیں، اس سے استفادے کے حق کا آپ ہی بتایے کہ دنیا کے کسی مذہب اور دین میں انکار کیا گیا ہے؟ قرآن کا تو ورق ورق اسی حق کے اجازت ناموں اور لائسنسوں سے بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ بات کہ بنی نوع انسان کے ہر فرد پر خود اس کی ذات اور صفات کا بھی حق ہے۔ اس پر اس کے بال بچوں، بیوی، ماں، باپ، بھائی، بہن الغرض خاندان والوں کا بھی حق ہے۔ جن لوگوں میں آدمی زندگی بسر کرتا، رہتا سہتا، جیتا مرتا ہے ان کا بھی یعنی اپنی قوم اور وطن والوں کا بھی اس پر حق ہے اور آخر میں یہ کہ سارے انسان خواہ اس وقت موجود ہوں یا آیندہ پیدا ہونے والے ہوں قطع نظر اس سے کہ عام انسانی ہمدردی کی تعلیم سے شاید ہی دنیا کا کوئی مذہب و دین خالی ہو۔ قرآن میں امت سلامیہ کو مخاطب بنا کر:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ. (سورۂ آل عمران: ۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو جو عام انسانوں کی نفع رسانی کے لیے باہر لائی گئی ہے۔''

کا اعلان کرتے ہوئے ''جہاد'' کے نام سے ایک مستقل قانون ہی نافذ کیا گیا ہے۔ جس کے متعلق نہ جاننے والے خواہ جن غلط فہمیوں کے شکار ہوں اور بنانے والوں نے اس لفظ کو جتنا بھی وحشت ناک و مہیب بنا دیا ہو جس میں اسلام کے بعض نادان دوستوں کی دوستی نما دشمنی کو بھی دخل ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنے رب کو اور اپنی قوم کو

باقی رکھنے کے لیے مادی ذہنیت رکھنے والوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کو فنا کے گھاٹ اتارنا ضروری قرار دے رکھا تھا۔ یہی ''تنازع للبقاء'' کا قانون تھا، جس کے زیر اثر دنیا میں لڑائیاں لڑی جارہی تھیں، جنگ وضرب کی صفیں قایم ہورہی تھیں۔ ''تنازع للبقاء'' کا یہ قانون انسانی آبادیوں کا نہیں بلکہ جنگل کے حیوانوں کا قانون تھا۔ اس جنگلی غیر انسانی قانون کو ''جہاد'' کے انسانی قانون سے اسلام میں بدل دیا گیا ہے۔ جسے چاہا جائے تو بجائے تنازع للبقاء کے ''تنازع الا بقاء'' کے نام سے موسوم کردیا جائے۔ جس میں دوسروں تک ابدی زندگی اور بقائے دوام کی ضمانت پہنچانے کے اور ان کو باقی رکھنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ موت کا خطرہ بھی سامنے آجائے تو اس خطرے کو بھی قبول کرلینا چاہیے، یعنی دوسرے زندہ ہوجائیں۔ اس لیے خود کو مرنے پر راضی کرلینا بھی جہاد کے اس قانون کی جوہری روح ہے۔

تفصیلی بحث تو اس پر مستقل باب میں کی جائے گی، سردست میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عام انسانی ہمدردی کا نصب العین جو گویا مادی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین سمجھا جاتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ ''قانون جہاد'' کو نافذ کرکے اسلامی نظام زندگی کا قرآن اسی نصب العین کو صدیوں پہلے ایک اہم ترین جز بناچکا ہے۔ بہر حال ہیومنٹی (عام انسانیت) کے فلاح و بہبود کے نصب العین کو پیش کرکے ''مادّیت'' اپنا دم توڑ دیتی ہے، لیکن یہ بات کہ دنیا کی ساری پیداواروں کے مقابلے میں کرۂ زمین کی پیداوار جس کا نام ''انسانیت'' ہے، خود اس کے وجود کی غرض و غایت کیا ہے؟ عرض ہی کرچکا ہوں کہ ''مادّیت'' اس کے جواب میں مبہوت بن کر رہ جاتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مادّیت میں انسانیت اور ساری سرگرمیاں دیوانے کا بے نتیجہ خواب بن کر رہ جاتی ہے۔

اسلامی زندگی میں اسی سوال کا جواب:

یاقوم اعبدوا اللّٰہ مالکم من الٰہ غیرہ۔ (سورۂ اعراف: ۵۹)

''اے قوم! پوجو اللہ کو نہیں تمہارا معبود (الٰہ) اس کے سوا۔''

دیا گیا ہے۔ حاصل جس کا یہی ہے کہ پیدا کرنے والے خالق نے انسان کو خود اپنے لیے، اپنی عبادت کے لیے، اپنی مرضی پر چلنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ قرآن میں اسی مطلب کو کبھی:

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ.

(سورۂ انبیا: ۹۲)

”یہ ٹولی (انسانوں کی) ایک ٹولی ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں تو مجھ ہی کو تم پوجتے رہو۔“

کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے اور کبھی انسانی وجود کے اسی نصب العین کو سمجھاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ.

(سورۂ مومنون: ۵۳)

”یہ ٹولی (انسانوں کی) ایک ٹولی ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں، پس مجھ ہی سے ڈرتے رہنا۔“

صرف یہی نہیں کہ ”مادّیت“ کے جوہری نقص کا ازالہ اس جواب سے ہوجاتا ہے بلکہ خود بہ خود ”روحانیت“ کا مسلک بھی اسلام کے عملی نظام کے قوام میں کچھ اس طرح سے گھل مل جاتا ہے کہ ”مادّیت“ اور ”روحانیت“ کے سارے اختلافات ختم ہوجاتے ہیں۔ انسانی زندگی کے یہ مختلف نظریے ایک بسیط نظریے کا قالب اختیار کرلیتے ہیں اور اسی کے ساتھ ”روحانیت“ کے مسلک کا سلبی و منفی جز یعنی یہ جو مانا جاتا تھا کہ آدمی تو خدا کے لیے پیدا ہوا ہے، لیکن خود آدمی کے لیے دنیا کی کوئی چیز نہیں پیدا کی گئی ہے۔ اسی لیے ”دنیا گریز“ رجحانوں کی حوصلہ افزائی روحانیت کی سب سے بڑی خصوصیت ہر زمانے میں ٹھہرائی گئی ہے۔ جس حد تک دنیا کی چیزوں سے بے نیاز اور ان کی دست نگری سے اپنے آپ کو آزاد دکھانے میں جو کامیاب ہوئے ہیں اسی حد تک روحانیت کی راہوں میں وہ قدر و عزت کے مستحق قرار دیے گئے ہیں۔ واقعہ یہ

ہے کہ مذہبی اقوام وامم کی تاریخ کا یہ ایک مشترک نقطۂ نظر بن گیا ہے، جس کے اثر سے ہم کسی مذہب یا دین کو مشکل ہی سے مستثنیٰ کر سکتے ہیں۔ خود مسلمانوں کے اندر بھی مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انتہائی غالیانہ شکلوں میں نہ سہی لیکن کسی نہ کسی رنگ میں لوگ اس کو مانتے چلے آئے ہیں، جس پر عن قریب ہم بحث کریں گے۔ واللہ اعلم بالصواب!

اس سلسلے میں جہاں تک فقیر نے غور و فکر سے کام لیا ہے اور جس نتیجے تک پہنچا ہے اس کے ذکر سے دل اگرچہ ہچکچاتا ہے لیکن دل میں جو بات آئی ہے اسے پیش کیے دیتا ہوں، ضروری نہیں کہ حقیقت میں بھی واقعہ یہی ہو۔

بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ عام خدا کی مخلوقات کے متعلق جہاں پر دیکھا جاتا ہے کہ پیدا کرنے والے نے اس کو جس قالب میں پیدا کیا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ یہی اس کا قدرتی قالب ہے۔ پتھر پتھر ہی ہے، درخت درخت ہی ہے، بھیڑ بکریاں بھیڑ بکریاں ہی ہیں، لوگ یہی جانتے بھی ہیں اور یہی مانتے بھی ہیں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کب اور کیوں کن اسباب و وجوہ کے زیر اثر کائنات عالم کی پیداواروں کے جھمیلے میں ایک آدم کی اولاد بنی نوع انسان کے متعلق خدا ہی جانتا ہے فرض کرنے والوں نے کسی زمانے میں یہ فرض کر لیا کہ گو پیدا ہوئے ہیں وہ انسانی قالب میں لیکن واقع میں وہ انسان نہیں بلکہ "ملائکہ" یا "فرشتہ" یا "دیوتا" تھے۔ ملکوتی وجود پر انسانیت کی جھول اوپر سے اڑھا دی گئی ہے، اسی لیے آدمی کا فرض ہے کہ باہر سے اڑھائی ہوئی اس جھول کو پھاڑ کر اپنے آپ کو وہی بنا لے جو درحقیقت وہ ہے، یعنی فرشتہ بن جانے میں کامیاب ہو جانا۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ سب کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا لیکن بڑے مشہور مذاہب میں اسی "عجیب وغریب مفروضہ" کی بنیاد پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ خدا کی بندگی اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا ثمرہ اور انجام آدمی کے سامنے اس شکل میں آئے گا کہ وہ ملک یعنی فرشتہ بن جائے گا۔ بہ الفاظ دیگر اس کا مطلب یہی ہوا اور یہی سمجھا بھی جاتا ہے کہ انسانی فطرت کے

سارے طبعی مطالبات سے آدمی کو محروم کر کے ملکوتی زندگی اس کو بخشی جائے گی۔ اس باب میں ''عیسائی مذہب'' کے ماننے والوں کے رجحانات نے اس حد تک ترقی کی کہ عام مذاہب وادیان میں بہشتی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے قرآن میں بھی اسی نام سے موسوم کر کے اس بہشتی زندگی کا مضحکہ اڑایا گیا۔ تضحیک وتحقیر کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ''عیسائیت'' کے دایرے کو توڑ کر دوسرے مذاہب وادیان کی ماننے والی امتوں میں بھی، حتیٰ کہ مسلمانوں کے بعض طبقات زیادہ تر غیر شعوری طور پر نہ معلوم کیوں اس عیسائی عقیدے سے اس حد تک متاثر نظر آتے ہیں کہ کافی طنز وطعن، بلکہ ناقابل برداشت خشمک قرینوں سے عام مسلمانوں کے قلوب کو مجروح کرنے کا گویا رواج سا ہو گیا ہے۔

آج بھی اگر ڈھونڈھا جائے تو ''قرآنی جنت'' کا استہزائی الفاظ میں تذکرہ کرنے والے نثر میں نہ سہی نظم ہی کے لباس میں تلمیحات وکنایات سے کام لینے والوں کی کافی تعداد آپ کو مسلمانوں میں مل جائے گی۔

اس میں شک نہیں کہ بجائے خود فکری کے اس قسم کی باتیں بنانے والے زیادہ تر تقلیدی روایات ہی سے متاثر ہیں، کچھ سن لیا اور لے اڑے، اس سے زیادہ ان کے اشاروں اور کنایوں کی تہ میں اگر تلاش کیا جائے تو کچھ نہ ملے گا۔ ان بے چاروں کو اس کا قطعاً اندازہ نہیں ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس کی بنیاد کیا ہے اور کس تخم سے یہ درخت پھوٹ کر نکلا ہے؟

بہر حال یہ بات کہ پانی پانی ہی ہے، مٹی مٹی ہے، الغرض جو چیز کچھ بن کر پیدا ہوئی ہے واقع میں بھی وہی ہے، ہر چیز کے متعلق اس کلّیے کو مانتے ہوئے اچانک آدمی صرف آدمی کے متعلق یہ دعویٰ کہ واقع میں وہ فرشتہ ہے جو دنیا میں آدمی بن کر پیدا ہو گیا ہے۔ اس عجیب وغریب مفروضے کی بنیاد کیا ہے؟ کم از کم باوجود انتہائی غور وفکر کے کوئی قابل قبول جواب اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔ فقط اس لیے کہ خالق کائنات نے آدمی کو اپنے لیے پیدا کیا ہے، محض اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی آدمی نہیں بلکہ درحقیقت وہ

فرشتہ ہے۔ اس مفروضے کے فرض کرنے کی ضرورت آخر کیوں پیش آئی؟ اس نصب العین کی تکمیل کے لیے آدمی ہونا کیا کافی نہ تھا؟

بلکہ اگر سوچا جائے تو نظر آتا ہے کہ "ملکوتیت" یا فرشتہ ہونے کا یہ بے بنیاد نظریہ جو بنی آدم کے متعلق گڑھ لیا گیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے اس مفروضے نے تو سارے قصے ہی کو ختم کر کے رکھ دیا۔

قصے سے میری مراد یہ ہے کہ خدا نے عالم کو کیوں اور کس لیے پیدا کیا؟ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں جیسے ضرورت اور حاجت کو پیش کرنا خدا کی خدائی کے منافی ہے یعنی خدا نے اس دنیا کو اس لیے پیدا کیا کہ (معاذ اللہ) وہ دنیا اور دنیا کی چیزوں کا محتاج اور ضرورت مند تھا، بھلا اس قسم کی احمقانہ گستاخی کی کون جرأت کر سکتا ہے۔ اس طرح یہ کہنا کہ خدا کا یہ سارا تخلیقی کاروبار محض بے نتیجہ، لاحاصل و عبث ہے، اس سے تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ خدا ہی کا انکار کر دیا جاتا، تو آپ ہی سوچیے کہ اسی جنون اور دیوانے پن کو خدا کی طرف منسوب کرنے والے درحقیقت خود ہی پاگل ہونے کے سوا کچھ اور بھی ٹھہرائے جا سکتے ہیں؟ صرف وہی تیسرا احتمال رہ جاتا ہے جس سے عموماً انسانی اعمال و افعال کی بھی توجیہ کی جاتی ہے، بلکہ ناگزیر و لابدی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد آدمی جو کچھ کرتا ہے غور کیا جائے تو زیادہ اس کی تہ میں کارفرما یہی قدرتی قانون نظر آتا ہے [1]، یعنی نمود و ظہور، یہی ہر کمال کی فطرت ہے۔ اسی قدرتی قانون

---

[1] مقصد یہ ہے کہ اپنی خاکی زندگی میں آدمی کی پہلی ضرورت ہوا کی ہے جس میں وہ سانس لے۔ قدرت کی طرف سے اس کی تقسیم کا مفت انتظام کر دیا گیا یعنی کسی قسم کی قیمت ادا کیے بغیر ہوا ہر جینے والے کو میسر آ رہی ہے۔ دوسری ضرورت پانی کی ہے۔ یہ ہوا کی طرح مفت تو نہیں ملتا، لیکن اس قدر ارزاں ہے کہ آمدنی کے ہر پیمانے پر بہ آسانی یہ ضرورت بھی ہر شخص کو پوری ہو رہی ہے۔ ضرورتوں میں تیسرا درجہ غذا کا ہے، خواہ کسی رنگ اور شکل میں ہو، پلاؤ قورمہ ہو یا نانِ جویں۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی اپنی آمدنی کے پیمانے کے لحاظ سے اپنی خوراک کو لوگ فراہم ہی کر لیتے ہیں۔ ان ضرورتوں کے بعد لباس، مکان کا مسئلہ ہے، سچ پوچھیے تو ہر شخص کی ذاتی ضرورتیں اسی نقطے پر ختم ہو جاتی ہیں۔ جب آمدنی کے چھوٹے سے چھوٹے پیمانے پر کسی نہ کسی شکل میں ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں تو پھر ساری انسانی سرگرمیوں کی توجیہ و جست۔ ◄

کی تعبیر عارف شیرازؒ نے اپنے اس مشہور شعر میں کی ہے:

من ازاں حسن روزافزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

جس کا مطلب یہی ہے کہ حسن کا جو کمال یوسف میں پایا جاتا تھا وہ ظہور و نمود اس جمال کا فطری تقاضا تھا اور اسی فطری اقتضا نے اپنے ظہور و نمود کے لیے عشق زلیخا کو پیدا کیا، لیکن آئینہ بہر حال آئینہ ہے، اگر وہ ٹوٹ جائے یا سرے سے پیدا ہی نہ ہو تو اس سے حسینوں کے حسن میں ظاہر ہے نہ کوئی عیب ہی پیدا ہوتا ہے اور نہ کوئی بٹہ لگتا ہے۔ اسی مفہوم کو حافظؒ (شیراز) نے اپنی غزل کے دوسرے شعر میں یوں ادا کیا ہے:

زعشق بے کمال ما جمال یار مستغنی ست
بہ آب و رنگ و خط چہ حاجت روے زیبا را

اور حافظؒ تو خیر حافظ ہی ہیں ہماری زبان کے شعرا بھی مختلف وادیوں میں بھٹکتے ہوئے کبھی کبھی الٰہیات کی وادی میں بھی نکل آتے ہیں۔ مرزا داغ مرحوم کا یہ شعر کہ

منہ سے بولے تو کہا آئینہ
کھیل کھیلے تو خود آرائی کا

اس میں ''کھیل کھیلے'' کے نامناسب لفظ کو بدل کر دوسرے مصرعہ کو اگر یوں

◄ ضرورت سے خود ہی سوچنا چاہیے کہ کہاں تک درست ہو سکتی ہے؟ بلکہ واقعہ وہی ہے کہ کمالات جنھیں لے کر آدمی پیدا ہوتے ہیں، آیا حالات و واقعات جن کمالات کو پیدا کرتے رہتے ہیں زیادہ تر ان ہی کے ظہور و نمود کی یہ شکلیں ہیں؟ شعری رجحانات والے اپنی شاعری سے، خطابت کی صلاحیت رکھنے والے اپنی خطابت سے، ہندسی مناسبتوں کے رکھنے والے ریاضی و الجبری سے، ازیں قبیل اسی قسم کے فطری ملکات کے ظہور کی یہ ہنگامہ آرائیاں ہیں، یا ورزش کر کے جو اپنے بازوؤں میں غیر معمولی طاقتوں کو ابھارتے ہیں یا مال، جاہ کی راہ سے جن کے اختیار، اقتدار کے دائروں میں وسعت پیدا ہوتی ہے، ان ہی کمالات کی یہ دنیا نمایش گاہ ہے۔ بہترین سواریوں، اونچی عمارتوں، طمطراق کے دوسرے ساز و سامان کی تہ میں اگر غور کیجیے گا تو کبھی نظر آئے گا کہ اپنے اپنے اختیار، اقتدار کے دائروں کی وسعت و کشادگی کو ان ہی ذرائع سے لوگ نمایاں کر رہے ہیں۔

پڑھا جائے کہ

تھا تقاضا یہ خود آرائی کا

تو یہ واقعہ ہے کہ "کمالات" کے اس نظریے کی یہ بھی ایک دل آویز و دل نشین تعبیر ہوسکتی ہے۔

بہر حال کلمہ "کن" جو داغ کے نزدیک "آئینۂ طلبی" کے مرادف ہے، اسی آئینے میں جن جلوؤں کو ہم دیکھ رہے ہیں ساری کائنات ہی اسی کلمۂ "کن" کے مظاہرے ہیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس لحاظ سے عالم کا ذرہ ذرہ، تنکا تنکا، پتا پتا خدائی کمالات کی نمائش گاہ ہے، لیکن بہ ایں ہمہ یہی دیکھا بھی جارہا ہے کہ قامت میں خواہ جتنا بھی کہتر اور چھوٹا نظر آتا ہو لیکن "قیمت" میں آدمی کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ انواع و اصناف کی خصوصیتوں کی بحث و تحقیق کرنے والے بھی اسی نتیجے تک پہنچ رہے ہیں کہ ارتقائی کمالات کا آخری نقطۂ عروج ساری کائنات میں انسان اور انسانیت ہی ہے اور یوں بھی دیکھنے والی آنکھیں تسخیری و اقتداری آثار کے ان نظاروں کو کیسے جھٹلا سکتی ہیں کہ عناصر پر، جمادات پر، نباتات پر، حیوانات پر اور کیا کیا بتایا جائے کہ کن کن چیزوں پر انسان چھایا ہوا ہے اور چھاتا چلا جارہا ہے۔ مشاہدے سے بھی اس کی تصدیق ہورہی ہے اور تاریخ کے نامعلوم زمانے سے یہی سنایا بھی جارہا ہے۔ تورات ہی کے پہلے باب میں ہے کہ

> "پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کے مانند بنائیں اور وہ سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپایوں اور تمام زمین اور سب جانداروں پر جو زمین پر رینگتے ہیں اختیار رکھیں۔"
>
> (کتاب پیدائش: باب ا، صفحہ ۲۶)

خود ہمارا وطن ہندوستان جو مذہبی اقلیموں میں دنیا کا شاید سب سے زیادہ پرانا اقلیم اور خطہ سمجھا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کی بلندی و برتری کے اس پہلو سے وہ بھی نامانوس نہ تھا۔ مہابھارت تک جیسی عام متداول کتابوں میں ایسے فقرے

ہمیں مل جاتے ہیں۔ مثلاً شانتی پرب کا وہ حصہ جسے ''موکش دھرم برتن'' کہتے ہیں، اسی کے ساتویں ادھیائے میں ہے کہ

''منش (آدمی) دیوکی مورت ہے۔''

مہابھارت کے مترجم نے اس کے نیچے لکھا ہے:

''آدمی پرمیشر (خدا) کی صورت ہے۔''

بھی اس فقرے کا مطلب ہے۔ اس شانتی پرب کے اسی حصے کے سولھویں ادھیائے میں یہ بھی ہے کہ

''یہ منش ویھ (قالب انسانی) بڑا اتم (شریف) ہے۔''

آگے لکھا ہے کہ

''اس ویھ (قالب انسانی) سے آتما روح کی رکھشا (حفاظت) سے شبھ کرموں (اعمال حسنہ) کو حاصل کرنا ممکن ہے۔''

اور وید کا حوالہ دیتے ہوئے اسی موقع پر بیان کیا ہے کہ ''اسی ویھ (قالب) سے وید کے بہ موجب منش انیک (طرح طرح) کے دھرم کرم کرسکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سمبک (سامی) نسلوں کی بھی اور آریائی خاندانوں کی یہ جانی پہچانی حقیقت تھی۔ قرآن میں جسے زیادہ صاف واضح اور کھلے کھلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ. (سورۂ تین:۴)

''ہم نے انسان کو سب سے زیادہ حسین قالب پر پیدا کیا۔''

کا جو حاصل ہے:

''ہم نے اس کو (آدم کو) اپنے دونوں ہاتھوں سے گڑھا ہے۔''

جو قرآنی الفاظ خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (سورۂ زمر:۷۵) کا ترجمہ ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ ''میں نے آدم میں اپنی روح پھونکی۔'' نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (سورۂ حجر:۲۹) کے یہی معنی ہیں اور گو قرآن میں یہ الفاظ نہیں پائے جاتے، لیکن ہمارے

یہاں بھی خلقَ اللّٰہُ اٰدمَ علٰی صُوْرَتِہ ''پیدا کیا آدم کو اللہ نے اپنی صورت پیدا۔''

سچ پوچھیے تو یہ اور ان ہی جیسے دوسرے تفصیلات کو قرآن نے صرف ایک لفظ ''خلیفہ'' میں کچھ اس طریقے سے بند کر دیا ہے کہ شکوک و شبہات جو اس سلسلے میں پیدا ہوتے ہیں ان کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے اور جو مقصود ہے اس کی صحیح ترجمانی کے لیے اس سے زیادہ بہتر، زیادہ موزوں لفظ شاید سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ حاصل جس کا یہی ہے کہ انسان خدا تو نہیں ہے اور جو مخلوق بن کر پیدا ہوا ہو، ظاہر ہے کہ وہی خدا یعنی ایسا وجود کیسے بن سکتا ہے جسے کسی نے پیدا نہ کیا ہو، لیکن باوجود مخلوق ہونے کے خلیفہ کے لفظ سے یہی بتانا مقصود ہے کہ خدا کی خدائی کی نمایندگی اپنے ان صفات و کمالات کی راہوں سے آدمی کا وجود کر رہا ہے۔ جو خدا کی طرف سے اس کو بخشے گئے ہیں۔ خدا نے آدمی کو اپنی صورت پر بنایا ہے، اس کا یہی مطلب ہے [1]۔

اب اس کے بعد مثلاً آپ سے پوچھتا ہوں کہ کسی لاغر اور مریل، نحیف و نزار، مدقوق و مسلول آدمی کو دنگل میں نیچا دکھا کر اپنی پہلوانی کے کمال کی کوئی پہلوان نمایش کر رہا ہو، پہلوانی کے کمال کی نمایش کی صحیح شکل یہ ہو سکتی ہے یا اپنے جوڑ کے پہلوان کو اپنے قدموں پر جھکا کر جو دکھا رہا ہے، پہلوانی کے کمال کا واقعی اور قدرتی آئینہ یہ نظارہ ہی ہے؟

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ ''صورت'' کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو عموماً اس سے چہرے کے ان امتیازی خصوصیات ہی کی طرف ذہن آدمی کا منتقل ہوتا ہے، جن کا تعلق قوت باصرہ یعنی بینائی سے ہے، لیکن ظاہر ہے کہ جو چیزیں سونگھی جاتی ہیں، چکھی جاتی ہیں، سنی جاتی ہیں، چھوئی جاتی ہیں، سب ہی اپنے اندر ایسی امتیازی خصوصیتیں رکھتی ہیں۔ ان ہی راہ سے مثلاً خس کے عطر کو گلاب کے عطر سے یا مرغ کی آواز کو یل کی آواز سے، مٹھائیوں کے مزوں کو نمکین چیزوں کے مزوں سے ہم جدا کرتے ہیں اور یہی امتیازی خصوصیات ان چیزوں کی صورتیں ہیں، آدم کو خدا نے اپنی ہی صورت پر پیدا کیا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ آدمی کو خدا نے اپنے صفات و کمالات کا مظہر بنایا ہے یا یوں کہیے کہ خدائی صفات کی نمایندگی انسانی وجود کرتا ہے۔ خلیفہ کا لفظی ترجمہ ''نمایندہ'' ہے۔ یہی میرا مطلب ہے کہ ''خلیفہ'' کا لفظ سارے شکوک و شبہات کی تاریکیوں کو مٹا دیتا ہے۔

جو خود ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

گلیوں اور کوچوں میں ٹھوکریں کھانے والے گداگروں کی فروتنی بھی کوئی فروتنی ہوئی؟ سعدیؒ نے لکھا ہے اور ٹھیک لکھا ہے:

تواضع ز گردن فرازاں نکوست

جھکی ہوئی گردنوں کو آپ جھکائیں گے کیا، وہ تو خود ہی جھکی ہوئی ہیں۔ کھنچی ہوئی گردنوں کا جھکا دینا کمال ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے۔

''کمال نمائی'' کے اسی معیار کو اپنے سامنے رکھ لیجیے اور سوچیے کہ ساری کائنات پر تسخیری اقتدار رکھتے ہوئے گویا عالم کو اپنے قدموں پر جھکائے ہوئے، خلافتی اور خدانمائی کے ان سارے خصوصیات کے ساتھ جن سے انسانی وجود سرفراز کیا گیا ہے ان سب کو لے کر جو اپنے آپ کو اپنے خالق اور پیدا کرنے والے خدا کے لیے بنا رہا ہے، جو کچھ بھی اس کو ملا ہے سب ہی کو لے کر خدا کے قدموں پر یہ کہتے ہوئے جو گر جاتا ہے کہ میرا کچھ نہیں ہے، سب آپ کا ہے، اپنے عجز و مسکنت، اپنی عبدیت و بندگی کو اس طریقے سے پیش کر کر کے جو ثابت کر رہا ہے کہ خدا ہی کے لیے وہ بنایا گیا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ عبدیت و بندگی کا یہ قالب خدا کی خدائی اور اس کے جلال و جبروت کا آئینہ بننے کا قرار واقعی طور پر مستحق ہو سکتا ہے یا بجائے اس آدمی کو فرشتہ اور ملک بنانے کے لیے چن چن کر ان خصوصیتوں سے محروم کیا جائے جو اس کے عہدۂ خلافت کے لازمی اقتضا آتے ہیں۔ کائنات میں جو کچھ ہے اس کے متعلق پھیلایا جائے کہ ان کو اپنے زیر اقتدار لانے اور اپنی تسخیری قوتوں کی آماجگاہ بنانے کی جگہ چاہیے کہ جس حد تک ان چیزوں سے آدمی بھاگ سکتا ہو بھاگے اور اسی بنیاد پر پانی بھی اس کے منہ سے چھینا جائے، کھانا بھی چھینا جائے، کپڑے بھی اتار لیے جائیں، حتیٰ کہ ناک بند کر کے حکم دیا جائے کہ سانس لینے میں بھی جہاں تک ممکن ہو ہوا سے پرہیز ہی کرنے کی کوشش کرے اور یوں فرشتہ نہ سہی، آدمی کو فرشتہ نما بنا کر ''روحانیت''

اور ''رہبانیت'' کے مسلک میں جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہی فرشتہ نما آدمی خدا کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟

وہی عامیانہ مثال کی ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی؟ اب اس کے بعد باقی ہی کیا رہا، جسے خدا کے سامنے لے کر وہ آیا ہے، اللہ اللہ سب سے اونچا، سب سے بلند، سب کا آقا یعنی خدا کا خلیفہ بن کر خدا کے سامنے جو جھک جاتا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ تنہا وہی نہیں جھکا وہ سب جو اس کے زیر اقتدار و اختیار ہیں، وہ بھی جھک جاتے ہیں، زمین بھی جھکتی ہے، آسمان بھی جھکتا ہے، شجر بھی، حجر بھی، بحر بھی، بر بھی، جمادات بھی، نباتات بھی، عناصر بھی، مرکبات بھی، سفلیات بھی، علویات بھی، سب ہی جھک جاتے ہیں۔

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ الانسان کے خلافتی پہلو کے راز کا افشا کرتے ہوئے قرآن میں جو اس کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ملائکہ یعنی فرشتوں کو خدا نے اس خلیفہ انسان کے آگے جھکنے کا حکم دیا اور اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے:

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ. (سورۂ ص:۷۳)

''سب کے سب جتنے فرشتے تھے آدم کے آگے سر بہ سجود ہو گئے۔''

کی اطلاع جو دی گئی ہے، جہاں اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عالم محسوس کے مختلف طبقات و انواع کے نظم و ضبط کا تعلق غیب کی جن زندہ ہستیوں سے ہے ان ہی ملائکہ کو جھکا کر یہ بتایا جا رہا تھا کہ سارے عالم پر اقتدار قایم کرنے کی اور ان کو مسخر کر کے اپنے قابو میں لانے کی صلاحیت انسان میں رکھی گئی ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ اسی کے ساتھ ''الانسان'' کو ملک یا فرشتہ بنا کر خدا کے سامنے پیش کرنے کا جو مغالطہ آیندہ پیدا ہونے والا تھا اس مغالطے کا ازالہ شروع ہی میں کر دیا گیا تھا۔ اسلامی حقایق کے عصری ترجمان کا مشہور زبان زد شعر:

در دشت جنون من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

میں اسی حقیقت کی طرف شاعرانہ رنگ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی جب بنی اسرائیل نے یہ خواہش کی کہ دوسری قوموں نے مخلوقات کو جیسے اپنا معبود بنا رکھا ہے ہمارے لیے بھی کچھ اسی قسم کے ''الٰہ'' یا ''معبودوں'' کو نامزد کر دیجیے، تو جھنجلا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی رسوم پرست تقلیدی امت کو سمجھایا تھا، قرآن میں ان کا تاریخی فقرہ اب تک محفوظ ہے، ارشاد ہوا تھا:

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ.

(سورۂ اعراف: ۱۴۰)

''موسیٰ نے کہا: کیا اللہ (یعنی خالق کائنات) کے سوا تمہارے لیے میں کوئی دوسرا پرورش کرنے والا پروردگار ڈھونڈوں؟ حالاں کہ اس نے سارے عالمین (مخلوقات) پر تمھیں برتری عطا فرمائی ہے۔''

اور سچ تو یہ ہے کہ فرشتہ ہی بنا کر آدمی کو خدا کے سامنے جھکانا مقصود تھا تو بہ قول ان ہی فرشتوں کے ایک نئی مخلوق (انسان) کے پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ انھوں نے کہا کہ آپ کی تسبیح و تقدیس کے لیے کیا ہم کافی نہیں ہیں؟ اور ملائکہ ہی کیا صرف ''جھکنے'' اور ''بندگی'' و عبدیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو جیسا کہ قرآن ہی میں فرمایا گیا ہے:

وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ. (سورۂ آل عمران: ۸۳)

''آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اس کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔''

اسی مضمون کو دوسری جگہ ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ. (سورۂ حج: ۱۸)

''کیا تو نہیں دیکھتا کہ خدا کے آگے سجدہ ریز ہیں وہ ساری چیزیں جو آسمانوں

میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہے، سورج بھی، چاند بھی، تارے بھی، پہاڑ بھی، درخت بھی، رینگنے والے سارے جانور بھی۔''

پھر سارے خلافتی کمالات وخصوصیات سے پر قینچ کر کے غریب آدمی کو لُنڈ منڈ (مفلس اور تنگ دست) فرشتہ بنا کر خدا کے سامنے ہم لائے بھی تو کیا بڑی سوغات اور کون سا بڑا نادر الوجود تحفہ لائے؟ اس کے تماشوں سے تو سارا عالم ہی بھرا ہوا تھا۔

ہاں! ''سب کچھ'' رکھتے ہوئے ''کچھ نہیں'' بن کر خدا کے سامنے کھڑا ہو جانا، سب سے اونچے ہونے کے بعد اپنے آپ کو خدا کے آگے سب سے زیادہ نیچا بنا کر پیش کرنا، خدا کی خدائی اور اس کے جاہ وجلال، اس کی لاہوتی شوکت وسطوت کی تجلی ونمایش کا یہی واحد ''آئینہ'' ہے جو صرف آدمی کو دیا گیا ہے۔ اسی ''آئینے'' کو لے کر خدا کے سامنے جب وہ حاضر ہوتا ہے تو اس میں جیسا کہ چاہیے خدا کی تجلیاں تڑپ اٹھتی ہیں۔ آخر جس کے جھکنے کے ساتھ ہی ساری کائنات ہی جھک جاتی ہو اس تماشے کو آپ ہی بتایئے خدا کے اس خلیفہ انسان کے سوا اور پیش ہی کون کر سکتا ہے ❶۔

---

❶ سب کچھ رکھتے ہوئے ''میرا کچھ نہیں'' اس کا اعتراف واقعے کا اعتراف ہے، لیکن خدا جس میں جو کچھ ہے سب اپنا ہے، کسی غیر سے اس کو کچھ نہیں ملا بلکہ غیروں کو جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سب کچھ رکھتے ہوئے اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنے اور کچھ نہ بنا لینے کے فیصلے کی گنجایش خدا میں بھی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ کہنے والوں نے اگر کہا کہ خدا کا خدائی کی تجلی ونمایش کا جو آئینہ آدمی کے پاس ہے خدا کے پاس بھی یہ آئینہ نہیں ہے۔ غالباً اس کا مطلب یہی ہے۔ یہ تو بے چارا آدمی ہے کہ خلیفہ بن کر پیدا ہوا اور بندہ بن کر مرتا ہے۔ سب کچھ رکھتے ہوئے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے خدا کے قدموں پر یہ کہتے ہوئے گرتا ہے کہ ہمارا کچھ نہیں ہے، سب آپ کا ہے:

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

ڈاکٹر اقبال کے شعر کا یہی مطلب ہے۔

میں جو یہ وعدہ کرتا چلا آ رہا تھا کہ آدمی کو خدا نے صرف اپنے لیے پیدا کیا ہے، اس کا مطلب آئندہ بیان کروں گا۔ میں خیال کرتا ہوں وہ مطلب ان شاء اللہ ادا ہو گیا اور وعدہ بھی پورا ہو گیا۔ مقصد یہی ہے کہ جھکنے کے لیے تو آدمی بھی اسی طرح پیدا کیا گیا ہے جیسے سب پیدا ہونے والی مخلوقات اپنے خالق کے آگے جھکی ہوئی ہیں، لیکن ایسا جھکنے والا جس کے آگے سب جھکائے گئے ہیں یہی وہ ''الانسان'' خلیفہ ہے۔ اپنے آپ کو چھوٹا اور نیچا بنا کر آدمی بھی خالق کے آگے پیش ہوتا ہے، لیکن اس کی یہ خصوصیت ہے کہ مخلوقات میں سب سے بڑا بننے کے بعد یہ چھوٹا بنتا ہے، سب سے اونچا ہونے کے بعد اپنے آپ کو نیچا بنا کر اپنے مالک کے قدموں پر گرتا ہے، اس کو اختیار دیا گیا ہے اور کیسا اختیار؟ کہ جس نے اس کو پیدا کیا ہے، سب کچھ بخشا ہے، چاہے تو اس کی مرضی پر چلے بھی اور نہ چاہے تو اس کی مرضی سے وہ ٹکرا بھی سکتا ہے؟ حد ہے اس کے اقتداری دایرے کی اس وسعت اور خودمختارانہ مطلق العنانی کی؟ ان میں کتنے ہیں جن کی ساری زندگی اپنے خالق کی مرضیات سے ٹکرانے اور مالک کے احکام کے ٹھکرانے ہی میں گزرتی ہے۔

خلیفہ بن کر جینے میں اور بندہ بن کر مرنے کا ان سے جو مطالبہ ان کے خالق نے کیا ہے اس مطالبے کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ یہی نمارده، فراعنہ، جبابرہ، دجاجلہ کا طبقہ اور ان کی ذریت ان کے چیلے چانٹے ہیں، ان کی ساری زندگی اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ جنگ اور تصادم میں گزرتی ہے۔ یہ بنی آدم کے وہ چوہے ہیں جو پنساری کی دکان کے سامانوں کو دیکھ دیکھ کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے رہتے ہیں۔ ان ہی کے سامنے زندگی ہی ایک ایسے دور کو لے آئی ہے جس میں وہ پاتے ہیں کہ ان کے خالق کا ہر ارادہ اور اس کا قانون ان کی ہر خواہش اور ارادے سے ٹکرا رہا ہے۔ ٹکرانے والوں کی زندگی کا یہی تجربہ، مذہبی زبانوں میں جہنم، دوزخ، نرکھ وغیرہ کے ناموں سے مشہور ہے، لیکن سب کچھ رکھتے ہوئے جو واقعۃً اس کے اعتراف کو اپنی زندگی کا اٹل اور غیر متزلزل فیصلہ بنا کر جیتے ہیں کہ ''درحقیقت ہمارا کچھ نہیں ہے'' اسی بنیاد پر اپنے اختیار و

اقتدار کو ان ہی حدود تک محدود رکھنے میں پختہ عزم سے کام لیتے ہیں، جن پر اختیار و اقتدار کا بخشنے والا ان کو رکا اور ٹھہرا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ یعنی خدا سے ٹکرانے اور اس کے احکام و فرامین کے ٹھکرانے کی جگہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کی مرضی کے مطابق جئیں بھی اور اسی حال میں مریں بھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو انسانی وجود کے قدرتی نصب العین یعنی:

خدا نے آدمی کو اپنے لیے بنایا ہے

اسی نصب العین کی تکمیل کر کے مرتے ہیں، نبوات و رسالات کی بنائی ہوئی راہوں پر وہ چل رہے ہیں۔ حضرات انبیا و رسل علیہم السلام کی یہ امتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ توافق کی یہ زندگی ان کے سامنے اس حال کو اگر لائی ہے کہ خدا اور اس کے سارے قوانین ان کی ہر خواہش اور ارادے کے مطابق ہے، جو کچھ وہ چاہتے ہیں خدا وہی ان کے لیے کرتا رہتا ہے، تو سوچنا چاہیے کہ اس کے سوا اور ہوتا کیا؟

بہر حال سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ نہیں بن کر کھڑا ہو جانا، جہاں رکنے کے لیے کہا جائے رک جانا اور ٹھہرنے کا حکم دیا جائے ٹھہر جانا، اپنی بندگی و عبدیت، مسکنت و ذلت، فقر و احتیاج، عجز و نیاز کے اس آئینے کو لے کر جو اپنے خدا کے سامنے لے کر بڑھتا ہے، جو اس کا واحد ذاتی سرمایہ ہے، ایسا ذاتی سرمایہ عرض ہی کر چکا ہوں کہ خدا کے پاس بھی جو نہیں ہے تو خدا بھی اپنے ذاتی سرمایہ یعنی قوت و قدرت کے ساتھ اس کی طرف اگر متوجہ ہو تو اس کے سوا آخر دوسرا احتمال ہی کیا ہے؟ آخر لے دے کر حاصل یہی تو ہوا کہ بندہ خدا کے آگے اپنی عاجزی میں عاجزی کا اضافہ کرتا چلا جاتا ہے اور خدا بندے میں اپنی قوت و قدرت کو بھرتا چلا جاتا ہے۔ بہ قول مولانا رومؒ:

چوں از وگشتی ہمہ چیز از گشت

مَنْ لَهُ الْمَوْلٰى فَلَهُ الْكُلُّ

❁ ❁ ❁

باب یازدہم:

اسلام کا عملی نظام حیات

(۲)

(دایرۃ الایمان)

عملی زندگی کے اسلامی نظام کے متعلق میں نے جو یہ عرض کیا تھا کہ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وجود اور ہستی کا سارا نظام ہی ایک ایسے کامل اور مکمل دایرے کی شکل میں ہمارے سامنے گھوم رہا ہے جس کے مختلف حصوں میں ''مادّیت'' و ''روحانیت'' اپنے اپنے طبعی مقام پر نظر آتی ہیں کہ فٹ ہوگئی ہیں۔ آخراب تک جو کچھ عرض کر چکا ہوں، آپ نے غور سے اس کو اگر پڑھا اور سمجھ لیا ہے تو انسانی زندگی کے اسلامی نظام اور اس کے نتایج کا حاصل مختصر لفظوں میں یہی تو ہوا کہ

یہاں جو کچھ ہے سب کو خدا نے انسان کے لیے پیدا کیا ہے اور انسان چوں کہ براہ راست خالق کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس لیے اس کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ انفرادی یا اجتماعی جس رنگ میں بھی انسانیت پائی جائے اس کے تکریمی و احترامی حقوق کو ادا کرتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے لیے بناتا چلا جائے۔ تب وہ پائے گا کہ خدا بھی اس کے لیے بنا ہوا ہے۔ اسی سے ہم آہنگی اور توافق کا طبعی دایرہ بن جاتا ہے، لیکن خدا کے لیے اپنے آپ کو انسان اگر نہ بنائے بلکہ تصادم و تخالف اور ٹکراؤ ہی کے مشغلوں میں زندگی گزار کر مرے گا تو خدا، خدا کے ارادے، خدا کے قوانین کو بھی پائے گا کہ اس کے ہر ارادے اور اس کی ہر خواہش سے ٹکرا رہے ہیں۔ اسی سے تصادم و تخالف کا غیر طبعی دایرہ بنتا ہے۔ گویا ایک ہی قوسی ساق سے طبعی اور غیر طبعی دو کامل دایرے بن جاتے ہیں ❶۔

❶ جس کی تصویر کوئی کھینچنا چاہے تو اشارے کے لیے ایک ہی قوسی ساق الف، ب سے تعبیر ہونے ◄

ان دونوں دایروں میں تخالف وتصادم سے پیدا ہونے والا دایرہ اس لیے غیر طبعی ہے کہ پیدا کرنے والے نے آدمی کو جس فطرت ونہاد پر پیدا کیا ہے اسی فطرت کے قدرتی اور جبلی اقتضاؤں سے بغاوت وسرکشی پر اس کی بنیاد قایم ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم آہنگی اور توافق کا دایرہ جس کا نام میں نے ''دایرۃ الایمان'' یا ''دھرم چکر'' رکھ دیا ہے، چوں کہ انسانی فطرت کے جبلی اقتضاؤں کے محور پر وہ گھومتا ہے اس لیے ایمانی دایرہ فطری اور طبعی دایرہ ہے۔

◄ والے دو دایروں کا خاکہ اس طرح سے بنایا جا سکتا ہے یعنی الف، ب۔ اسی بنیاد کی قوسی ساق فرض کیجیے اور اسی بنیاد کو بنا کر دو متوازی دایرے اس طریقے سے بنا لیجیے۔

یوں اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اب تک وجود کے یہ دونوں دایرے کس طرح گھومتے رہتے ہیں۔ ان دونوں دایروں میں توافق کا دایرہ تو طبعی دایرہ ہے کہ ہستی کا یہ نظام اسی مقصد کے لیے قایم ہوا ہے، ◄

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس ایمانی دایرے کا ایک حصہ تو بجنسہٖ وہی ہے جو مادّیت کے مسلک میں مانا اور کیا جاتا ہے۔ میں بھی کہہ چکا ہوں اور اس سے کون ناواقف ہے کہ عملی زندگی کے اسلامی نظام میں کایناتی پیداواروں سے استفادے کو آدمی کا پیدایشی اور قدرتی حق قرار دیتے ہوئے طبایع اور ظروف کی پستی و بلندی، تنگی و فراخی کے لحاظ سے مادی زندگی کے زیر اثر انسانیت کے لیے جو کچھ کیا جاتا ہے یعنی شخصی زندگی سے شروع کر کے خاندانی، قومی، عام بنی نوع انسان کی ذمہ داریاں مادّیت میں جو بیدار ہوتی ہیں، اسلامی نظام زندگی میں سب ہی شریک اور داخل ہیں، ہم ان میں سے ہر ہر ذمہ داری پر مستقل ابواب میں ان شاء اللہ اگر اجل مسمی نے فرصت دی تفصیلی بحث کریں گے اور ہر ہر باب کے قوانین و دفعات جو اسلامی فقہ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں اللہ نے چاہا تو آپ کے آگے رکھے جائیں گے۔

➤ لیکن خلافتی اقتدار و اختیار کی قوتوں کے غلط استعمال سے تخالف و تضاد سے غیر طبعی دایرہ بھی بن جاتا ہے۔ فساد اور خوں ریزی کا جو الزام فرشتوں نے آدم کو خلیفہ بنانے کے موقع پر لگایا تھا بہ ظاہر اس کا اشارہ خلافت کے اقتدار و اختیار کے اسی غلط استعمال کی طرف تھا جس کا جواب دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ خدا سے علم و آگہی حاصل کرنے کی فطری صلاحیت آدمی میں پائی جاتی ہے۔ اس علم و آگہی کے مطابق زندگی گزارنے کی جو کوشش کرے گا وہ استعمال کی اس غلطی سے محفوظ ہو جائے گا۔ غلطی کرے گا بھی تو پھر اپنے آپ کو درست بھی کر لے گا۔ حضرات انبیا و رسل علیہم السلام تو براہ راست اس علم و آگہی کو خدا سے حاصل کرتے ہیں اور ان پر ایمان لانے والوں تک یہی علم الٰہی یعنی خدا کے مرضیات کا علم جسے دین و مذہب کہتے ہیں، پہنچا ہے۔ انجانی باتوں کو نہ جاننے کی قابلیت و استعداد آدمی ہی کی فطرت میں ہے۔ شاید اس کی اسی فطری خصوصیت کو یہاں بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ سورۂ اقراء میں انسانی فطرت کی اس خصوصیت کی طرف عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ کے الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے میری دوسری کتابوں کا مطالعہ کیجیے۔ توافق و تخالف کے ان ہی دونوں دایروں کو جس کے لیے اتنی غیر معمولی طول بیانی سے مجھے کام لینا پڑا، مولانا رومیؒ نے صرف ایک شعر، بلکہ ایک ہی مصرع میں خلاصہ کر دیا ہے۔ یعنی وہی مصرع ''چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت۔'' ایک دفعہ اسی مصرع کو پڑھیے اور گشتن کے معنی ''ہونا'' لیجیے، پھر پڑھیے اور ''پھرنا'' گشتن کا ترجمہ کیجیے۔ سب کچھ اسی ایک مصرع میں آ گیا ہے۔ یعنی آدمی جب خدا کے لیے ہو جاتا ہے تو خدا بھی اس کے لیے ہو جاتا ہے، آدمی جب خدا سے پھر جاتا ہے تو خدا بھی اس سے پھر جاتا ہے۔ الجنت و النار اسی کا نام ہے۔

بہرحال یہاں تک تو ''دایرۃ الایمان'' میں وہ سب کچھ آجاتا ہے جو ''مسلک مادّیت'' میں سوچا اور کہا جاتا ہے، لیکن توافق کا یہ ایمانی دایرہ اسی نقطے پر ختم نہیں ہوجاتا ہے بلکہ خود انسان کو خدا کے لیے قرار دیتے ہوئے، ''روحانیت'' کو بھی اسی دایرے میں سمودیا گیا اور اس کے قوام حقیقت میں داخل کردیا گیا ہے، بلکہ عرض کرچکا ہوں کہ اسلامیت کا بنیادی پتھر اسی واقعے کو یعنی آدمی خدا کے لیے پیدا ہوا ہے کو ٹھہرایا گیا ہے۔ بار بار دہرا چکا ہوں کہ نبوات و رسالات کی تاریخ کی پیشانیوں کا سب سے پہلا امتیازی طغرا

يَاقَوْمِ اعْبُدُو اللّٰهَ مَالَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ. (سورۂ اعراف:۵۹)

''لوگو! اللہ ہی کو پوجو، تمہارا الٰہ و معبود اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔''

ہی کو قرآن میں بتایا گیا ہے۔ اسلامی زندگی کا سارا فلسفہ اسی پر مبنی ہے۔ اس وقت بھی جن چیزوں سے آدمی مستفید ہورہا ہے اور آیندہ جو کچھ بھی اس کے سامنے پیش آئے گا بہ تفصیل بتاچکا ہوں کہ ان ساری باتوں کا دارومدار اسی پر ہے کہ خالق کاینات کو اپنا الٰہ اور معبود آدمی بناتا ہے یا نہیں؟ یہی ایمانی دایرے کی روح ہے۔ یہ ہے تو سب کچھ ہے اور یہ نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے۔ ''دایرۃ الایمان'' میں ''روحانیت'' کے اس عنصر کو جس طریقے سے شریک کیا گیا ہے اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی کے تحت جو قدم بھی آدمی کا اٹھتا ہے خدا ہی کے لیے اٹھتا ہے۔ اس سلسلے میں انفرادی اور اجتماعی کسی حیثیت سے جو کچھ انسانیت کے لیے کیا جاتا ہے یا آدمی خود اپنی ذات کے لیے، اپنے خاندان کے لیے، اپنی قوم کے لیے، اپنے ابنائے جنس کے لیے بڑا یا چھوٹا جو کام بھی انجام دیتا ہے، چوں کہ اسی لیے انجام دیتا ہے کہ خدا ہی نے اس کا حکم دیا ہے۔ قدرتاً اسی کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خدا سے اجر و صلے کا جایز استحقاق اس کو حاصل ہوجاتا ہے۔ آخر سب کچھ جو خدا کے لیے کررہا ہے، خدا سے جزا اور مزدوری پانے کا حق اس کو حاصل نہ ہوگا تو کیا مادی ذہنیت رکھنے والے اس کے مستحق ہوسکتے ہیں؟ جن کے کسی عمل اور فعل کا رخ خدا کی طرف نہ ہوتا ہے اور نہ اس رخ کو وہ اپنے سامنے رکھنا

چاہتے ہیں، یقیناً بڑے سے بڑا کام ہی مادی مسلک رکھنے والوں سے کیوں نے بن آئے، ایسا کام جس سے رہتی دنیا تک ہر متنفس کو فایدہ پہنچتا رہے، یا اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانیاں ہی ان کی طرف سے کیوں پیش نہ ہوئی ہوں، جان تک کیوں نہ نچھاور کردی گئی ہو، لیکن خدا کے لیے جو کام کیا ہی نہیں گیا ہے، خدا سے اس کے اجر کی خود ہی سوچیے آخر کس بنیاد پر توقع کی جائے؟ بجائے خود مادی نقطۂ نظر والے عموماً اس کی توقع رکھتے بھی نہیں [1]، ان کے مسلک کا یہی تو جوہری نقص ہے کہ جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں انجام اور نتیجے کو سوچے بغیر کرتے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کو دیوانوں کا خواب اسی لیے تو میں کہتا چلا آرہا ہوں، جو بھی فکر معقول سے کام لے گا اس کا فیصلہ بھی یہی ہوگا کہ آخری نتیجہ (فاینل ریزلٹ) مادی زندگی کا کچھ نہیں ہے۔

بہر حال بنی آدم کی عملی زندگی کا جو نظام نبوات و رسالات کی طرف سے عموماً پیش ہوتا رہا ہے، جس کی آخری تکمیلی قالب کی طرف ''اسلام'' کے نام سے آخری نبوت کی آخری کتاب میں دعوت دی گئی ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ایک کامل و مکمل دایرے کی شکل میں ہستی کے پورے دایرے ہی کو سوچنے والوں کے آگے وہ پیش کردیتا ہے۔ ایسا دایرہ جس میں کہیں خلا نہیں ہے۔ اس دایرے کے جس حصے اور نقطے پر آپ انگلی رکھ دیں گے آغاز کے ساتھ انجام کا یا ابتدا کے ساتھ انتہا کا نقطہ بھی وہ بن جائے گا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا وجود کے تینوں ارکان یعنی کاینات (یا ماوراے انسانی مخلوقات) انسان، خالق (خدا) ان تینوں کے متعلق کس لیے؟ کا سوال اٹھا کر دیکھیے، اس ایمانی دایرے یا ''دایرۃ الایمان'' میں ہر ایک کا جواب ملتا چلا جائے گا۔ پوچھیے کاینات کس لیے ہے؟ اسی دایرے میں ان کو اس کا جواب مل جائے گا کہ انسان کے لیے ہے۔ انسان کس لیے ہے؟ خدا کے لیے اس کا جواب جہاں آپ کے

---

[1] ہاں ان میں کبھی کبھی ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو خدا کے مرضیات سے واقف ہونے کے قدرتی ذرایع یعنی نبوت و رسالت سے بے تعلق رہنے کے باجود اپنے خود آفریدہ وسوسوں کو خدا کی مرضی ٹھہرا کر باور کرلیتے ہیں کہ ہم خدا ہی کی مرضی کی تعمیل کررہے ہیں۔ حالاں کہ وہ درحقیقت خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں، خدا سے علم پائے بغیر خدا پر افترا کرتے ہیں۔

سامنے آئے گا وہیں اٹھانے والا اگر اس سوال کو اٹھائے کہ پھر خدا کس لیے ہے؟ تو اسی دایرے میں دیکھیے اس سوال کا جواب بھی اس دایرے میں موجود ہے، یعنی خدا انسان کے لیے ہے۔ بہ ایں معنی کہ انسان اپنے آپ کو جب خدا کے لیے بناتا ہے تو خدا بھی اس کے لیے بن جاتا ہے۔ وہ پاتا ہے کہ خدا، خدا کا ارادہ، خدا کے قوانین، اس کی ہر خواہش اور اس کی ہر مرضی کی ہم نوائی کر رہے ہیں، وہی ہو رہا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے، بہشتی ماحول کی حقیقت یہی ہے۔

لیکن انسانوں میں اپنے آپ کو جو خدا کے لیے نہیں بناتے اور خدا کی مرضی کی پابندی اپنے لیے ضروری قرار نہیں دیتے، وہی پاتے ہیں کہ خدا بھی ان کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ جیسے عمر بھر وہ خدا کے مرضیات سے ٹکراتے رہے، دیکھتے ہیں کہ خدا کا ارادہ اور خدا کے قوانین بھی اس سے ٹکرا رہے ہیں، جہنمی ماحول میں اسی تصادم اور ٹکراؤ کا تجربہ کرایا جائے گا۔

الغرض یوں ہستی کا یہ سارا نظام ایک جیتے جاگتے، ابدی، نہ ختم ہونے والے روشن نظام کا قالب اختیار کر لیتا ہے۔ اس سلسلے کے کسی سوال کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ جاتا۔ ''مادیت'' اور ''روحانیت'' عملی زندگی کے ان دونوں نظاموں میں جو نقص اور کمی پائی جاتی تھی اسلامی نظام زندگی میں ان ساری کوتاہیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اور یہی میں عرض کرنا چاہتا تھا، گو بہت زیادہ غیر ضروری طول بیانی سے کام لینا پڑا۔ ایک ہی مسئلے کو بار بار مختلف پیرایوں میں پیش کرنے کی ضرورت ہوئی، ممکن ہے میرا خیال غلط ہو، لیکن خیال یہی رہا کہ اگر تکرار و اعادے سے کام نہ لیا جائے گا تو جو کچھ کہنا چاہتا ہوں شاید اس کے ذہن نشین کرانے میں ناکام رہ جاتا۔ آخر پڑھنے والوں میں سب ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ارباب فہم و دانش جن کے لیے چند اشارے کافی ہوتے ہیں، ان کے سوا بھی تو کافی تعداد ان لوگوں کی پائی جاتی ہے جن کے متعلق مجھے تو اب بھی اندیشہ ہے کہ ہذیان یا مجذوب کی بڑ سے زیادہ میری باتوں کی وقعت ان کی نگاہوں میں نہیں ہوگی۔ اب کچھ بھی ہو اپنی حد تک جس طریقے سے تکرار و اعادے کی

وجہ سے اپنے خیالات کو ادا کر سکتا تھا، میں نے ادا کر دیا ہے۔ گرانی محسوس کرنے والوں سے معافی کا خواستگار ہوں اور میرے منشا کے سمجھنے سے اب بھی اپنے آپ کو جو معذور پا رہے ہوں ان سے بھی یہی التماس ہے کہ ذرا زیادہ فکر و تامل سے کام لیں، شرح صدر کی خدا سے دعا کریں، ممکن ہے جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے وہی ان کی سمجھ میں بھی آ جائے۔

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ. (سورۂ احزاب:۴)

ایک وسوسہ اور اس کا ازالہ:

آخر میں ''عملی زندگی کے اسلامی نظام'' کے متعلق ایک وسوسے کا ازالہ بھی دل چاہتا ہے کہ کر لیا جائے۔ اس وسوسے کا تعلق ''روحانیت'' کے جز سے ہے، جسے اسلام نے اپنے پروگرام میں داخل ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ آپ دیکھ چکے کہ اسی کو خشت اول اور سنگ بنیاد بنا کر اسلام کے عملی نظام کی پوری عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی طویل و عریض تاریخ میں ایک طبقہ ''صوفیہ'' کے نام سے جو پایا جاتا ہے دینی زندگی کے اس خاص طریقے کی تعبیر تصوف سے عموماً لوگ کرتے ہیں۔ بہ ظاہر شبہ ہوتا ہے کہ اس طبقے نے مسلمانوں کے اندر بھی وہی فرشتہ یا ملک بنانے والی روحانیت کو گھسنے کا صرف موقع ہی نہیں دیا بلکہ عام مسلمانوں کے قلوب اسی طبقے کے وزن سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ گویا دین کی معیاری زندگی کا نمونہ سمجھا جاتا ہے کہ صوفیہ صافیہ ہی کی دینی زندگی ہے۔

''روحانیت'' کا تذکرہ جن الفاظ میں اب تک میں نے کیا ہے ممکن ہے کہ مجھے ان لوگوں میں شمار کر لیا جائے جو مسلمانوں کے طبقۂ صوفیہ سے خوش نہیں ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ تصوف کی جتنی مستند کتابیں اب تک میری نظر سے گزری ہیں یا صوفیہ کے اساطین و سر برآوردہ بزرگوں کے حالات کتابوں میں جس حد تک پڑھ سکا ہوں یا خود میری نظروں سے اس سلسلے میں جو مثالی ہستیاں گزری ہیں ان سب کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہ آسانی دعویٰ کر سکتا ہوں کہ صحیح اسلامی تصوف کی بنیاد آدمی کو فرشتہ یا ملک

بنانے کی کوششوں پر قطعاً مبنی نہیں ہے۔ بلکہ برعکس اس کے میں تو یہی جانتا ہوں کہ ہمارے یہ صوفیہ آدمی کو ہر حال اور زندگی کی ہر منزل میں آدمی ہی تسلیم کرتے چلے آتے ہیں۔ان کے نزدیک اس پست خاکی زندگی میں بھی انسان، انسان ہی رہتا ہے اور اس کے بعد زندگی کے جن اطوار وادوار میں وہ داخل ہوتا ہے انسان ہی بنا ہوا داخل ہوتا ہے۔اس قسم کے بے بنیاد خیالات کہ بلند ہوتے ہوئے آدمی فرشتے یا العیاذ باللہ خدا بن جاتا ہے ❶ یا پستی کے گڑھوں میں گرتے ہوئے گھوڑے، ہاتھی، بیل اور چوہے، چھپکلیوں یا گرگٹوں وغیرہ کا قالب اختیار کر لیتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مسلمان کے کسی مستند صوفی یا قابل اعتبار کتاب میں اس قسم کے خرافات پائے جاتے ہوں۔

میرے نزدیک، ہر مسلمان صوفی کے نزدیک جنتی اور جہنمی زندگی کے ان دونوں رنگوں میں بھی آدمی آدمی ہی رہتا ہے۔سکھ یا دکھ کے جو تجربے بھی ان زندگیوں میں پیش آئیں گے، وہ انسان کے فطری مزاج کے مطابق ہی پیش آئیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان صوفیوں کی پوری تاریخ روحانیت یا رہبانیت و جوگیت کی ان انسانیت سوز، آدمیت گداز، مہیب ریاضتوں کے ذکر سے خالی نظر آتی ہے، جن کے قصے سن سن کر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ روحانیت کے غیر اسلامی طریقوں میں انسانیت ہی کو لعنت کا طوق ٹھہراتے ہوئے، یہ چاہا جاتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس پھٹکار سے نجات حاصل کر کے اپنے آپ کو فرشتہ بنایا جائے۔ بنی نوع انسانی کے نوعی تقاضوں سے خالی ہونے کے لیے سنایا جاتا ہے کہ سکھانے والے اپنے ہاتھوں اور ٹانگوں کو سکھا دیا کرتے تھے بلکہ برفستانوں میں بھٹکے ہوئے چٹانوں سے سر ٹپکتے ہوئے بھی ان لوگوں کو دیکھا گیا ہے جو آدمی کے گندے، نجس، ناپاک قالب سے گلوخلاصی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دریاؤں میں بہاتے تھے، چوبیں گھنٹے فطرت انسانی کے

---

❶ جیسا کہ بعض مذاہب و ادیان میں فنافی الاصل کا مفروضہ فرض کر کے یہی مانا جاتا ہے کہ ملک یا فرشتہ ہونے کے بعد آدمی خدا کی ذات میں محو ہو کر خدا ہی بن جاتا ہے۔ان نتائج کی توقع ان لوگوں کو دلائی جاتی ہے جو اپنے آپ کو خدا کے لیے بناتے ہیں۔اسی طرح خدا کی مرضی سے ٹکرانے والوں کو تناسخ کی شکل میں گھوڑے، گدھے، ہاتھی، بیل وغیرہ کے جون میں جنم لینا پڑتا ہے۔

سارے جبلی اقتضاؤں پر پہرے بٹھائے رکھتے تھے، پانی کو پیتے بھی تھے تو ہمیشہ گرم کر کے اور کھانے کے زہر مار کرنے پر مجبور ہوتے تھے تو اس میں ریت اور بالو اور ایسی چیزیں ملا دیتے۔ اپنے اندر سے مٹانے کے لیے طرح طرح کی غیر فطری تدبیریں ان میں مروج خصوصیتوں کو زندگی بھر کچلتے اور ان کو دلتے مسلتے رہنا، اسی کو ''روحانیت'' کے بڑھانے کا واحد ذریعہ انھوں نے بنا رکھا تھا۔

ظاہر ہے کہ ''روحانیت'' یا ''رہبانیت'' یا ''جوگیت'' کا یہ عجیب وغریب مسلک اور طریقۂ کار جس کے اندر انسان کی انسانیت ہی ملعون ٹھہرا دی گئی ہو سب سے بڑی کامیابی اسی لعنت سے نجات یابی کو سمجھا جاتا ہو۔ اس مسلک کی گنجایش اسلامی نظام والی عملی زندگی میں بھی بھلا کیا نکل سکتی ہے؟ جس میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے آدم کو خدا کا خلیفہ اور اس کی خدائی کا نمایندہ مان کر کیا جاتا ہے۔ وہی خلیفہ جس کے آگے ملائکہ کو بھی سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ ہاں فرشتہ نہیں بلکہ اپنے آپ کو عبد و بندہ بنا کر دکھانے اور اس حقیقت کے اعتراف کے لیے انسانی خلیفہ کے پاس جو کچھ بھی ہے اس کا اپنا خانہ زاد کوئی ذاتی سرمایہ نہیں ہے بلکہ اسی کا ہے جس نے اس کو اپنا خلیفہ بنایا اور خلیفہ بنانے کے لیے یہ سب کچھ دیا ہے۔ دل کا یہ اقرار و اعتراف صادق ہے یا کاذب، اس کی جانچ کے لیے ظاہر ہے کہ اسلامی نظام کے عملی مطالبات ہی کافی ہیں:

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى. (سورۂ نازعات: ۴۰)

''اور روکا نفس کو 'الھویٰ' سے۔''

تو کھلا ہوا قرآنی ضابطہ ہے۔ خواہش کا وہ زور جو اسلام کے عملی نظام نامہ کے نشان زدہ حدود کے توڑ دینے اور پھاند جانے پر آدمی کو اکساتا اور ابھارتا ہو 'الھویٰ' خواہشوں کے اسی زور کا تو نام ہے۔ باقی ایسی باتیں جن میں آزادی بخشی گئی ہے یعنی جایز اور مباح امور جن کے کرنے والوں پر اسلامی حدود کے توڑنے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا، ان سے اپنے آپ کو جو روکتا ہے ظاہر ہے کہ خدا کے حکم کی نہیں بلکہ اپنے نفس کی خواہش کی یہ تعمیل ہے۔ اسی لیے خدا کے پاس مباح اور جایز چیزوں سے پرہیز پر کسی

اجر کی امید بھی نہ رکھنی چاہیے۔ ہمارے یہاں کا کھلا ہوا فتویٰ یہ ہے کہ لذیذ غذائیں جن کے کھانے کی اسلام میں ممانعت پائی جاتی ہے:

لَا فَضِيلَةَ فِي الْاِمْتِنَاعِ عَنْ اَكْلِهَا. (احکام القرآن: جلد۲، صفحہ ۵۵)

''کسی قسم کی دینی برتری ان لوگوں کو حاصل نہیں ہوتی جو ان غذاؤں سے پرہیز کرتے ہیں۔''

لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ. (سورۂ تحریم: ۱)

''جس چیز کو اللہ نے حلال کیا ہے اسے کیوں حرام کرتے ہو؟''

ان کو ڈانٹا گیا ہے جو زیب و زینت، آرائش و آسائش کی چیزوں سے پرہیز کو دین کی معیاری زندگی کے لوازم میں شمار کرتے تھے۔ ارشاد ہوا ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ. (سورۂ اعراف: ۳۲)

''کہہ دو! کون ہے جو حرام ٹھہرا رہا ہے زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنھیں اللہ نے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ غذاؤں کو۔''

البتہ اتنی بات صحیح ہے کہ نفسیاتی امراض کے بعض روگیوں کے لیے بہ طور وقتی پرہیز کے یا خلافتی اقتدار و اختیار کو قابو میں رکھنے کے لیے بہ طور مشق کے کبھی اس راہ کے حاذق اطبا یا ماہر اساتذہ و شیوخ کچھ ایسی تدبیروں کی ہدایت کرتے ہیں جن کو دیکھ کر مغالطہ ہو سکتا ہے کہ جائز اور مباح چیزوں کے استعمال سے بھی لوگ روک دیے گئے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ مرض کی وجہ سے پرہیز یا عادی بنانے اور مشق و ملکہ حاصل کرنے کے لیے کرنے والے جو کچھ کرتے ہیں ان کی حیثیت دوامی ضوابط و قوانین کی نہیں ہوتی۔ اس باب میں انفرادی شخصیتوں کے لیے ماہرین کو الگ الگ تدبیریں جو تجویز کرنی پڑتی ہیں اس کا راز یہی ہے کہ ان باتوں کی نوعیت قانون و ضابطے کی نہیں بلکہ ایک وقتی مشورے کی ہوتی ہے۔ افراد کے مرض کا جب ازالہ ہو جاتا ہے یا جس مشق و ملکہ کا پیدا کرنا مقصود تھا، جب وہ بات حاصل ہو جاتی ہے تو ان پابندیوں کی

ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ آپ مسلمانوں کے اساطین صوفیہ کے حالات کا مطالعہ کیجیے، بھلا ان بزرگوں کو رہبانیت کے دنیا گریز رجحانوں سے کیا تعلق؟ جن کے زیر اثر دنیا کی اکثر نعمتوں سے دلوں میں گونہ چڑ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ❶۔

اس میں شک نہیں کہ فطرت کے احساسات اور جبلت کے تقاضوں سے گونگے بہرے بن جانے کی مشق و مزاولت کی وجہ سے ان لوگوں کو جو اپنی انسانیت کے شکم سے فرشتہ یا ملک کو پیدا کرنے کی جدوجہد میں مشغول ہوتے ہیں کامل یک سوئی کا موقع مل جاتا ہے۔ ہر چیز سے جو اپنے آپ کو الگ کر چکا ہو یک سوئی کا مسئلہ ظاہر ہے کہ اس کے لیے دشواری کیوں ہو؟ اسی یک سوئی کی مشق کی وجہ سے بعض غیر معمولی کارنامے کی پوشیدہ قوتوں کو ابھار لینے میں بسا اوقات فرشتہ بننے والی روحانیت لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہے۔ عوام کے قلوب میں جس کی وجہ سے ان کا کافی وقار اور وزن پیدا ہو جاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ تجربے نے ہمیشہ اس کو ثابت کیا ہے کہ خلیفہ بن کر بندے بن جانے یعنی سب کچھ رکھتے ہوئے اسی سب کچھ کو خدا کی مرضی کا تابع بنا لینے کی وجہ سے اب خدا اور اس کی قوتیں بندے کی ہم نوا بن جاتی ہیں، جو آثار و ثمرات و برکات اس راہ سے حاصل ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں فرشتہ بنانے والی ریاضتوں اور مجاہدوں کے کارناموں کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ اسلامی نظام زندگی کی دعوت دینے والے بزرگوں میں جن کو اس راہ کا سب سے پہلا داعی اور

---

❶ کسی خاص علاقے یا طبقے ہی کی حد تک نہیں بلکہ عام اسلامی ممالک میں تصوف اور صوفیت کی ریاست جس ذات گرامی پر ختم ہوتی ہے میری رائے میں وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی ذات ستودہ صفات ہے۔ ان کے عام حسن قبول ہی کی یہ دلیل ہے کہ پیران پیر، غوث اعظم، محبوب سبحانی، اسی قسم کے بیسیوں القاب سے عوام و خواص میں مشہور ہیں۔ مسلمان صوفیوں کی معیاری زندگی کا سب سے اعلا اور بہتر نمونہ آپ کی مبارک زندگی ہے۔ آپ کے دستر خوان پر اعلا سے اعلا لذیذ غذاؤں کو لوگوں نے پایا ہے، لباس مبارک کا بھی آپ کے یہی حال تھا، قیام گاہ آپ کی بغداد کا جو مدرسہ تھا ایک اعلا قصر و ایوان تھا، ایک کم پچاس اولاد آپ کی ہوئی، جن میں ۲۷ بیٹے اور باقی صاحب زادیاں تھیں۔ یہ ہے مسلمانوں کے صوفیوں کی مثالی زندگی۔

بادی سمجھا جاتا ہے یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی طرف بھی قرآن میں یہ فقرہ منسوب کیا گیا ہے:

لَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ۔ (سورۂ ہود: ۳۱)

''میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتوں کو جانتا ہوں اور نہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ یعنی ملک ہوں۔''

اور اسی راہ کی آخری ہستی نبوتوں کے خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے کہ

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ۔ (سورۂ انعام: ۵۰)

''کہہ دو! میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتوں کو جانتا ہوں اور نہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ یعنی ملک ہوں۔''

بہ ظاہر اس اعلان سے مقصود یہی ہے کہ اسلامی روحانیت اور غیر اسلامی روحانیت میں جو جوہری فرق ہے لوگ اس سے آگاہ ہو جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روحانیت کے مسلک پر چلنے والوں سے اسی قسم کے توقعات لوگ وابستہ کیے چلے آئے ہیں۔ مثلاً یہی کہ رزق کی کشایش میں ان سے مدد ملتی ہے، روزگار آدمی کا ان کی توجہ سے چلنے لگتا ہے، نوکریاں مل جاتی ہیں یا جن امتحانوں پر نوکریاں موقوف ہیں ان امتحانوں میں وہ لوگوں کو کامیاب بنا دیتے ہیں۔ گویا خیال کیا جاتا ہے کہ خزانے ان کے قبضے میں ہیں۔ ان کو اختیار دیا گیا ہے جسے جتنا چاہیں اپنے ان مقبوضہ خزانوں سے لوگوں کو بانٹیں اور تقسیم کریں۔ سمجھا جاتا ہے کہ غیب سے جو کچھ شہادت میں آنے والا ہے، سب سے وہ آگاہ ہوتے ہیں۔ عموماً ان ہی آثار سے روحانیت اور رہبانیت کی راہوں کے اہل کمال کو لوگ پہچاننے کی کوشش کرتے چلے آئے ہیں۔ کچھ نہیں تو کم از کم روحانیت والوں سے اسی

بات کی توقع کی جاتی ہے کہ جیسے کھانے پینے وغیرہ انسانی جیسی ضرورتوں سے فرشتے بے نیاز ہیں، ملکوتی بے نیازی کا یہی رنگ چاہیے کہ ان میں بھی پایا جائے۔ جس حد تک فطرت انسانی کے عام مطالبات سے لاپروائی ان میں پائی جاتی ہے اسی قدر اس راہ کی برائیوں کے سمجھا جاتا ہے کہ وہ مستحق ہیں۔ نبوات ورسالات جن کی طرف سے بنی آدم کے گھرانوں میں ''اسلامی نظام'' ہی پیش ہوتا رہا ہے ان کی تاریخ کی ابتدا اور انتہا دونوں ہی کی طرف سے مذکورہ بالا باتوں کے اعلان کا مطالبہ تو جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے اسی لیے شاید کیا گیا ہے کہ اسلامی روحانیت کے صحیح خط و خال لوگوں کے سامنے آجائیں، یہی بتانا مقصود ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں جو ''روحانیت'' شریک ہے اس کے لیے مذکورہ بالا خصوصیتوں میں سے کسی خصوصیت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ خاتم النّبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی بات کے اعلان کا حکم جہاں دیا گیا ہے وہیں آخر میں یہ بھی ہے کہ

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ. (سورۂ احقاف:۹)

''(کہہ دیجیے) کہ میں نہیں پیروی کرتا مگر صرف ان ہی باتوں کی جن کی مجھ پر وحی کی گی ہے۔''

مطلب جس کا یہی ہے کہ اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کی بخشی ہوئی ان آگاہیوں کے پیچھے ڈال دینا چاہیے جن میں اپنے مرضیات سے خدا نے بندوں کو مطلع کیا ہے۔ اسلامی نظام زندگی کی ''روحانیت'' یہی اور صرف یہی ہے۔ سب پچھ رکھتے ہوئے سب کچھ کو اسی کی مرضی کا تابع بنا کر جینے کا فیصلہ، جس کی طرف سے سب کچھ ملا ہے، اسلامی نظام زندگی میں جو روحانیت شریک ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس فیصلے کے خلاف آدمی کا قدم غلطی سے اٹھ جائے تو چاہیے کہ اس غلطی کی معافی چاہے، اس پر نادم ہو، اسی کا نام استغفار ہے اور پھر اپنے اسی فیصلے پر عزم و ارادے کی پوری قوت کے ساتھ واپس ہو جائے، اسی کا نام توبہ ہے۔ بندے کو چاہیے کہ اسی فیصلے کے مطابق اپنے اپ کو خدا کے لیے بنانے کی جدوجہد میں زندگی بھر مشغول و منہمک رہے۔ خدا کا

برتاؤ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ خدا کا کام ہے، جس کا سوچنا بندوں کے فرائض میں نہیں اور نہ بندہ یہ کہہ سکتا ہے کہ کب زندگی کی کسی منزل میں خدا کی طرف سے اسے کیا کیا دیا جائے گا؟ ہمارے ہاں کے صوفیوں کے کلام میں حور و قصور، جنات و انہار والی جنت کے متعلق کہیں کہیں ایسی باتیں جو ملتی ہیں کہ ان چیزوں کی طلب خدا طلبی نہیں ہے، اس کا مطلب یہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ بہ قول عارف شیراز:

تو بندگی چو گدایاں بہ شرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

لیکن ہمارے گستاخ، رند مشرب، ناسمجھ شعرا ان بزرگوں کے کلام سے بدترین گم راہیوں کے شکار ہوئے، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں انھوں نے فرشتہ بن جانا اسی کو انسانیت کا کمال ٹھہرایا اور یوں بے سوچے سمجھے جو جی میں ان کے آیا اسی کو شاعرانہ لباس پہناتے چلے گئے۔ سڑے ہوئے انگوروں کی شراب اور بازار میں کرایہ پر چلنے والی بیسواؤں کو دیکھ کر جو لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں کیا تماشا ہے کہ وہ انسانی فطرت کے قدرتی مطلوبات کے ان مظاہر کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو کر خیر محض کے قالب میں آدمی کے سامنے آئیں گے۔ قرآنی زبان میں جس کا نام ''الجنۃ'' ''الفردوس'' وغیرہ ہے [1]۔

---

[1] اس موقع پر بے ساختہ طبقۂ صوفیہ کے سرخیل محی الدین ابن عربی شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا قول یاد آ رہا ہے، انھوں نے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ قرآنی جنت اگر حیوانی جنت ہے تو چاہیے کہ

الحیوان یلذ بالوجہ الجمیل من المرأۃ المستحسنۃ والغلام لحسن الوجہ والالوان۔

''حیوان بھی خوب صورت عورتوں اور نوخیز حسین و جمیل نوجوانوں اور مختلف رنگوں کی بوقلمونیوں سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ (فتوحات مکیہ: جلد ۱، صفحہ ۴۱۴)

شیخؒ نے لکھا ہے کہ آخر بہتے ہوئے پانی، لہلہاتے ہوئے سبزہ زار، سرسبز باغ، پھولوں، پھلوں سے لدے ہوئے جب ہوں ان کو دیکھ کر انسانی فطرت بے چین ہوتی ہے، وجد و سرمستی کی کیفیت اس میں پیدا ہوتی ہے یا بھینسوں، بیلوں کو بھی کسی نے ان قطاروں سے متاثر ہوتے دیکھا ہے۔

باب دوازدہم:

انسانی زندگی کا عملی نظام

اور

اسلام کا تصور وحدت انسان

''کس لیے؟'' ❶ کے مندرجہ بالا عنوان کے تحت اب تک جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے اگر چہ وہی کافی طویل ہو چکا ہے، لیکن سچی بات یہی ہے کہ ''اسلام کا عملی نظام'' جس پر بحث مقصود ہے اس کا موقع اس وقت تک اس لیے نہ آسکا کہ بیسیوں غلط فہمیوں کا ازالہ اصل مدعا پیش کرنے سے پہلے ناگزیر اور ضروری تھا۔ خصوصاً خدا کی ایک زمین اور خاک کے اس ایک تودے کو مختلف اغراض و مقاصد کے زیر اثر لوگ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے جو بانٹتے چلے آئے ہیں اور معمولی معمولی امتیازی وجود کو اہم بنا بنا کر گھوڑوں، گدھوں، کوؤں اور چیلوں کی نسل میں نہیں بلکہ آدم وحوا کے بچوں کے درمیان اختلافات کی ناقابل عبور خلیجیں جو حایل کر دی گئی ہیں کبھی چہروں کے رنگ روپ کو سامنے رکھ کر گوروں، کالوں، پیلوں کے درمیان لوگ بانٹے گئے یا مافی الضمیر سے آگاہ کرنے کے لیے بیان کی جو نعمت بنی آدم کو بخشی گئی ہے اور مختلف اسباب و موثرات کے تحت بیانی قوت کے اظہار کے لیے مختلف الفاظ و محاورات جو لوگوں میں چل پڑے، یعنی زبانوں کے اختلاف کو بنیاد بنا کر ایک ہی نسل کے افراد کو مختلف ٹولیوں میں تقسیم کرنے کی کوشش جو کی گئی ہے یا آباؤ اجداد کے نسبی شجروں کو سامنے رکھ کر مختلف خاندانوں کی طرف منسوب کر کے باور کرایا گیا کہ زید کے خاندانی سلسلے سے تعلق رکھنے والے عمرو کے خانوادے میں پیدا ہونے والوں سے جدا اور قطعاً

❶ ''الدین القیم'' اولاً ''کس لیے؟'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضمون کی شکل میں ماہ نامہ برہان دہلی میں شایع ہوئی تھی۔ (ابوسلمان)

جدا ہیں۔ الغرض وطن، رنگ، زبان، نسل وغیرہ کے اختلافات سے اختلافات کے جو طلسم بنی نوع انسانی کے گھرانوں میں کھڑے کر دیے گئے ہیں اور کیسے طلسم؟ کہ ان کے سحر سے مسحور ہو کر یہی نہیں کہ باہم اپنے آپ کو لوگ ایک دوسرے سے الگ اور جدا سمجھنے لگے بلکہ بغض اور عداوت کی آگ بھی ان ہی بنیادوں پر بھڑکائی گئی اور کیسی آگ؟ کہ بجھانے کی ہر کوشش اس سلسلے میں صرف یہی نہیں کہ ناکام نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس آگ کو اور زیادہ تیز کر کے بھڑکاتی ہی چلی آتی ہے۔ پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر دنیا ان سطحی قصوں کے چکانے میں کب کامیاب ہوگی اور کامیاب ہوگی بھی یا نہیں؟

سطحی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بغض و عداوت، جنگ و جدال، لڑائی جھگڑوں میں عموماً یہی دیکھا جاتا ہے کہ قصد و اختیار کو اس میں کتنا دخل ہے؟ بے جانے کسی کے ہاتھ سے آپ کو چوٹ لگ جاتی ہے تو آپ کے دل میں یہی فیصلہ ہوتا ہے کہ جس سے آپ کو چوٹ لگی ہے وہ قصوروار نہیں ہے اور خود وہ بھی جس کے ہاتھ سے آپ کو اذیت پہنچی یہی سمجھتا ہے کہ میں مجرم نہیں ہوں، لیکن قوموں اور امتوں کی تقسیم و تجزی کی یہ ساری بنیادیں جن کا میں نے ذکر کیا، سوچیے تو سہی کہ ان کی نوعیت کیا ہے؟ چہروں کے کالے، گورے، پیلے ہونے میں کیا ان غریبوں کے قصد اور اختیار کو کچھ بھی دخل ہے، جن کی وجہ سے ایک دوسرے سے وہ جدا کیے گئے ہیں؟ یا نسلوں کا اختلاف یعنی بجائے زید کے جو عمرو کے خاندان میں پیدا ہوئے ہیں، کیا ان کی یہ پیدائش اختیاری ہے؟ اسی طرح زمین کے مختلف حصوں میں جو لوگ آباد ہو گئے اور ان کے توالد و تناسل کا سلسلہ ان ہی علاقوں میں شروع ہوا، اس میں ان پیدا ہونے والوں کا بھلا کیا قصور؟ اور سچ تو یہ ہے کہ مٹی کا یہ سمٹا ہوا ڈھیر ہم جسے زمین کہتے ہیں، ایک گول مٹول واحد بسیط کرہ ہے۔ اس کے جن حصوں کو ہم نے مختلف ناموں سے موسوم کر رکھا ہے۔ کسی حصے کو ایشیا، کسی کو یورپ، کسی کو افریقہ یا امریکہ، جو ہم کہتے ہیں تو بجز فرضی حدود کے آپ ہی سوچیے ان ناموں کی بنیاد کیا کسی حقیقت اور واقعے پر قایم ہے؟ ہر

تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پہاڑ، دریا، ندیاں، جنگل زمین کے اس کرے پر پائے جاتے ہیں۔ یہ یا اسی قسم کی چیزوں میں کسی کے متعلق یہ فرض کر لینا کہ وہاں سے دوسرا ملک شروع ہو جاتا ہے، ذہن کی ایک فرضی اور اختراعی کارروائی کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

اس سے زیادہ احمق کون ہوگا جو جغرافیائی اطلسوں کے نشانات کو زمین کی سطح پر تلاش کرے گا۔ مگر یہی ایک فرضی بات جس نے ایک ملک کے لوگوں کو دوسرے ملک کے باشندوں سے جدا کر رکھا ہے اس کا نتیجہ کیا ہے؟

بین الاقوامی کشیدگیوں کے زہر کا کتنا بڑا ذخیرہ صرف اسی ایک وہمی مفروضے میں پوشیدہ ہے۔ لڑنے والے گویا اس پر لڑ رہے ہیں کہ تیرا مکان فلاں ندی کے شمالی ساحل پر چوں کہ واقع ہے، اس لیے جنوبی ساحل میں رہنے والے ان سے راضی نہیں ہو سکتے۔ میں تو حیران ہو جاتا ہوں جب بود و باش کے علاقوں کی بنیاد پر دیکھتا ہوں کہ اکسانے والے لوگوں کو اکسا رہے ہیں۔ آخر یہ قصہ ذرا سوچیے تو سہی کسی نقطے پر ختم بھی ہو سکتا ہے؟ مسکن و مکان کی ان تقسیموں کا حال تو یہ ہے کہ ایک ایک ملک مختلف صوبوں پر، اور ہر صوبہ مختلف اضلاع پر، ہر ضلع مختلف پرگنوں پر، ہر پرگنہ مختلف دیہاتوں اور قصبوں پر ہر دیہات اور قصبہ مختلف ٹولوں اور محلوں پر بٹا ہوا ہے۔ جب لڑائی کی بنیاد مکانی اور سکونی اختلاف ہی پر قایم کر دی گئی ہے تو ملکوں والی جنگوں کی آگ اگر محلوں اور ٹولوں کو بھی اپنے احاطے میں گھیر لے بلکہ ہر محلّہ اور ہر ٹولے میں رہنے والے ظاہر ہے کہ الگ الگ مکانوں اور گھروں میں رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی گھر کے رہنے والے گھر کے مختلف حصوں ہی میں سوتے اٹھتے بیٹھتے ہیں، لڑنے والے چاہیں گے تو اس لڑائی کو کھینچ کر خواب گاہوں اور مدفنوں کے اختلاف تک لا کر بھی پہنچا سکتے ہیں۔ مکانی اختلاف کے یہ نتائج بالکل قدرتی اور منطقی نتائج ہیں۔

اور وطنی اختلاف ہی کا یہ حال نہیں ہے، زبانوں کا اختلاف بھی اگر غور کیا جائے تو فرضی اصطلاحات کے اختلاف کے سوا اس کی تہ میں بھی آپ کو کوئی واقعہ نظر نہ آئے

گا۔ پانی ایک سیال صاف، شفاف رقیق، بہنے والے مادے کا نام ہے۔ یقیناً فرض کرنے والوں ہی نے اس کی تعبیر کے لیے پانی، جل، آب، ماء، واٹر وغیرہ الفاظ فرض کر لیے ہیں، پھر زبانوں کی بنیاد پر لڑنے والے فرضی اصطلاحوں پر نہیں لڑ رہے ہیں تو خود ان کو سوچنا چاہیے کہ اس کے سوا اور کیا کر رہے ہیں؟

پھر ایک ہی زبان اور بولی میں لب و لہجے کی وجہ سے بھی عموماً اختلافات رونما ہوتے ہیں اور دیکھا جاتا ہے کہ باہم ایک دوسرے کا مضحکہ ان اختلافات کی وجہ سے بھی اڑاتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ آخر یہ جنگ بھی بڑھتے ہوئے کہاں تک پہنچ سکتی ہے؟

چہروں کے رنگ و روغن کے اختلافات پر غور کیجیے! واقعہ تو یہ ہے کہ دو حقیقی بھائی بھی شکل و صورت میں ایک دوسرے سے عموماً مختلف ہوتے ہیں نسلوں میں بھی۔ میں پوچھتا ہوں کہ ایک ہی دادا کی اولاد بھی ایک دوسرے سے اسی مقدمے کو پیش کر کے کہ دادا گو ہم سب کا ایک سہی، لیکن جو ہمارا باپ ہے چوں کہ وہی تمہارا باپ نہیں ہے اسی لیے ہم دونوں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے ہیں، تو نسلی اختلاف کے ماننے والوں کے نزدیک یہ دعویٰ مستحق توجہ کیوں نہیں؟ آخر اس راہ میں حد بندی کی منطقی شکل کیا ہے؟ یعنی کہاں سے آبا و اجداد کے اختلاف کے قصے میں کتنی پشتوں تک نسلی اختلاف کا اعتبار کیا جائے گا اور کہاں سے سمجھا جائے گا کہ لوگ ایک ہی نسل کے ہیں؟

بہر حال وطن اور زبان کا اختلاف جس کی بنیاد خود تراشیدہ وہمی حدود یا مفروضہ اصطلاحات پر قائم ہے یا رنگ و نسل کا اختلاف جس میں ان بے چاروں کے قصد اور ارادے کو کسی قسم کا کوئی دخل نہیں ہوتا جن سے اختلاف کیا جاتا ہے، ان اختلافات میں قطع نظر اس پہلو کے کہ ان کو بنیاد بنا کر انسانیت کی تقسیم کسی خاص نقطے پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ تقسیم کے بعد تقسیم اور بٹوارے کے بعد بٹوارے کے خطرات مسلسل سر نکالنے لگتے ہیں۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ان اختلافات کو ابھارنے کے بعد انسانیت کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو کوئی متحد کرنا چاہے بھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

اس اختلاف کے بعد اتحاد کی راہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی۔ آخر میں پوچھتا ہوں کہ وطن کی بنیاد پر چین کے باشندے مثلاً جاپان والوں سے جب جدا ہو چکے ہیں تو پھر ان کے ملانے کی شکل یہی تو ہوسکتی ہے کہ یا چین کو جاپان بنادیا جائے یا جاپان چین میں مدغم ہو جائے، لیکن دونوں ملکوں کی زمینوں کے تداخل اور باہمی انجذاب کی صورت ہی کیا ہوسکتی ہے؟ اسی طرح کالوں کو گوروں سے ملانے کے لیے کوئی چہرے کے رنگ وروغن کو کیا بدل سکتا ہے؟ یا جو بے چارے مثلاً زید کی نسل میں پیدا ہو چکے ہیں کیا [کوئی] صورت ہے کہ ان کو عمرو کی نسل میں شریک کردیا جائے؟ زیادہ سے زیادہ عقلی طور پر کچھ تبدیل وتغیر کے قبول کرنے کا امکان اگر ہے تو وہ زبانوں اور بولیوں کا مسئلہ ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ مختلف زبانوں اور بولیوں کو مٹا کر بہ زور وجبر کسی ایک ہی زبان یا بولی کے بولنے پر لوگوں کو مجبور کریں۔ عقل تو اس گنجایش کو پاتی ہے، لیکن عملاً یہ ممکن بھی ہے یا نہیں؟ تجربہ ہی آپ کو اس کا جواب دے گا اور سچ پوچھیے تو یہ سارے اختلافات جو بنی آدم میں پیدا کیے گئے ہیں واقع میں ان کی ابتدا کسی اندورنی اختلاف ہی سے ہوئی۔ پہلے دلوں میں کہیے یا فکری وذہنی رجحانات میں فرق پیدا ہوا، پھر خاص فکر ونظر رکھنے والوں نے عوام کو اپنے اردگرد جمع کرنے کے لیے کہیں تو نسل کا، کہیں وطن کا، کہیں رنگ کا، کہیں زبان کے شاخسانے نکالے، ان قصوں کو اہمیت دی گئی، تا آں کہ انسانوں کی ایک ٹکڑی دوسری ٹکڑیوں سے اپنے آپ کو ان ہی وجود سے الگ سمجھنے لگی، اور کیسی علاحدگی؟ گویا وہی نسبت پیدا ہوگئی، جو جانوروں، چرندوں، پرندوں سے انسانی نسل رکھتی ہے، بلکہ قومی عداوتوں اور رقابتوں کے ان قصوں نے اس سے بھی زیادہ ہول ناک قالب اختیار کرلیا، جس کا تماشا تاریخ کے نامعلوم زمانے سے دنیا کرتی چلی آرہی ہے اور آج تک ان ہی موثرات کے زیر اثر آدم کی اولاد زندگی گزار رہی ہے۔

بے شمار اور ان گنت ٹولیاں ان تقسیموں کی وجہ سے بنی ہی ہوئی تھیں، پھر ان ہی کے ساتھ فکری وذہنی اختلافات کے مسایل بھی پیدا ہوئے، جن میں ایک طویل افسانہ

تاریخ میں ''مذہب'' اور ''دین'' کے اختلافات کی بنیاد پر بھی مرتب ہوا۔

ان ہی باتوں کا نتیجہ ہے کہ ''انسانی زندگی کے عملی نظام'' کے متعلق یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ ان کا نہ کوئی احاطہ ہی کر سکتا ہے اور نہ کوئی اپنی گرفت میں آئین و دستور کے ان قصوں کو لا سکتا ہے، جو اب تک بنی آدم میں نافذ اور جاری ہو چکے ہیں۔

اور یہ واقعہ ہے کہ قرآن کی روشنی اگر میرے سامنے نہ ہوتی تو ''اسلامی نظام زندگی'' کو موضوع بنا کر میں نے جو قلم اٹھایا ہے یہ مسئلہ میرے لیے کافی دشوار ہو جاتا۔ گویا میرا علمی فرض تھا کہ دنیا جہاں کے ان سارے ''عملی نظام ناموں'' کی پہلے ایک فہرست بناتا جو مختلف اقوام و امم میں اب تک پائے گئے ہیں یا اس وقت پائے جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کے ہر ہر باب اور ہر باب کے ہر دفعہ (رولز) سے ''اسلام کے پیش کردہ عملی نظام'' کے قوانین و مسایل سے مقابلہ کرتا، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں قرآن کا یہ خدائی اعلان:

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡنِ ۝

(سورۂ انبیاء: ۹۲)

''واقعہ یہ ہے کہ تمہارا یہ گروہ (انسانوں کا) ایک ہی گروہ ہے اور میں ہوں تمہارا آقا تو تم مجھی کو پوجتے رہنا۔''

اس نے انسانیت کی ساری بیرونی و اندورنی تقسیموں کو ختم کر دیا۔ اختلافات کی بنیاد جن چیزوں پر قایم تھی بجاے اختلاف کے ان کے استعمال کے دوسرے طریقوں کی طرف اسی کتاب میں توجہ دلائی گئی ہے۔ مثلاً نسلی و قبایلی اختلافات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ

جَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا۔ (سورۂ حجرات: ۱۳)

''اقوام و قبایل [کو] میں نے (اختلاف کے لیے نہیں بلکہ) باہم ایک دوسرے کے تعارف کے لیے بنایا۔''

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ نسبی شجروں کو دیکھ کر یہ جانا جا سکتا ہے کہ مختلف

خاندان کہاں پر جا کر ملتے ہیں۔ اس طریقے سے اس میں ایک قبیلے کا رشتہ دوسرے قبیلے سے معلوم ہوتا ہے جو تعارف اور باہمی شناسائی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

اسی طرح زبانوں اور رنگ روپ کا اختلاف کا ذکر کر کے ارشاد ہوا ہے:

وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَاٰيَاتٍ لِّلْعَالِمِیْنَ O (سورۂ روم: ۲۲)

''تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگ روپ کا اختلاف اس میں نشانیاں ہیں سارے جہانوں کے لیے۔''

اور کوئی شبہ نہیں کہ بولیوں اور زبانوں کا اختلاف جس کی ابتدا در حقیقت لب و لہجے کے اختلاف سے ہوئی ہے، بڑھتے ہوئے وہی اختلاف زبانوں کے اختلاف تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہے جو آدمی کو حیرت میں ڈالتی ہے۔ تکلم یعنی بولنے کے سارے آلات زبان، ہونٹ، تالو، حلق اور ان کے رگ پٹھے سب ہی میں مشترک ہوتے ہیں۔ جو کچھ ایک آدمی کے منہ میں ہوتا ہے وہی دوسرے کے منہ میں، مگر بایں ہمہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ دوماں جائی بھائیوں کی آواز میں فرق ہوتا اور کافی ہوتا ہے اور یہی فرق وسیع ہو کر بولیوں کے اختلاف تک ترقی کر کے پہنچ گیا ہے۔ وحدت میں کثرت کا یہ تماشا جیسے حیرت انگیز ہے یہی حال چہروں کے رنگ روپ کا بھی ہے۔ اس باب میں دو بھائیوں میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے اور یہی تفاوت ہے جس نے بالآخر گوری، کالی، پیلی قوموں کے قصے کو پیدا کر دیا ہے۔ الغرض کسی قاہرہ ارادہ واختیار کی وحدت کی یافت ان کے استعمال کا صحیح قرآنی طریقہ ہے۔ قرآن کے ان ہی اشاروں کی وہ تفصیلات ہیں جن کا تذکرہ مختلف طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ خصوصاً حجۃ الوداع کے آخری وداعی خطبے میں جن مہمات کا تذکرہ فرمایا گیا تھا ان ہی میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ اَلَا اِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ

لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰی اَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰی عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی الْاَحْمَرَ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ.

(درمنثور: جلد ۶، صفحہ ۹۸ بہ حوالہ بیہقی)

''لوگو! تمہارا مالک پروردگار ایک ہے، تمہارا باپ بھی ایک ہی تھا۔ کسی قسم کی کوئی برتری عرب کے باشندے کو ان لوگوں پر نہیں ہے جو عجم (یعنی غیر عربی علاقوں) کے باشندے ہیں اور نہ عجم والوں کو عرب والوں پر، نہ کسی کالے کو سرخ رنگ والوں پر اور نہ سرخ رنگ والوں کو کالے رنگ والے پر۔''

دوسری روایت میں اسی سلسلے کے یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں:

اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰی عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰی عَرَبِيٍّ وَلَا اَحْمَرَ عَلٰی اَبْيَضَ وَلَا اَبْيَضَ عَلٰی الْاَحْمَرَ.

''آدمی سب کے سب آدم ہی کی اولاد ہیں اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی سرخ رنگ والے کو گورے پر، گورے کو سرخ رنگ والوں پر کسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔''

خلاصہ یہی ہے کہ تقسیم کی بیرونی بنیادوں رنگ، نسل، زبان و وطن کے قصوں کو بھی ختم کر دیا گیا اور فکری و ذہنی اختلافات کی جو صورتیں مذاہب و ادیان میں پائی جاتی تھیں قرآنی اطلاع:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ. (سورۂ آل عمران: ۱۹)

''اللہ کے حضور میں ''الدین'' صرف اسلام ہے۔''

کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ کسی خاص قرن یا دور کی حد تک قرآن کے اس اطلاقی بیان کو محدود کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ صاف اور کھلا ہوا مطلب اس کا یہی ہے کہ اول سے آخر تک ایک ہی دین خدا کے حضور بنی آدم کو عطا کیا گیا اور زندگی ''اسلامی نظام'' ہے۔ اس طریقے سے مذاہب و ادیان کے اختلافات بھی وحدت

کا قالب اختیار کر لیتے ہیں۔ مذاہب و ادیان کے دائرے سے ہٹنے کے بعد خود ساختہ پروگراموں کے متعلق بتا چکا ہوں کہ دیکھنے میں بہ ظاہر وہ جتنے زیادہ بھی نظر آتے ہوں لیکن تجزیہ و تحلیل کے بعد سب کے سب مادّیت یا روحانیت ہی کے نیچے درج ہو جاتے ہیں۔ قرآن کے حوالے سے گزر چکا کہ الاسلام کے مقابلے میں عملی زندگی کے ان دونوں طریقوں کے متعلق یہ اعلان اس کتاب میں کیا گیا ہے کہ خدا کی طرف سے ان کا مطالبہ کبھی کسی زمانے میں کسی قوم سے نہیں کیا گیا بلکہ لوگوں نے یہ دونوں طریقے خود گھڑ لیے ہیں۔ اور جیسا کہ بہ تفصیل اس پر بحث ہو چکی ہے کہ عملی زندگی کے یہ دونوں طریقے یعنی روحانیت اور مادّیت درحقیقت اسلامیت ہی کی ناقص ادھوری بگڑی ہوئی شکلوں کی تعبیر ہے، جو عیوب اور نقایص ان دونوں خود ساختہ طریقوں میں پائے جاتے ہیں ان سے پاک کر کے دونوں کو ملا کر دیکھیے تو مادّیت اور روحانیت کے اجتماعی قالب ہی کا نام ''اسلامیت'' یا ''الاسلام'' ہے۔ انسانی فطرت میں جو جبلی تقاضے پائے جاتے ہیں ان میں ہر ایک کی آسودگی کا سامان زندگی کے اسلامی نظام میں پایا جاتا ہے۔

الغرض قرآن کی روشنی میں اگر مطالعہ کیا جائے تو نظر آئے گا کہ بنی آدم کے اختلاف و افتراق کی ایک ایک راہ کو بند کر کے ایک سیدھا سادہ راستہ اس نے پیش کر دیا ہے کہ ساری انسانیت جب کبھی انصاف سے کام لینے پر آمادہ ہو جائے گی اور اجتماعی ضمیر کے تقاضوں کو لوگ دباتے اور جھٹلاتے نہ رہیں گے بلکہ کھلے دماغ اور منشرح سینوں کے ساتھ ان کی پکار پر کان لگائیں گے تو وہ پائیں گے کہ

''ایک ہی نقطے پر آدم کے بچوں کا سمٹ کر متحد ہو جانے۔''

کا خوش گوار خواب، صرف خواب نہیں بلکہ بہ آسانی اس خواب کو واقعہ بنایا جا سکتا ہے۔ آخر ''مادّیت'' ہو یا ''روحانیت و رہبانیت'' ''اسلامیت'' سے ان دونوں مسلکوں کا اختلاف صرف ایڈیالوجی کا اور فکری و ذہنی رجحانوں ہی کا تو اختلاف ہے۔

اس اختلاف کی حیثیت رنگ و نسل وغیرہ کے اختلافات کی قطعاً نہیں ہے، جن

کو ''اتحاد'' سے بدلنے کا ارادہ بھی کیا جائے تو یہ ارادہ پورا نہیں ہوسکتا۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور آپ خود سوچیے! کیا جن کے چہروں کا فطری رنگ سیاہ ہے ان پر گورے رنگ کے پیدا کرنے کی کیا صورت ہے؟

اور یہی حال نسلوں وطنوں کے اختلاف کا بھی ہے بلکہ زبانوں کے اختلاف میں جیسا کہ آپ مجھ ہی سے سن چکے، عقلاً کچھ گنجایش نظر بھی آتی ہو، لیکن ساری دنیا ایک ہی زبان بولنے لگے، عملاً یہ مسئلہ یقیناً آسان نہیں ہے۔

اس کے برخلاف افکار وخیالات، ذہنی تاثرات کی حالت یہ ہے کہ آئے دن وہ بدلتے رہتے ہیں، خصوصاً کسی ناقص خیال اور ادھوری بات کی تکمیل یعنی مادّیت اور روحانیت کو نقایص وعیوب سے پاک کرکے دونوں کا رشتہ ایک دوسرے سے جوڑ کر ''اسلامیت'' کے نظریے کو قبول کرلینا انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے ❶۔

---

❶ مضمون کی یہ قسط جنوری ۱۹۵۴ء میں چھپی تھی۔ اس کے بعد فاضل مقالہ نگار کی طویل علالت کے باعث یہ سلسلہ رک گیا اور تقریباً سوا سال کے طویل وقفے کے بعد مقالہ نگار نے اس سلسلے کی تکمیل فرمائی۔ آیندہ صفحات کا تکمیلی مضمون ''کائنات سے استفادے کے حدود'' کے عنوان سے اپریل اور مئی ۱۹۵۵ء میں برہان کی دو قسطوں میں شایع ہوا تھا۔ (ابوسلمان)

باب سیزدہم:

کاینات سے استفادہ

اور اُس کے حدود

عرض کر چکا ہوں کہ

''آدمی کو خالق پروردگار نے خود اپنے لیے پیدا کیا ہے۔''

یعنی نبوات و رسالات کا متفقہ اجماعی کلمۂ دعوت:

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ. (سورۂ اعراف:۵۹)

''اے قوم! بندگی کر اللہ کی، تمہارے لیے نہیں کوئی معبود اس کے سوا۔''

کا جو حاصل اور خلاصہ ہے اسی کو ''بنیادی محور'' قرار دے کر زندگی کے اس طریقے میں جس کا نام ''الاسلام'' ہے۔

ایک طرف تو اس کا اعلان کیا گیا کہ کاینات یعنی خدا کی مخلوقات سے استفادہ و تمتع اسی بنا پر آدمی کا جایز پیدایشی اور آئینی حق ہے اور دوسری طرف ''انسانیت'' کے احترام و اکرام کا بھی۔

آدمی اس لیے ذمہ دار ٹھہرایا گیا کہ جو خالق کے لیے پیدا کیا گیا ہے، مخلوقات میں بھلا اس سے بڑا اور کون ہوسکتا ہے؟ انسانی وجود کے احترام و اکرام کے سلسلے میں فرایض کی ایک طویل فہرست بن گئی یعنی ہم میں ہر ایک پر یہ فرض کیا گیا کہ ممکنہ حد تک مضرتوں سے بچاتے ہوئے چاہیے کہ اپنے آپ کو خود اپنے لیے بھی، اپنے خاندان کے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی مفید ثابت کرے جن میں وہ بود و باش اختیار کرتا، رہتا سہتا، جیتا مرتا ہے اور ساری انسانی برادری جو کرۂ زمین کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہے ان کے فلاح و بہبود کو بھی اپنی زندگی کی اصلاحی نصب العین میں شریک کرتے ہوئے آیندہ پیدا ہونے والی نسلوں کے لیے بھی جس حد تک ممکن ہو نفع

رسائیوں اور سہولت آفرینیوں کی راہوں کو چاہیے کہ لوگ ہموار اور درست کرتے چلے جائیں اور یوں شخصی فرایض، خاندانی فرایض، قومی فرایض، عام انسانی فرایض، نسلی فرایض، کے ابواب اسلامی نظام حیات میں پیدا ہوئے، جن میں ہر ہر باب اپنے اندر بے شمار مسایل کو سمیٹے ہوئے ہے۔

اس سلسلے میں ارادہ یہی ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ ارادہ پورا بھی ہوگا یا نہیں اور ہوگا بھی تو کب تک پورا ہوگا؟ بہر حال اسی کے بھروسے پر ارادہ کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے اس قدرتی اور پیدایشی حق کے حدود متعین کیے جائیں، جو کاینات سے استفادے کے سلسلے میں بنی آدم کو عطا ہوا ہے۔ حق کے بعد ان فرایض پر بحث کی جائے گی، جن کے ہم ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں۔ یعنی سلسلے وار شخصی فرایض، خاندانی فرایض، قومی فرایض، عام انسانی فرایض، نسلی فرایض پر بحث کرنے کے بعد آخر میں اس ''کلیدی فرض'' کے اجمال کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ کی جائے گی، جس کے بغیر نہ کاینات سے استفادے کا حق ہی ہمارا پیدایشی جایز آئینی حق باقی رہتا ہے اور ''انسانی وجود'' کے احترام و اکرام کے سلسلے میں ہم پر جو فرایض عاید ہوتے ہیں وہ بھی اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں اور منطقی روح کی پشت پناہی سے محروم ہو کر صرف قالب بے جان بن کر رہ جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا کے لیے ہے؟ اسی مسئلے پر بحث کر کے ان شاء اللہ مضمون کہیے یا کتاب ختم کر دی جائے گی۔ اگر چہ اس مسئلے کے بعض پہلوؤں پر تھوڑی بہت گفتگو کر بھی چکا ہوں، لیکن اب تک جو کچھ بھی کہا گیا ہے سب کی حیثیت اجمالی مباحث ہی کی تھی، حقیقی تفصیل مسئلے کی ہنوز تشنہ تفصیل ہے۔ چوں کہ اسلامی دستور حیات کے قالب کی روح یہی مسئلہ ہے۔ سارا نظام ہی اسلامی زندگی کا اس محور پر گھومتا ہے۔ یہ ہے تو سب کچھ ہے۔ حق بھی ہے اور فرض بھی ہے اور یہ نہیں ہے تو آدمی کا حق اور آدمی کا فرض دونوں کے دونوں لغو بے معنی باتیں بن کر رہ جاتی ہیں۔ آخر آپ خود سوچیے آدمی کو خالق کاینات نے خود اپنے لیے پیدا کیا ہے۔ انسانی وجود کے اسی

خصوصی پہلو سے قطع نظر کر لینے کے بعد کیا کوئی معقول جواب اس سوال کا آپ دے سکتے ہیں کہ درخت ہی آدمی کے لیے کیوں کاٹے جاتے ہیں؟ آدمی بھی درخت کے لیے کیوں نہ کاٹے جائیں؟ پھولوں کو ان کی شاخوں سے آدمی کے لیے جدا کیا جاتا ہے، آخر آدمی کے بچوں کو پھولوں پر نچھاور کرنے کے لیے ماؤں کی گودوں سے کیوں نہ چھینا جائے؟ الغرض کائنات سے استفادہ اس کا آدمی کو جو آپ آئینی جائز حق باور کیے بیٹھے ہیں کوئی صحیح معقول منطقی توجیہ اپنے اس وجدانی احساس کی آپ ہی نہیں بلکہ چیلنج کرتا ہوں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا مفکر بھی پیش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح سارے فرائض اور ذمہ داریاں جو انسانی وجود کے احترامی پہلوؤں کے ساتھ وابستہ ہیں یہ مان لینے کے بعد کہ آدمی بھی زمین پر دوسرے رینگنے والے کیڑوں مکوڑوں اور چلنے پھرنے والے چرندوں درندوں ہی جیسی ہستیوں میں ایک عام معمولی ہستی ہے، انصاف سے پوچھتا ہوں بنی آدم کے احترامی فرائض کا کچھ بھی وزن اس احساس کے بعد باقی رہ جاتا ہے؟ ایک مچھر، ایک مکھی جیسے مسلی اور کچلی جاتی ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ اور آئندہ اس کے سدباب کی کیا صورت ہے؟ بجنسہٖ آدمی بھی خدا سے کٹ جانے کے بعد مچھروں اور مکھیوں کے اسی مقام تک اتر کر نہیں پہنچ جاتا ہے؟ ایک کتا، ایک بکرا، بیل، گھوڑا یقیناً وہی سب کچھ تو اپنے پاس رکھتا ہے جو آدمی کے پاس ہے۔ وہی جگر، وہی پھیپھڑا، وہی رگیں، وہی پٹھے، وہی خون، وہی گوشت، وہی چربی، الغرض وہ سب کچھ ان غریبوں کو بھی ملا ہے جس سے آدمی سرفراز ہے۔ پھر غریب کتے کیوں دردرائے دھتکارے جاتے ہیں اور حضرت انسان کو دیکھ کر بے تحاشا آپ تعظیم کے لیے سروقد کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں؟ بار بار کہتا چلا آ رہا ہوں کہ کبوتر کا یہی وہ پر ہے جس میں دلبر نامہ بندھا ہوا ہے۔ قرآن کے پڑھنے والوں کو حیرانی ہوتی ہے، ان کا دل پوچھتا ہے کہ اول سے آخر تک اسی مسئلے کو یعنی آدمی کو خدا نے صرف اپنے لیے پیدا کیا ہے؟ اسی کو بیان کے مختلف پیرایوں میں وہ کیوں گردش دیتا ہے؟ ہر پھر کر اسی مسئلے پر کیوں اپنے بیان کو ختم کرتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ نہ سوچنے والے اس مغالطے میں اگر مبتلا

ہو جائیں کہ اس مسئلے کے سوا قرآن شاید کچھ اور کہنا ہی نہیں چاہتا تو سطحی تلاوت کے اس نتیجے پر تعجب بھی نہ ہونا چاہیے۔ وجہ اس کی وہی ہے کہ دوسرے مسایل جن کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے ان کے مقابلے میں اس مسئلے کی حیثیت وہی ہے، جو روح کی حیثیت جسمانی ہیکل کے ساتھ ہے۔ بہ قول امام غزالی: "گھوڑے کی یہ تعریف کہ وہ سمند بھی ہے، پنچ کلیان بھی ہے اور سیاہ زانو بھی ہے۔ یقیناً یہ تعریف اس وقت بے معنی تعریف بن کر رہ جائے گی۔ اگر اسی کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا جائے کہ "لیکن گھوڑا مرا ہوا ہے۔" اسی طرح آدمی کاینات سے استفادے کے حق کو جس پیمانے پر بھی حاصل کر رہا ہو اور انسانی وجود کے متعلق احترامی و اکرامی فرایض جو آدمی پر عاید ہوتے ہوں ان کی تکمیل میں انتہائی ذمہ داریوں ہی سے کیوں کام نہ لے رہا ہو، لیکن اس حق اور ان فرایض کی بنیاد جس مسئلے پر قایم ہے اس سے اگر لاپروائی اختیار کیے ہو تو یقیناً ایسا آدمی بھی وہی مرا ہوا گھوڑا ہے جو سمند بھی تھا اور پنچ کلیان اور سیاہ زانو بھی تھا، لیکن مرا ہوا تھا بلکہ اپنے حق کی بنیاد سے بے گانہ ہو جانے کے بعد بھی جو خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا سے مستفید ہو رہے ہیں اور باور کیے بیٹھے ہیں کہ کاینات سے استفادہ ان کا قدرتی اور پیدایشی حق ہے۔ سچ پوچھیے نمک حرامی کے جرم کی یہ انتہائی بد بختانہ شکل ہوگی۔

لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ سارے جرایم میں سب سے بڑا جرم یا "مہاپاپ" قرآن ان لوگوں کے طرز عمل کو کیوں قرار دیتا ہے جو اس مسئلے کا یعنی آدمی کو خدا نے صرف اپنے لیے پیدا کیا ہے، اس کا انکار کر کے دوسروں کو فیصلے کے سوا کسی دوسرے فیصلے کی گنجایش ہی کیا تھی؟ آدمی صرف خدا کے لیے پیدا ہوا ہے! اس کا انکار صرف اسی مسئلے ہی کا انکار تو نہیں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہ تو بنی نوع انسان کے سارے حقوق اور سارے انسانی فرایض کا انکار ہے۔ ان حقوق اور فرایض کی اساسی بنیاد ہی کا یہ انکار ہے۔ انسانی زندگی کا جو "قدرتی نظام" ہے اس مسئلے کے انکار کے ساتھ ہی درہم و برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، اس سلسلے میں پہلے بھی بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ بات جب

سامنے آجاتی ہے تو قلم بے اختیار ہو جاتا ہے، ورنہ طلب تو یہ تھا کہ آیندہ جس ترتیب سے بحث ہونے والی ہے پڑھنے والوں کے سامنے بھی اس ترتیب کا نقشہ پیش کر دیا جائے۔

کاینات سے استفادہ اور تمتع کا قدرتی استحقاق آدمی کو جو حاصل ہے آیے اس مسئلے کے متعلقہ پہلوؤں پر پہلے ہم غور کر لیں۔

واقعہ تو یہ ہے کہ ''نبوات و رسالات'' کی تاریخ کا جو قیمتی حصہ قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے اگر اس کو پیش نظر رکھ کر سوچا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کاینات سے استفادے کا ''پروانہ'' بنی آدم کے گھرانوں میں خالق کاینات کی طرف سے اس کے برگزیدہ راست باز نمایندے (انبیا و رسل علیہم السلام) ہر زمانے میں تقسیم کرتے چلے آئے ہیں۔

يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا. (سورۂ معارج:۱۲)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے باغوں کو تیار کرے گا اور نہریں بھی تمہارے لیے بنائے گا۔''

کے الفاظ ہم ابو الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام کے مواعظ میں اگر پاتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی نباتاتی پیداواروں اور کھیتوں کو سرسبز و شاداب رکھنے والی نہروں سے استفادے کی صرف اجازت ہی عہد نوح کے لوگوں کو نہیں دی گئی تھی بلکہ ان نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا خدا موقع دے گا۔ اس وعدے کا اعلان بھی خدا ہی کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام ان لوگوں میں فرما رہے تھے جن کی طرف وہ مبعوث تھے۔ فقط زمین ہی نہیں بلکہ آسمان کی نورانی ہستیوں (آفتاب و ماہ تاب) سے جو منافع آدمی کو حاصل ہو رہے ہیں ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی ''نوحی خطبے'' میں یہ الفاظ بھی ہمیں ملتے ہیں:

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا. (سورۂ معارج:۱۵،۱۶)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تہ بہ تہ ساتوں آسمانوں کو کیسے پیدا کیا اور ان

میں چاند کو روشن کیا اور سورج کو چراغ بنایا۔''

ایک طرف حضرت نوح علیہ السلام کی تقریروں میں ہم مذکورہ بالا باتوں کو پاتے ہیں تو دوسری طرف حضرت ہود پیغمبر علیہ السلام کو دیکھتے ہیں کہ اپنی قوم عاد کو مخاطب بنا کر فرما رہے ہیں کہ

وَاتَّقُوا الَّذِیْ اَمَدَّکُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ○ اَمَدَّکُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ. (سورۂ شعراء: ۱۳۴-۱۳۲)

''ڈرو اس خدا سے جس نے تمہاری امداد ان چیزوں سے کی جنھیں تم خود جانتے ہو۔ اس نے تمہاری مدد مویشیوں سے کی اور نرینہ اولاد سے کی، باغوں سے کی اور چشموں سے کی۔''

جس سے معلوم ہوا کہ ''انعام'' یعنی جان رکھنے والے مویشیوں (بھیڑ، بکری، گائے، بیل، بھینس، اونٹ وغیرہ) کی خدمات سے استفادے کو حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم کے لوگوں کا پیدائشی حق اور خداداد امداد و اعانت قرار دیتے تھے۔

اور یہی کیا! آپ قرآن کو کھولیے اور ان خطبات و مواعظ کا جو اس کتاب میں گذشتہ پیغمبروں کی طرف منسوب کیے گئے ہیں ان کا مطالعہ کیجیے۔

جو کچھ میں نے عرض کیا اس کی تائیدی شہادتیں آپ کو ملتی چلی جائیں گی اور گو خاص تاریخی اسباب و وجوہ کے زیر اثر قرآن کے سوا ان کتابوں کی صحت کی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی جو دنیا کے مختلف مذہبی پیشواؤں اور دینی منادیوں کی طرف اس زمانے میں منسوب ہیں، لیکن بہ ایں ہمہ جس شکل میں بھی ہو نسل انسانی کے پہلے جوڑے (آدم و حوا علیہما السلام) کا ذکر کرتے ہوئے تورات کی کتاب پیدائش میں اس بیان کے سلسلے میں یعنی:

''خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔ نر و ناری (مرد و عورت) ان کو پیدا کیا اور خدا نے ان کو برکت دی اور کہا کہ پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور و محکوم کرو۔''

اس بیان کے اخیر میں بھی ان الفاظ کو پاتے ہیں۔ انسان سے کہا گیا:

''سمندر کی مچھلیوں اور ہوا کے پرندوں اور کل جانوروں پر جو زمین پر چلتے ہیں، اختیار رکھو۔''

اور پہلے بھی تقریباً ان ہی الفاظ سے قصہ شروع ہوا ہے۔ لکھا ہے کہ خدا نے کہا:

''اور وہ (انسان) سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپاؤں اور تمام زمین اور سب جانداروں پر جو زمین پر رینگتے ہیں، اختیار رکھیں۔

(پیدائش: باب۱)

اگر واقعی یہ خدائی الفاظ ہیں تو کائنات سے استفادے کا شاید اسے ہم پہلا خدائی منشور (چارٹر) قرار دے سکتے ہیں جو آدم کی اولاد کو خالق کائنات کی طرف سے عطا کیا گیا۔ سچ پوچھیے تو تورات کے مذکورہ بالا الفاظ قرآنی آیت:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً. (سورۂ بقرہ: ☆)

''میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

کے جامع مانع اجمالی الفاظ ہی کی گونہ یہ تفسیر ہے، جس پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ اور ایک قرآن ہی کیا! دنیا کے عام مذاہب و ادیان کی بنیادی کتابوں میں اگر ڈھونڈھا جائے تو کسی نہ کسی شکل میں اسی سب سے پہلے آسمانی منشور، اور خدائی چارٹر کو ڈھونڈھنے والے پا سکتے ہیں۔ چاہیے تو یہی کہ کائنات سے استفادے کا مسئلہ بنی آدم کے لیے اس کے بعد ہر قسم کے شکوک و شبہات، ہچکچاہٹ اور جھجک سے پاک ہو کر سامنے آ جاتا۔ اف! ہزارہا سال تک ذہنی کش مکش کی تلخیوں میں اپنے خود آفریدہ غلط نقاط نظر کی بہ دولت آدمی کی اولاد جو تڑپتی اور پھڑکتی رہی اس ''لاہوتی منشور'' اور ''آسمانی چارٹر'' کا تقاضا تو یہی تھا کہ آدمی کو ان ذہنی بے چینیوں کی ہوا بھی نہ چھوتی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دنیا بے زار رجحانات کی حوصلہ افزائیاں روحانیت (اسپریچولزم) کے رعب انگیز نام سے دنیا کی قوموں میں ہوتی رہیں۔ بجائے بھوگنے کے سمجھانے والے یہی سمجھاتے رہے کہ آدمی کے سامنے یہ دنیا بھاگنے، صرف بھاگنے ہی کے لیے

پھیلائی گئی ہے۔ اسی بنیاد پر کائنات سے استفادہ نہیں بلکہ استعاذہ اسی آدمی کا سب سے بڑا مذہبی وظیفہ اور دینی فریضہ قرار دے دیا گیا۔

آدمی، غریب آدمی جس کا بال بال، رواں رواں کائناتی حقایق سے بندھا ہوا ہے، اپنی ایک ایک سانس میں دنیاوی امداد کا جو محتاج بنا کر پیدا کیا گیا ہے، اسی بے کس پر یہ کتنا بڑا ظلم تھا، جب کہا جاتا تھا کہ اسی دنیا سے بے تعلق ہو کر جینے کی مشق کو بہم پہنچائے۔ اتنا غوغا، اتنا شور اور ہنگامہ برپا کیا گیا کہ دنیا سے بے تعلق ہو جانے کا غیر فطری نصب العین تو کیا پورا ہوتا لیکن بین الاقوامی طور پر شاید یہ تسلیم کر لیا گیا کہ انسانیت کا بلند ترین نصب العین اگر کچھ ہوسکتا ہے تو وہ روحانیت ہی ہے۔ باور کر لیا گیا کہ آدمی کی صحیح معیاری زندگی وہی ہوسکتی ہے جو دنیا سے بے زاری کے زیر اثر گزری ہو۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں اس ذہنی کوفت اور دماغی لکد کوب کی تلخیوں کا جن سے اس راہ میں آدم کی اولاد کو گزرنا پڑا دنیا اور دنیا کی جن پیداواروں کے محتاج بنا کر جو پیدا کیے گئے تھے عملاً وہ ان چیزوں سے نہ الگ ہوئے نہ الگ ہو سکتے تھے، لیکن جیتے جی یہی سوچتے رہے کہ کاش دنیا سے ان کا یہ اختتامی رشتہ ٹوٹ جاتا۔ وہ خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتوں کو کھاتے تھے، لیکن اسی کے ساتھ مسلسل یہ سوچتے بھی جاتے تھے کہ کاش ہم ان کو نہ چکھتے۔ کہتے ہیں کھانے میں ریت ملا کر اور ٹھنڈے پانی کو گرم کرنے کا مشغلہ روحانی مشغلہ قرار دیا گیا تھا۔ ذہنی احساسات کی متضاد...... قطعاً متضاد و متصادم اس قسم کی عملی زندگی آدمی کو جن فکری ہیجانوں میں مبتلا کر سکتی تھی ان ہی کے شکار لوگ ہوتے رہے، جس کے بچے کھچے آثار اگر دیکھا جائے تو کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی باقی ہیں۔

اسی طرح مادّیت کا وہ قدیم اوہامی چولا جس کا نام ''مخلوق پرستی'' ہے یعنی نفع اور ضرر کے تعلق سے خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوقوں کی پوجا کا رواج جن قوموں اور نسلوں میں ہوا یا اس وقت تک مادّیت کی اس پرانی فرسودہ شکل پر ایک طبقہ اس لیے اصرار ہی کیے چلا جا رہا ہے کہ اس کے باپ دادوں کا طریقہ یعنی قومی کلچر ہے۔ یورپ کی جدید ذہنیت کا یہ نیا تحفہ ہے کہ ''کلچر'' کے لفافے میں جس رواج اور جس طریقے کو بھی چاہا جائے ختم

ٹھونک کر باقی رکھنے پر اصرار آدمی کا منطقی اصرار ہے۔ بہرحال بے چارے مخلوق پرست ایک طرف تو ان چیزوں کو اپنا مخدوم و معبود بنا کر پوجتے بھی رہے اور دوسری طرف اپنے انہی معبودوں اور مخدوموں کے خدمات سے استفادہ بھی کرتے رہے۔ وہ ان جانوروں کے آگے ماتھے بھی ٹیکتے رہے جن میں نفع رسانی کا کوئی پہلو پایا جاتا تھا اور انہی کے کندھوں پر ہل رکھ رکھ کر اپنے کھیتوں کو جوتتے بھی رہے، گاڑیوں میں باندھ کر ان کو ہنکاتے بھی رہے، کوڑوں سے ان کو پیٹتے بھی رہے، لوہے کی کیلوں سے ان کے جسم میں چھید بھی کرتے رہے، الغرض ایک ہی چیز کو مخدوم کے ساتھ خادم یا معبود کے ساتھ اپنا عابد بنالینا یہ حرکت ہی ایسی ہے کہ کرنے کی حد تک لوگ اسے لاکھ کرتے رہے، لیکن باہر کا یہ عجیب و غریب متناقض طرز عمل ناممکن ہے کہ آدمی کے اندر ردعمل کی تلخیوں کو نہ پیدا کرے۔ لوگ عرب کے اس جاہل بت پرست کے قصے کو تعجب سے سنتے ہیں۔ کھجوروں سے بنائے ہوئے بت کو پوجا کرتا تھا مگر قحط کی مصیبت میں جب مبتلا ہوا تو اپنے اسی معبود کو شدت گرسنگی میں دینی بدّو بے چارہ چٹ بھی کر گیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ قصہ اسی جاہل بت پرست بدّو کی حد تک کیا محدود ہے؟

آخر زندگی کی ضروریات میں ہر ہر قدم پر جن چیزوں کی خدمات سے مستفید ہونے پر آپ مجبور ہیں یا جن چیزوں کے نقصان رساں پہلوؤں سے آپ بچنا چاہتے ہیں ان ہی کو معبود بنا بنا کر آپ پوجنے بھی لگیں گے تو قدرتاً ان ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہو جانا آپ کے اس متضاد طرز عمل کا منطقی نتیجہ ہے۔ جوتیاں جنھیں ہم پہنتے ہیں ان ہی کی پوجا کرکے بھی ہم اگر پابند کر دیے جائیں تو ظاہر ہے کہ ان ہی جوتیوں کے آگے ہمیں سر بھی جھکانا پڑے گا اور پھر ان ہی کو پہن کر پاک و ناپاک چیزوں پر ہم چلیں گے بھی۔ الغرض ان ہی کو سر پر بھی رکھیں اور ان ہی کو پاؤں سے بھی روندیں۔ ایسی صورت میں آپ ہی بتایے ہم اور کیا کریں گے یا کیا کر سکتے ہیں؟ آپ اپنے ایندھن کے لیے درختوں کی لکڑیوں کے بھی محتاج ہیں، پھر ان ہی درختوں کو آپ پوجنے بھی لگیں تو یقیناً آپ کو یہی کرنا پڑے گا کہ اپنے ہاتھوں اپنے معبودوں کے تنوں پر

کلہاڑے بھی چلایے، ٹکڑے ٹکڑے کر کے چولہوں میں بھی ان کو پوجھیے، کسی گڑھے یا نالے میں جمع ہونے والے پانی کی پرستش کرنے والوں کو آئے دن دیکھا جاتا ہے کہ اسی پانی سے برکت بھی حاصل کرتے ہیں، پاپ کے ناش کرنے کی خاصیت بھی ان میں مانتے ہیں، اس کی حمد کا بھجن بھی گاتے ہیں۔ گاتے ہیں تھر کتے ہیں، ناچتے ہیں اور پھر پانی کے اسی گڑھے یا نالی کے کنارے بیٹھ کر ضرورت ہوتی ہے تو قضائے حاجت سے بھی فارغ ہوتے ہیں۔ اس کی پروا کیے بغیر فارغ ہوتے ہیں کہ اسی پَوِتّر اور مقدس پانی میں آخر کن غلاظتوں اور نجاستوں کو اپنے ہاتھوں وہ خود شریک کر رہے ہیں، اسی میں سڑی گلی مردہ لاشوں کو بھی بہاتے ہیں۔ آبادیوں کی گندی نالیوں کا رخ اسی پاک پانی کی طرف پھیر دینے کا عام رواج ہے۔ الغرض ایک ہی چیز کو مسلسل مخدوم و خادم، معبود و عابد، کا چکر ایک ایسا بھونچالی چکر ہے جس کے پیکڑے میں پھنس جانے والوں کے دل پر، دماغ پر دن کے چوبیس گھنٹوں میں تضاد و تناقض کی نہ ختم ہونی والی چوٹیں پڑتی رہتی ہیں، ان چوٹوں کے برداشت کرنے پر وہ مجبور ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ بجائے خود قدرتی حالات ہی ایسے تھے کہ دنیا کی چیزوں سے مستفید ہونا چاہیے تھا کہ یوں ہی اس کو آدمی اپنا قدرتی حق سمجھتا۔ آخر پیاسے کے سامنے ٹھنڈا پانی اور بھوکے کے آگے روٹیاں لا کر رکھ دی گئی ہوں، طبعاً ایسی حالت میں چاہیے تو یہی کہ پیاسا پانی کو اور بھوکا روٹی کو استعمال کرنے لگے۔ سو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اپنی حاجتوں اور ضرورتوں میں استعمال کرنے کا لائسنس یا اجازت نامہ حال آں کہ ان چیزوں کے خالق کی طرف سے ہر زمانے میں تقسیم بھی ہوتا رہا لیکن کسی خاص زمانے میں نہیں بلکہ تاریخ کے دور میں دنیا کی اکثر قوموں میں بلاوجہ یہ دونوں ذہنی وبائیں پھوٹتی رہی ہیں۔ یعنی خواص تو روحانیت (اسپریچولزم) کے نام سے خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے متعلق اپنے اندر نفرت اور چڑ کے جذبے کی پرورش پر اپنا زور صرف کرتے رہے اور مخلوق پرستانہ اوہام کی تاریکیوں نے اسی قوم کے عوام میں ایک ایسی ذہنیت پیدا کی جس کے زیر اثر ہر ایسی مخلوق پجنے لگی جس

میں نفع یا ضرر کا پہلو نمایاں تھا یا نت نئے کرشمے منسوب کرنے والوں نے ان کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اسی کے آگے پیشانیاں جھکا دی گئیں، ہاتھ جوڑ کر آدمی اس کے آگے کھڑا ہو گیا، گویا روحانیت والوں نے ٹھوکروں کا مستحق خدا کی جن پیدا کی ہوئی چیزوں کو ٹھہرالیا تھا ان ہی کی ٹھوکروں میں مخلوق پرستی کی ذہنیت نے آدم کو ڈال دیا۔ ایک طرف خواص میں کائناتی حقایق کی جانب سے دلوں میں نفرت وحقارت کی آگ بھڑکائی جاتی تھی، دنیا جس کی نظروں میں جتنا زیادہ ذلیل ہو، سمجھا جاتا تھا کہ روحانیت میں اسی قدر اس کا مقام بلند ہے اور دوسری طرف عوام میں ان ہی مخلوقات کی دل چسپیاں ترقی کر کے اس نقطے تک پہنچ گئیں کہ ان کی عظمت وعزت، محبت والفت نے عبادت اور پوجا پاٹ کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس میں شک نہیں کہ مادّیت کی جدید مغربی ذہنیت کے زیر اثر جو تمدن پیدا ہوا ہے اس میں بھی دنیا اور دنیا کی بعض چیزوں سے گرویدگیاں حد سے زیادہ متجاوز ہو گئی ہیں۔ دور کیوں جایے کتوں کے ساتھ یورپ اور امریکہ کے باشندوں نے اپنے تعلقات کو جہاں تک پہنچا دیا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہیں، لیکن کتے پوجے گئے ہوں، شاید خالص مادّیت کے جدید مغربی دور میں اب تک یہ صورت پیش نہیں آئی ہے۔ حال آں کہ یہ مادیت جب مخلوق پرستی کے رنگ میں رایج تھی تو کہا جاتا ہے کہ کتے بھی پوجے گئے تھے [1]۔

---

[1] جلد اور نمبر تو یاد نہیں ہے مگر ''برہان'' ہی میں خاک سار کا ایک مضمون قدیم مصری تمدن کے متعلق شایع ہوا تھا۔ زمین سے برآمد ہونے والے آثار کی روشنی میں دوسری باتوں کے ساتھ اس کا بھی تذکرہ کیا گیا تھا کہ مصر کے باشندوں کی مختلف ٹولیوں میں مختلف مخلوقات کی عبادت کا رواج تھا، جن میں بعض کتوں کو پوجتے تھے اور بعض بلیوں کے پرستار تھے۔ گبریلے کیڑے کے پجاریوں کی بھی کافی تعداد اس ملک میں پائی جاتی تھی۔ یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ اتفاقاً ان ٹولیوں میں لڑائی چھڑ جاتی تو بلیوں کے پوجنے والے تلاش کر کر کے کتوں کو اس لیے مارتے تھے کہ وہ ان کے دشمنوں کا معبود ''اشٹ دیو'' ہے۔ اسی طرح بلیوں کو وہ قتل کرتے تھے جو کتوں کے پجاری تھے۔

یادداشت: اس حاشیے میں مولاناؒ نے جس مضمون کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ مضمون برہان کی جولائی اور اگست ۱۹۴۹ء کی دو قسطوں میں ''ہزار سال کے قدیم ترین تاریخی وثایق...... قرآن کی روشنی میں'' کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ (ا۔س۔ش)

بہر حال یہ عجیب بات ہے کہ خدائی مخلوقات سے نفرت وحقارت پر روحانیت کے سارے کاروبار کا دار و مدار ہے اور ان ہی مادی حقایق کی قدر و قیمت، عظمت ومحبت جو مخلوق پرستی کے عہد میں ان کو معبودیت اور الوہیت کی شان رفیع تک چڑھا کر پہنچا دیتی تھی بہ ذات خود ان دونوں نقاط نظر میں آسمان وزمین ہی کی نسبت کیوں نہ ہو، لیکن خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے زندگی کی ضرورتوں میں استفادے کا جو قدرتی حق آدمی کو حاصل تھا آدمی کا یہ جایز قدرتی حق ان دونوں خود تراشیدہ نظریوں کے دباؤ سے متاثر اور بری طرح متاثر ہوتا رہا اور یوں یہ عجیب بات ہے کہ نتیجہ دونوں کا ایک ہی تھا۔ ویسے تو مخلوقات سے نفع گیری اور فواید اندوزی پر روحانیت والے بھی مجبور تھے۔ اور مخلوق پرست بھی کہ بغیر اس کے خدا کی اس دنیا میں ایک قدم کیا! عرض ہی کر چکا ہوں کہ ایک سانس بھی کوئی لینا چاہے تو عام حالات میں نہیں لے سکتا، لیکن کامل انشراح قلب، کھلے دماغ کے ساتھ، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ظاہر ہے کہ دنیا کی چیزوں سے استفادے کا ارادہ نہ وہی کر سکتے تھے جو ان ہی چیزوں کی نفرت کا اپنے آپ کو عادی بنا کر ان سے بھاگنے اور دور رہنے ہی کو اپنی زندگی کا آخری نصب العین بنائے ہوئے تھے۔

اس طرح نت نئے تجربات کی مشق گاہ بنانے کی جرأت بھلا مخلوق پرستوں میں ان ہی چیزوں کے متعلق کیسے پیدا ہو سکتی تھی جو معبود بنا کر ان ہی کے آگے کھڑے ہو ہو کر کانپ رہے تھے، تھرا رہے تھے۔

میں نے جو یہ عرض کیا کہ ان دونوں متخالف ومتضاد نظریات ایک ہی نتیجے کو ہر زمانے میں پید کرتے رہے، اس سے میری غرض یہی ہے۔ یہی کہنا چاہتا ہوں کہ دونوں دایروں میں کاینات سے استفادے کا مسئلہ دیدہا، شک، تذبذب، تردد کی ذہنی اور فکری کش مکشوں کا ہر زمانے میں شکار رہا۔

اپنا ذاتی خیال تو یہی ہے کہ دوسرے تباہ کن مہیب نتایج کے سوا اس کو بھی ایک قسم کی سزا ہی سمجھنا چاہیے کہ جس حد تک دنیا کی چیزوں سے آدم کی اولاد فایدہ اٹھا سکتی

تھی اس سے محروم رکھی گئی اور یہ جو دیکھا جاتا ہے کہ مسئلۂ توحید اور چند خاص محوری مہمات جن پر قرآنی تعلیم گردش کرتی ہے، ان کے بعد آخری دفعہ جو کتاب خدا کی طرف سے بندوں کو اس ذمہ داری کے ساتھ سپرد کی گئی ہے کہ قیام قیامت تک کمی بیشی، ترمیم و اضافہ کی راہوں کو قدرت کا مضبوط ہاتھ بند رکھے گا۔ اسی کتاب میں انتہائی اختصار پسندی کے باوجود کائنات سے استفادے کے مسئلے کو اجمالی و تفصیلی دونوں رنگوں میں پوری طاقت کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ کہہ چکا ہوں کہ اس سلسلے کی آیتوں کو ایک ہی جگہ جمع کرنے کا ارادہ اگر کیا جائے تو قرآن کا معقول معتد بہ حصہ ہی نقل کرنا پڑے گا۔ بہر حال یہ ایک واقعہ ہے، قرآن کا ہر پڑھنے والا جس سے واقف ہے۔

مگر یہ بات کہ ایسا مسئلہ جو چنداں نظری بھی نہ تھا، اتنا غیر معمولی زور اس پر کیوں دیا گیا ہے؟ من جملہ دوسرے اسباب و وجوہ کے بالکل ممکن ہے۔ ایک وجہ اس کی یہ بھی ہو کہ آیندہ کائنات سے استفادے کی راہوں میں روڑوں کے اٹکانے اور اٹکنے کی کوئی گنجایش کسی لحاظ سے باقی نہ چھوڑی جائے۔ ہوسکتا ہے ایک مقصد اس طریقۂ بیان کا یہ بھی ہو۔ آپ قرآن اٹھا لیجیے، پڑھتے چلے جایے، ورق ورق، صفحہ صفحہ میں اسی مسئلے کی متعلقہ آیتوں کا ذخیرہ آپ کے سامنے آتا چلا جائے گا۔ اجمالی رنگ میں جہاں ایسی آیتیں آئیں گی مثلاً:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا. (سورۂ بقرہ:۲۹)

''وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے۔''

جس میں زمین اور زمین کی پیداواروں ہی سے استفادے کا اجازت نامہ عطا کیا گیا ہے تو دوسری جگہ:

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ.

(سورۂ جاثیہ:۱۳)

''اور تمہارے کام میں لگایا (خدا نے) ان چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور

جو کچھ زمین میں ہے۔ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔"

کا "لاہوتی پروانہ" بھی آپ کو اسی کتاب میں مل جائے گا۔ جس میں آپ دیکھ ہی رہے ہیں زمین کے ساتھ ساتھ ساری چیزوں کو بھی جو آسمانوں میں ہیں، بنی آدم کے تسخیری حدود میں قرآن نے داخل کر دیا ہے۔

جَمِیۡعًا مِّنۡهُ.

"سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔"

یعنی خالق کائنات ہی کی طرف سے یہ حق آدم کے بچوں کو عطا ہوا ہے، اسی کی توثیق ان الفاظ سے کی گئی ہے۔

اسی طرح بجائے اجمال کے اگر تفصیل مطلوب ہو تو کچھ نہیں، قرآن کی ایک ہی سورۃ النحل کے آغاز کی ان آیتوں ہی کو پڑھ لیجیے، جس میں حیوانی زندگی کے مظاہر (الانعام) یعنی مویشیوں سے بات بہ ایں الفاظ شروع ہوتی ہے:

وَالۡاَنۡعَامَ خَلَقَهَا لَـكُمۡ فِيۡهَا دِفۡءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ ○ وَلَـكُمۡ فِيۡهَا جَمَالٌ حِيۡنَ تُرِيۡحُوۡنَ وَحِيۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ ○ وَتَحۡمِلُ اَثۡقَالَـكُمۡ اِلٰى بَلَدٍ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا بٰلِغِيۡهِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ‌ اِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ○ وَّالۡخَـيۡلَ وَالۡبِغَالَ وَالۡحَمِيۡرَ لِتَرۡكَبُوۡهَا وَزِيۡنَةً‌ وَيَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ○ (سورۂ نحل: ۵-۸)

"اور مویشیاں تمہارے لیے خدا نے پیدا کیں۔ تمہارے لیے اس میں گرمی حاصل کرنے کا سامان ہے (یعنی اون گوشت) اور دوسرے منافع ہیں۔ ان ہی مویشیوں سے خوراک بھی حاصل کرتے ہو۔ تمہارے لیے دیدہ زیب ہے (مویشیوں کا نظارہ) جب پھرواتے ہو ان کو اور انھیں چراتے ہو اور وہی (مویشیاں) تمہارے بار اٹھا کر ان آبادیوں تک پہنچاتی ہیں جہاں جان توڑ محنت کے بغیر تم نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بے شک تمہارا رب بڑا مہربان اور رحم

والا ہے اور (خدا نے) پیدا کیے گھوڑے، خچر، گدھے تا کہ ان پر چڑھو اور ان سے رونق بھی ہے۔''

حیوانی زندگی کے چند خصوصی مظاہر اور ان کے استعمال کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے آگے پانی اور پانی سے اگنے والی روئید گیوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

هُوَالَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً لَّكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ O يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَ عْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ O (سورۂ نحل:۱۰۔۱۱)

''وہی خدا ہے جس نے اتارا آسمان سے تمہارے لیے پانی، جسے تم پیتے ہو اور اسی پانی سے درخت بھی اگتے ہیں جن میں چراتے ہو۔ اگاتا ہے تمہارے لیے اسی پانی سے کھیت اور زیتون (تیلھن) اور کھجوریں اور انگور اور ہر قسم کے میوے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں۔''

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مَسَخَّرَاتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَO

(سورۂ نحل:۱۲)

''اور کام میں تمہارے لگایا (اسی نے) رات اور دن کو اور آفتاب و ماہ تاب اور تارے کام میں لگائے ہوئے ہیں اسی کے حکم سے۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

پھر زمین پر رنگ رنگ کے جمادات، نباتات، حیوانات، پتنگے، تتلیاں اور ان کے سوا بھی جو کچھ ہمارے سامنے ہے سب ہی کی طرف اور ان کی بوقلمونیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَمَا ذَرَءَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَالِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ (سورۂ نحل: ۱۳)

''اور زمین ہی سے اس نے پھیلا دیا ایسی چیزوں کو جن میں طرح طرح کے رنگ ہیں اس میں نشانی ہے ان لوگوں کو جو چونکتے ہیں۔''

''خشکی'' یا البر سے گزر کر اس کے بعد البحر کی طرف قرآن متوجہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا:

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (سورۂ نحل: ۱۴)

''وہی (خدا ہے جس نے بحر (سمندر) کو تمہارے قابو میں کر دیا ہے، تاکہ اس سے تر و تازہ گوشت کو کھاؤ اور گہنا جسے تم پہنتے ہو اسی سمندر سے نکالو اور تو دیکھتا ہے جہازوں کو جو سمندر میں چیرتے ہوئے اس لیے چلتے ہیں تاکہ تم اللہ کے فضل کو حاصل کرو اور اسی کا گن گاؤ۔''

پھر کوہستانی سلسلوں اور پہاڑی زنجیروں کا تذکرہ چھیڑتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ وَعَلَامَاتٍ وَّبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝

(سورۂ نحل: ۱۵، ۱۶)

''اور زمین پر (خدا نے) ڈال دیا بوجھ تاکہ نہ ڈگمگائے۔ وہی زمین غبار سے ساتھ اور نہری راستے تاکہ تم راہ پاؤ اور بنائیں خدا نے نشانیاں اور تاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں۔''

یہ ایک سورت کے پہلے رکوع کے چند فقرے ہیں۔ حیوانات، نباتات، سفلیات و علویات، ارضیات، سماویات، بر و بحر، سہل و جبل کے سلسلے کون سی قابل ذکر چیز رہ گئی ہے جن کی طرف اشارہ کر کے قرآن ہر ایک کو بنی آدم کے اس ''پیدائشی حق'' کے احاطے میں داخل کرتا چلا نہیں گیا ہے، جو کائناتی حقائق سے استفادے کی راہوں

میں ان کو قدرتاً حاصل ہیں۔ حیوانات بھی تیرے لیے ہیں اور نباتات بھی، آفتاب بھی تیری خدمت انجام دے رہا ہے اور ماہ تاب بھی، سیاروں سے بھی خدمت تم لے سکتے ہو بلکہ لے رہے ہو اور ثوابت سے بھی، دن اپنے سارے منافع کے ساتھ اور رات اپنی ساری سکون بخش راحت رسانیوں کے ساتھ چوبیں گھنٹوں میں ہمارے گھروں میں جو پہنچتی ہے، ان کی گردش کا سلسلہ جو جاری ہے تو یہ سارے کرشمے آسمان کے ان ہی روشن اجرام کے تو ہیں۔ بر کے ساتھ بحر کی پیداواروں سے جو ہم مستفید ہو رہے ہیں ان ہی کی وجہ سے آبی راہوں کا جال بھی بسیط ارض پر بچھا ہوا ہے، جن سے آبادیوں کے کاروباری رشتے قایم ہیں۔ اور وزنی چٹانوں کے یہ تودے، جو ہزار ہا ہزار فٹ کی بلندیوں کے ساتھ زمین کے کناروں پر پہاڑوں کی شکل میں کھڑے نظر آرہے ہیں ان میں لوہے، سونے، چاندی اور اسی قسم کی ٹھوس، بوجھل چیزیں جو پیدا ہوتی رہتی ہیں مجموعی طور پر ان سب سے توازن کی جو کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور پھر ان ہی پہاڑوں سے ٹکراٹکرا کر بادل جو برستے ہیں، دریا، ندیاں، نالے، نہریں، جھرنے جو ان ہی پہاڑوں سے جاری ہیں اور اس کے سوا خدا کی پیدا کی ہوئی اس دنیا سے جو فایدے ہمیں پہنچ رہے ہیں اور آیندہ پہنچتے رہیں گے، آپ اگر غور کریں گے تو ایک سورت کی ان ابتدائی آیتوں ہی میں ساری چیزیں مل جائیں گی۔ بلکہ ذرا سنبھل کر سوچیے! ان ہی آیتوں سے کم از کم ان نتائج تک یہی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے نفوس بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی

① کائناتی حقایق سے استفادے کو قرآن نے ناگزیر ضرورتوں ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ انسانی فطرت میں حسن پسندی، جمال جوئی کے جبلی جذبات جو پائے جاتے ہیں، زیب و زینت، آرایش و آسایش کے سامانوں کی گوارائی تخم اس کی سرشت میں جو بو دیا گیا ہے فطرت کے ان میلانات و رجحانات کو مردہ یا پژمردہ بنانے کی کوشش تو قرآن کیا کرتا بالکل اس کے برعکس مویشیوں اور ان کے ستھیروں کے وہ دل نواز نظارے جب باہم ملی جلی ہوئی چراگاہوں کے طرف صبح سویرے آبادیوں

سے نکل نکل کر یہی مویشیاں روانہ ہوتی ہیں اور سرِ شام ان ہی آبادیوں کی طرف ان کی واپسی ہوتی ہے:

لَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ.

(سورۂ نحل:۶)

''تمہارے لیے دیدہ زیب (نظارہ) ہے جب پھیر لاتے ہو ان کو اور جب چراتے ہو۔''

کے بلیغ الفاظ میں اس نظارے سے لذت گیری کے جذبے کو آپ دیکھ رہے ہیں، قرآن جگا رہا ہے۔ وہ سواری کے جانوروں، گھوڑوں، خچروں، گدھوں کا ذکر کرتے ہوئے صرف یہی خبر نہیں دیتا کہ تم ان پر سوار ہوتے بلکہ

لِتَرْكَبُوهَا.

''تاکہ تم ان پر چڑھو۔''

کے بعد ''زینت'' کے لفظ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ پھولوں، پھلوں اور طرح طرح کی نباتی روئیدگیوں کے ساتھ رنگ رنگ کے حیوانی مظاہر جو زمین پر پھیلے ہوئے ہیں ان میں حسین پرندوں، چرندوں، درندوں کے ساتھ صرف حشرات الارض ہی کی گونا گوں، قسموں اور بوقلموں صنفوں پر غور کیجیے اور ان ہی پر قرآنی الفاظ:

مَا ذَرَءَ لَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ. (سورۂ نحل:۱۳)

''اور بکھیر دیا تمہارے لیے زمین پر ان چیزوں کو جن کے رنگ مختلف ہیں۔''

کو منطبق کر کے دیکھیے! کیا ایک لمحہ اس کتاب کے پڑھنے والوں اور اس پر ایمان لانے والوں کے دلوں میں اسپریچولزم کی غیر فطری افسردگیوں اور زبردستی پیدا کی ہوئی جبری آزردہ خاطریوں کو راہ مل سکتی ہے؟

۲ براہ راست کائنات کی جن چیزوں سے آدمی مستفید ہو رہا ہے ان ہی کا نہیں بلکہ بالواسطہ جن کے فوائد ہم تک پہنچتے ہیں، دیکھیے اسی فہرست میں ایسی چیزیں بھی آپ کو ملیں گی، ہریالیاں جنھیں ہماری مویشیاں اور ہمارے پالتوں جانور چرتے

چگتے، کھاتے پیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ براہ راست ہی نہیں بلکہ ان سے ہم بالواسطہ ہی مستفید ہو رہے ہیں۔

③ اس سلسلے میں جو سہولتیں اور جو آسانیاں آدمی کو میسر آ رہی ہیں مثلاً سواری کے جانوروں کی وجہ سے جو دشواریاں کم ہوئیں ان کو خالق کائنات کی صفت رافت ورحمت کا مظہر قرآن [قرار] دیتا ہے، سواریوں کے ذکر کے بعد آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (سورۂ حج:٦٥)

''بے شک اللہ آدمی کے ساتھ مہربان اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔''

آپ ہی بتایئے اس سے کیا سمجھ میں آتا ہے؟

④ بلکہ حیوانی سواریوں کے بعد:

وَيَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ. (سورۂ نحل:٨)

''اور پیدا کرتا ہے (خدا ایسی سواریوں کو) جنھیں تم نہیں جانتے۔''

کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں، کوئی چاہے تو ان سے اپنے ذہن کو سیر وسفر کے ان نت نئے ذرائع کی طرف بھی منتقل کر سکتا ہے، جنھیں سہولت پسندی کے طبعی رجحانات ہمارے سامنے لا چکے ہیں یا آیندہ لانے والے ہیں۔ اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ ایجادات و اختراعات جن سے زندگی کی دشواریوں میں آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں یہی نہیں کہ قرآن میں ان کی ہمت شکنی نہیں کی گئی ہے بلکہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ عموماً شاباشیوں اور حوصلہ افزائیوں ہی سے اس سلسلے میں کام لیا گیا ہے تو شاید یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں ہو سکتا۔

طرفہ تماشا ہے کہ استعمالی غلطیوں سے لوگ مفید سے مفید چیزوں کو ضرر رساں جب بنا لیتے ہیں تو جو نہیں سمجھتے وہ ان ہی چیزوں کے درپے ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ ضرورت ہوتی ہے کہ استعمال کے سلیقے کو درست کیا جائے۔

آپ بندوق کیوں چھینتے ہیں؟ ان ہاتھوں کو درست کیجیے جن میں پہنچ کر چوری

اور ایسے ہی کاموں میں مدافعت یا شکار کا یہ قیمتی اوزار استعمال ہونے لگا ہے ❶۔ انسانیت کی بیخ کے ایک ایک ذریعے کو آپ ختم کرتے چلے جا رہے ہیں اور اس کے بعد پوچھتے ہیں کہ انسانیت کے لیے آدمی ہی کے ایجاد کیے ہوئے اکتشافات واختراعات اس کے گلے کی پھانسیاں بنتی کیوں چلی جا رہی ہیں؟

یاد ہوگا ''حقوق وفرایض'' جن کو ہم انسانی زندگی کے اسلامی نظام میں پاتے ہیں ان میں سے پہلی بات یعنی خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے مستفید ہونے کا استحقاق، اس استحقاق کا اعتراف اور توثیق اس کو تو اسلام نے اپنے عملی نظام کا جز بنا دیا ہے، لیکن ان قدرتی پیداواروں میں سے ہر ایک کے استعمال کا طریقہ ان کے خصوصیات وصفات کی سراغ رسانی اور ان ہی معلومات کی روشنی میں نت نئی ضرورتوں میں ان کا برتنا ان ساری تفصیلات کو آدمی کے حواس وعقل اور جسمانی توانائیوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ پانی آدمی کے لیے ہے، لیکن اس پانی تک رسائی کے کن ذرائع کو لوگ اختیار کریں؟ دریا اور ندیوں کے کنارے جا کر آباد ہوں اور بھیڑ، بکری، گائے، بیل منہ ڈال کر دریا، ندی، تالاب سے پانی پیتے ہیں، اسی طرح آدمی بھی پانی استعمال کرے؟ یا کنویں کھودے چشموں کے پانی کو نالیوں کی راہ سے آبادیوں تک پہنچائے یا نلوں کا ذریعہ اختیار کر کے تین منزل چار منزل عمارتوں تک اسی پانی کو کھینچ کر لے آئے؟ ان دونوں باتوں میں سے آدمی کو اختیار دیا گیا ہے کہ جس راہ کو چاہے اختیار کرلے۔ ابتدا میں معلومات کی کمی، تجربات کی قلت، عقول کی خامیوں کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت تک لوگ عقل سے زیادہ جسمانی قوتوں سے زندگی کے ضروریات کو حل کرنے کے عادی تھے۔ تاریخ کی شہادت بھی یہی ہے اور قرآن سے بھی پتا چلتا ہے کہ درختوں کے پتوں سے ستر پوشی کا کام لیا جاتا تھا۔ آدمی یہ بھی نہیں

---

❶ سیدنا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست یہ روایت خاکسار نے سنی ہے کہ خواب میں دیکھنے والے کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت میسر آئی، دست مبارک میں بندوق تھی اور فرمایا جا رہا تھا کہ **نعم السلاح هذه** (کیا اچھا ہتھیار ہے یہ)۔

جانتا تھا کہ مری ہوئی لاشوں کے ساتھ وہ کیا سلوک کرے؟ کوے سے قبر کنی کا اشارہ اس کو ملا، لیکن بہ تدریج اس کی فطرت میں وہی صلاحیت جس کی طرف قرآن ہی میں:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ. (سورۂ علق: ۵)

''سکھائی آدمی کو وہ باتیں جنھیں وہ نہیں جانتا تھا۔''

سے اشارہ کیا ہے۔ یعنی انجانی باتوں کے جان لینے کا قدرتی سلیقہ جو اس میں پایا جاتا تھا وہی اجاگر ہوتا چلا گیا۔ معلومات کے نئے نئے ذخیرے اس کی عقل کے سامنے جمع ہونے لگے۔ ان معلومات پر عقل نے کام کیا، نئے امکانات اور ان سے پیدا ہونے والے نئے نتیجوں کی طرف آدمی کا ذہن منتقل ہوتے ہوئے اس دور تک پہنچ گیا جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ یقیناً یہ ایک بڑی عظیم امتیازی صلاحیت تھی جس کی نشوونما کے حیرت انگیز ثمرات ہمارے سامنے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ قدرت ہی کا ایک قانون یہ بھی تھا، یعنی آدمی اپنی جس قوت اور صلاحیت سے زیادہ کام لیتا ہے وہی زیادہ چمکتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح اپنی جن صلاحیتوں سے کام لینا لوگ چھوڑ دیتے ہیں تو دیکھا گیا ہے کہ بہ تدریج ضعف واضمحلال کا نشانہ وہی صلاحیتیں بنتی چلی جارہی ہیں۔

جب تک لوگ جسمانی قوتوں سے کام لینے کے عادی تھے اس وقت تک ہماری جسمانی توانائیاں برسر عروج رہیں، بلاشبہ عقلیت اور تعلمیت کے اس دور میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ آدمی کا انفرادی شخصی وجود سیکڑوں سال تک حوادث کا مقابلہ کرتے ہوئے زندہ اور باقی برقرار رہتا تھا۔

استواری واستحکام ہی میں آدمی کے جسدی نظام کی یہ کیفیت نہ تھی بلکہ کمیت (مقدار) میں بھی اسی کے قد وقامت کے متعلق ایسی خبریں دی گئی ہیں جن کا اس زمانے کا انسان شاید تصور بھی نہیں کرسکتا بلکہ ان کے مقابلے میں کہا جاسکتا ہے کہ بالشتی قد کے حدود تک گویا پہنچ چکے ہیں[1]۔

---

[1] الاستاذ الامام الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بخاری کی املائی شرح: جلد ۳، صفحہ نمبر ۷ میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انگریزوں کا عمل ودخل ہندوستان میں جب سے ہوا ہے باشندگان ہند روز بہ روز ➤

کچھ بھی ہو! اتنی بات بہر حال مسلم ہے کہ بجائے عقل وفراست کے جسمانی توانائیوں سے آدمی جس زمانے میں زیادہ کام لیتا تھا تو جن جسمانی مشقتوں کو وہ برداشت کر لیتا تھا موسم کی شدتوں کا مقابلہ کرتا تھا، اس زمانے کے پیدا ہونے والوں سے ہم ان باتوں کی توقع عام حالات میں نہیں کر سکتے اور تاریخ سے ہٹ کر مشاہدے سے بھی آپ اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ آج بھی جنگلوں اور غیر شہری آبادیوں میں رہنے والوں کا مقابلہ شہروں کے تعلیم یافتہ لوگوں سے کر کے دیکھ لیجیے۔ اول الذکر طبقہ عقل سے زیادہ اپنی جسمانی صلاحیتوں ہی پر بھروسا کرتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس میدان میں شہری آدمی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آج ہماری تعلیم گاہوں کا سب سے بڑا اہم مسئلہ یہی ہے کہ عقلی اور ذہنی تربیت پر زیادہ زور دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ جسمانی طور پر لوگ روز بہ روز پستی اور انحطاط کے گڑھوں میں تیزی کے ساتھ گرتے چلے جا رہے ہیں۔ کھیل کود کو تعلیم کا لازمی جز بنانے کا نظریہ اسی مشاہدے اور تجربے کا نتیجہ ہے، مگر پھر بھی دیکھا یہی جاتا ہے کہ طلبا میں جن پر علم ومطالعہ کا ذوق غالب ہے، عموماً کھیل کے میدانوں میں وہ پھسڈی ثابت ہوتے ہیں اور کھلنڈرے طلبا میں عام طور پر امتیاز و شہرت ان ہی کو حاصل ہوتی ہے جو کتاب اور درس کے اوقات کو بے کاری کے اوقات شمار کرتے ہیں۔

الغرض کائنات سے استفادے کے سلسلے میں عمومی طور پر چوں کہ عقلی اور تعلیمی

◄ پست قد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حالاں کہ ان ہی کے آباواجداد جو انگریزوں سے پہلے پیدا ہوئے تھے موجودہ نسلوں کے مقابلے میں کافی قد آور ہوا کرتے تھے۔ شاہ صاحبؒ اپنے مشاہدے کو شہادت میں پیش فرماتے تھے۔ دوسروں سے بھی اسی قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ حیوانوں کے متعلق تو روز بہ روز یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی چلی جاتی ہے کہ گرگٹ اور چھپکلی کی نسلیں اسی زمین کے کرے پر اسی فٹ کی پائی جاتی تھیں۔ پہاڑوں اور برفستانوں سے جانوروں کی ہڈیوں کے جوڑھانچے آئے دن نکلتے رہتے ہیں ان سے بھی اس نظریے کی تصدیق ہوتی ہے کہ نشوونما میں زمین کی حالت کسی زمانے میں آج کل کے دنوں سے بہت زیادہ بہتر تھی۔ ایسی صورت میں ابن خلدون وغیرہ کا یہ دعویٰ کہ قد وقامت میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا ہے، عجیب ہے؟ بخاری ہی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ ہاتھ کا تھا۔

رجحانات ہی غالب ہوتے چلے گئے اس لیے جسمانی طور پر ہم نے جو کچھ بھی کھویا ہو، لیکن عقلی طور پر ہم نے بہت کچھ پایا بھی ہے۔ اتنا کچھ اس راہ سے ہمیں مل چکا ہے اور آیندہ بھی ملتا رہے گا جس سے جسمانی مافات کی تلافی ہوتی رہے گی۔ سواریوں کے ذریعے سے سہولتیں، حمل ونقل، سفر و سیاحت، باربرداری میں جو میسر آئی ہیں ان کو خدا نے اپنے اسما رؤف رحیم کے مظاہر میں جو داخل فرمایا، میری سمجھ میں تو اس سے یہی آتا ہے کہ عقلیت کے غلبے کی وجہ سے آدم کی اولاد جن جسمانی سرمایوں سے محروم ہوتی چلی گئی تو خدا کی صفت رافت و رحمت نے آدمی کو ایسی تدبیریں سمجھائیں جن سے مسلسل مافات کی تلافی ہوتی چلی جارہی ہے۔ ایسی صورت میں ان نئے ایجادات، اختراعات جن سے مشکلات حیات پر آدمی قابو یافتہ ہوتا چلا جارہا ہے اگر ان کو خدا کی رحمت ورافت کے آثار وثمرات میں ہم شمار کریں تو قرآن میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے مشکل ہی سے اس احساس کو غلط ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

اب استعمالی غلطیوں سے بجائے رحمت ورافت کے یہی ایجادات واختراعات بنی آدم کے لیے اگر زحمت ومصیبت بن جائیں تو یہی کہا جائے گا کہ خدا نے آدم کے بچوں کو تو بہشت ہی دی تھی، لیکن آدم سے رشتہ توڑ کر شیطان سے اپنا رشتہ جن لوگوں نے قایم کرلیا، شیطان کی اسی ذریت ونسل نے اس بہشت کو اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے دوزخ بنالیا۔

ورنہ سچ تو یہ ہے کہ آدمیت اور آدمیت کی بقا وارتقا کے جو قدرتی ذرایع ہیں ان سے وابستہ رہتے ہوئے اس وقت بھی آدمی کا کچھ نہیں بگڑتا تھا، جب عقل سے زیادہ جسمانی قوتوں سے زندگی کی ضرورتوں کو حل کرتا تھا۔

آخر پانی پینے ہی والی مثال کو لیجیے، مان لیجیے کہ دریاؤں اور ندیوں میں منہ لٹکا کر پانی کسی زمانے میں آدمی اگر پیتا تھا تو یقیناً پیاس اس پانی سے بھی بجھ ہی جاتی تھی، کھانا ہضم ہی ہوجاتا تھا، غریزی حرارت سے تحلیل یافتہ اجزا کا بدل بھی مہیا ہی ہوتا رہتا تھا اور آج چوتھی منزل کے نل سے پانی لے کر شیشے کے گلاسوں، چاندی اور

سونے کے کٹوروں ہی میں پانی ہم کیوں نہ پیتے ہوں تو نتیجتاً اب بھی پانی کا وہی فایدہ لوگوں کو حاصل ہو رہا ہے جو ندی اور تالابوں کے کنارے منہ لٹکا لٹکا کر پینے والوں کو حاصل ہوا کرتا تھا۔

میں یہ مانتا ہوں کہ روز بہ روز جسمانی طور پر کم زور ہوتے چلے جانے والوں کے ساتھ ارحم الراحمین کا یہ بہت بڑا رؤفانہ ورحیمانہ سلوک ہوا کہ اس نے سریع السیر سواریوں کی ایجاد کی توفیق بندوں کو عطا فرمائی۔ جن سواریوں کو ہم نہیں جانتے تھے قدرت انہی کو ہمارے سامنے لاتی چلی جارہی ہے، لیکن ان عصری سواریوں سے ہماری جو نسلیں محروم تھیں ان پر برتری کا دعویٰ محض انہی سواریوں کی بنیاد پر ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ سوال وجواب کے ایک معمولی سلسلے کے بعد بات آپ پر بھی واضح ہو جائے گی۔ پوچھیے کہ بیل گاڑی کے مقابلے میں ریل کی سواری سے ہمیں کیا فایدہ پہنچا؟ یہی جواب ملے گا کہ کم وقت میں دور دراز فاصلے طے ہو جاتے ہیں۔ کم وقت میں دور دراز فاصلوں کے طے ہونے کا کیا فایدہ؟ اگر یہ سوال اٹھایا جائے تو جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مثلاً معاشی ذرایع کی فراہمی کا میدان وسیع ہو جاتا ہے، یعنی زیادہ رُپیہ کمانے کا موقع ملتا ہے۔ زیادہ رُپیہ کمانے کا کیا فایدہ؟ جواب دیا جائے گا کہ زندگی کی ضرورتوں کی فراہمی میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ اس آسانی کا کیا فایدہ؟ آدمی کو خوش وخرم تن درست رہنے کا زیادہ موقع میسر آ سکتا ہے۔ یہی آخری جواب ہے جس پر سوالوں کی تان ٹوٹتی ہے۔ اب آپ ہی انصاف سے فیصلہ کر لیجیے کہ ریل اور موٹر، طیاروں اور سیاروں کے عہد میں پیدا ہونے والے انسانوں کا یہ دعویٰ کیا بجا دعویٰ ہو سکتا ہے کہ بیل گاڑی اور اونٹ، گھوڑوں پر سفر کرنے والی نسلوں کے مقابلے میں خوشی وخرمی، تن درستی، صحت وعافیت سے ان کو زیادہ حصہ ملا ہے؟

❀ ❀ ❀

مطبوعات مکتبۂ اسعدیہ، کراچی

۲۰۱۰ء

① الدین القیم (مکمل):

مذہب اور اس کی ضرورت، وجود باری تعالیٰ اور صفات وشفاعت، حقیقت محمدیہ اور مسئلۂ تبلیغ ومواخذے پر جامع مضامین کا مجموعہ۔ پہلی مرتبہ مکمل اشاعت کے ساتھ۔

تصنیف: رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

تدوین وترتیب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

مجلد اعلیٰ

② ستر بڑے گناہ:

حضرت علامہ شمس الدین الذہبیؒ کی ''کتاب الکبائر'' کا اردو ترجمہ از حضرت مولانا ہارون الرشید ارشد مدظلہٗ

یہ کتاب ہر گھر کی ضرورت ہے۔

مجلد اعلیٰ

③ تحفۂ خواتین (جدید):

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواتین اسلام سے باتیں۔ ہر شعبے سے متعلق آپ کی احادیث مبارکہ کا ترجمہ آسان تشریح کے ساتھ۔

تالیف: حضرت مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی بلند شہریؒ

مجلد اعلیٰ

④ تحفۂ حج:

حج کا ایک علمی اور مطالعاتی سفر نامہ۔ مقامات مقدسہ کی رنگین اور سادہ تصویر کے ساتھ۔

تصنیف: ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

مجلد اعلیٰ

⑤ اشاعتِ اسلام

یعنی دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا؟

ایک ایسی کتاب جسے پڑھ کر ایمان مضبوط ہوتا ہے۔

تصنیف: فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ

تقاریظ: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مجلد اعلیٰ

⑥ تاریخ اسلام (مکمل):

سیرت البم۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ تاریخ اور سن وار۔ رنگین وسادہ تصاویر کے ساتھ

تالیف: حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ

جدید تہذیب: حافظ تنویر احمد شریفی

مجلد اعلیٰ

⑦ اشرف الجواب:

علما، طلبا اور عوام کے لیے مفید کتاب۔ الجھنوں کا علمی حل۔
افادات: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

مجلد اعلیٰ

⑧ اللہ سے شرم کیجیے:

حضور علیہ السلام کی حدیث شریف کا مفصل بیان۔ مع اضافات جدیدہ
تالیف: حضرت مولانا مفتی سید محمد سلمان منصور پوری مدظلہٗ
پسندیدہ: فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ

مجلد

⑨ اللہ والوں کی مقبولیت کا راز:

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی صفات عالیہ کی روشنی میں اپنے کردار کا جایزہ
تالیف: حضرت مولانا مفتی سید محمد سلمان منصور پوری مدظلہٗ

مجلد اعلیٰ

⑩ مقالات احسانی

سلوک و تصوف پر حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی جامع تحریر

مجلد اعلیٰ

⑪ اسلام میں فرقۂ واریت کی مذمت:

انسان کی چار حیثیتیں، قانونی مساوات، تنظیمی فرقۂ واریت، وطنی فرقۂ واریت، مالی فرقۂ واریت، سیاسی فرقۂ واریت، قربِ قیامت اور وحدت اسلام اور قانون فطرت سے امن اور رزق کا حل۔

مقالہ: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ

تالیف وتدوین: حافظ تنویر احمد شریفی

مجلد

⑫ فوائد الفواد کا علمی مقام (اضافہ شدہ):

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات قرآن وحدیث کی روشنی میں۔

کاوش: حضرت مولانا سید اخلاق حسین قاسمیؒ

مجلد اعلیٰ

⑬ دنیا میں اس طرح رہو...... جیسے تم مسافر ہو!:

حضور علیہ السلام کی احادیث مبارکہ کا انتخاب، تمام انسانوں کے لیے دستورِ حیات اور اصول زندگی۔

تالیف: مولانا عبدالوحید واحد فیاضی

مجلد

⑭ مستند اسلامی نام:

بچوں اور بچیوں کے اسلامی نام اور ان کے احکام پر مستند کتاب۔

تالیف: حضرت مولانا مفتی محمد اسرار مدظلہٗ